فسانۂ آزاد

رتن ناتھ سرشار

پہلی بات

بچو! کوئی سو برس پیشتر لکھنو سے ایک اخبار چھپتا تھا جس کا نام اردو اخبار تھا۔ اس میں پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لیے ایک کہانی قسط وار چھپنی شروع ہوئی جس کا نام تھا ''فسانہ آزاد'' یہ کہانی اس وقت کے اردو کے ایک بے مثال ادیب پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھا کرتے تھے۔ لگ بھگ ایک سال تک فسانہ آزاد کی قسطیں شائع ہوتی رہیں۔ پڑھنے والوں میں اس کی دھوم مچ گئی۔ لوگ بڑی بے چینی سے ہرنئے قسط کا انتظار کیا کرتے تھے اور پھر جونہی تازہ اخبار ان کے ہاتھوں میں آتا وہ شاید سب سے پہلے فسانہ آزاد کی قسط ہی پڑھا کرتے تھے ایک سال قسط وار چھپنے کے بعد لوگوں کے اصرار پر فسانہ آزاد کو کتابی شکل میں چھاپ دیا گیا۔

فسانہ آزاد کو لکھے گئے اب سو برس ہونے کو آئے ہیں۔ لیکن اس کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ پڑھے لکھے لوگ جنہیں قصے کہانی سے کوئی دلچسپی ہے فسانہ آزاد کو ضرور پڑھتے ہیں بلکہ بار بار پڑھتے ہیں ان سو برسوں میں فسانہ آزاد اردو کی چند بے مثال اور لازوال کتابوں میں شمار کی جانے لگی ہے۔ ایسی کتابوں میں جو کبھی نہیں مرتیں، ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔۔۔۔اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کو اردو کے چند عظیم لکھنے والوں کی صف میں جگہ ملی ہے۔

یہ تو تھا کتاب کا تعارف: اب سنیے اصل کہانی کے بارے میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب فسانہ آزاد، آزاد کی کہانی ہے،

آزاد اس کہانی کے ہیرو ہیں اور ہیرو ایسے کہ دنیا جہان کی خوبیاں ان میں

موجود ہیں بڑے پڑھے لکھے اور عالم فاضل ہیں۔ دنیا کے ہر موضوع ہر مضمون پر ان کی معلومات کا کچھ حساب نہیں ۔۔۔۔ بڑے بہادر، دلیر اور نڈر ہیں۔ کشتی میں ایسے ماہر کہ بڑے بڑے پتلون کترا کر گذر جائیں لڑاکے ایسے کہ لکھنو کے بانکوں کو ناکوں چنے چبوادیئے۔ طاقتور ایسے کہ ہاتھی کو پچھاڑ دیں۔ شاعر ایسے کہ بیٹھے بیٹھے غزلوں پر غزلیں کہتے چلے جائیں، تیراکی میں استاد شہسواری میں بے مثال، بہت بڑے لطیفے باز بات سے بات پیدا کرنا ان پر ختم غرض کون سی خوبی ہے، جو میاں آزاد میں موجود نہیں ۔۔۔۔ اور پھر آزاد ہیں بھی سچ مچ ہی آزاد گھر نہ بار، آ گا نہ پیچھا۔ جہاں جی چاہا چلے گئے۔ جہاں رات آئی سو رہے۔ نہ کوئی ڈر نہ خطرہ۔

فسانہ آزاد میں دوسرا بڑا کردار خوجی کا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہی کردار فسانہ آزاد کی جان ہے، خوجی بڑی ہی دلچسپ اور رنگا رنگ شخصیت ہے، اردو ادب میں بہت کم ایسے ایسے کردار ہوں گے جتنا کہ خوجی کا ہے۔

خوجی ایک دبلا پتلا، ننھا منا، ذرا سا آدمی ہے۔ مشکل میں مرغے کے برابر قد ذرا ذرا سے ہاتھ پاؤں سر گنجا، ڈھائی بال مونچھوں کے ڈھائی بال داڑھی کے افیم کے بڑے رسیا اتنے کہ اگر ایک وقت افیم نہ ملے تو ان کی جان نکل جائے۔ کمزور اتنے کہ پھونک مارو تو اڑ جائیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ حالت یہ کہ بات بات پر لڑنے مرنے کو تیار۔ اپنے سے دگنے چوگنے ہی سے نہیں دس گنا بڑے اور طاقتور سے بھی لڑ پڑیں گے۔ مار کھاتے جائیں گے لیکن چمٹے رہیں گے بات بات پر قرولی نکالنے کی دھمکی دیتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ قرولی کی شکل ان کے والد صاحب نے بھی دیکھی ہو گی ۔۔۔۔۔۔ خوجی ایک نواب صاحب کے

مصاحب تھے۔ میاں آزاد پھرتے پھراتے ان نواب صاحب کے ہاں پہنچے تو خوجی سے ملاقات ہوئی اور پھر دوستی ہو گئی۔

کسی شہر میں ایک بڑی حسین اور خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی حسن آرا سے آزاد کی ملاقات ہوتی ہے۔ آزاد شادی کا پیغام دیتا ہے لیکن حسن آرا شادی کے لیے ایک شرط پیش کرتی ہے۔ اس زمانے میں ترکی اور روس کی جنگ ہونے والی تھی۔ حسن آرا آزاد سے کہتی ہے کہ وہ ترکی جائے اور ترکوں کے ساتھ مل کر روس کے خلاف جہاد کرے اگر وہ فاتح بن کر واپس آ گیا تو دونوں شادی کر لیں گے۔ آزاد شرط قبول کر لیتا ہے اور خوجی ساتھ چلنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ آزاد اور خوجی کا سفر اور سفر کے دوران کے واقعات اتنے مزیدار ہیں کہ پڑھنے والے کی دلچسپی کم نہیں ہوتی۔

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں فسانہ آزاد لگ بھگ سو برس پہلے لکھا گیا تھا۔ اس زمانے میں اردو میں عربی فارسی کے مشکل الفاظ کچھ زیادہ استعمال ہوتے تھے۔ آج کی طرح آسان اور سادہ زبان نہیں لکھی جاتی تھی۔ اس لیے اب بھی فسانہ آزاد سے صرف بڑے اور زیادہ پڑھے لکھے لوگ ہی لطف اٹھا سکتے ہیں۔

دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں بچوں کو اپنے کلاسیکی ادب سے متعارف کرانے کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا ہے۔ وہاں بڑے بڑے مصنفین کی تقریباً تمام ہی کتابوں کے آسان ایڈیشن شائع کیے جاتے ہیں اس سے بچوں کو شروع ہی سے ادب سے گہری دلچسپی ہوتی ہے اردو میں اس بڑے ہی اہم کام سے اب تک غفلت برتی گئی ہے حالانکہ یہ کام اب سے بہت پہلے شروع ہو چکا ہونا چاہیے تھا۔

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے فسانہ آزاد کی تلخیص ہے جو خاص طور پر بچوں کے لیے کی گئی ہے اس میں حسب ذیل باتوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

1 کہانی کے وہ دلچسپ واقعات انتخاب کیے گئے ہیں جو بچے پڑھ کر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ غیر ضروری واقعات اور عشق و محبت کی تفصیلات نکال دی گئی ہیں۔

2 اصل زبان کو جوں کا توں رکھنے کی ممکن حد تک کوشش کی گئی ہے کیوں کہ اس کہانی کا اصل لطف زبان کی لطافت اور چاشنی ہی میں ہے۔

البتہ جہاں عربی فارسی کے مشکل الفاظ اور تراکیب آئی ہیں انہیں یا تو نکال دیا گیا ہے یا آسان الفاظ میں ڈھال دیا گیا ہے۔

3 اصل کتاب کے آغاز میں قصے میں ربط نہیں ہے۔ آزاد کے متفرق واقعات ہیں انہیں چھوڑ کر کہانی کو وہاں سے شروع کیا گیا ہے جہاں سے باقاعدہ اور مربوط کہانی شروع ہوتی ہے تا کہ بچوں کو بے ربط واقعات سے الجھن نہ ہو۔

ہمیں امید ہے کہ بچے فسانہ آزاد کے اس نئے اور جدید سلسلے کو بہت پسند کریں گے۔ اس سے نہ صرف ان میں مطالعے کا شوق بڑھے گا بلکہ اردو کی کلاسیکی کتابوں سے ان کا تعارف بھی ہو جائے گا اس عمر میں پڑھا ہوا یہ سلسلہ ایک بنیاد کا کام دے گا اور بڑے ہو کر جب وہ مکمل کتاب پڑھیں گے تو اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں گے۔

ذوالفقار احمد تابش

29 دسمبر 1973ء

میاں آزاد

ایک دن میاں آزاد نے سوچا کہ کسی مسجد میں جا کر نماز پڑھی جائے کیونکہ جمعے کا دن ہے اور جمعے کی نماز کا بڑا ثواب ہے۔ میاں آزاد ایسے مزے میں آئے کہ فوراً چل کھڑے ہوئے دیکھتے کیا ہیں کہ بڑے بڑے مولوی، عالم فاضل چلے جا رہے ہیں۔ چہرے سے نور الٰہی برستا ہے۔ اتنے میں دو آدمی جنوں اور چڑیلوں کی باتیں کرتے ان کے قریب آئے ان میں ایک موٹا تازہ اور دوسرا کمزور اور دبلا سا تھا

موٹا: یار تم تو مغز کے بھیجے کے گودے کے کیڑے تک چاٹ گئے ہوا لاکھوں دفعہ سمجھایا کہ یہ سب ڈھکوسلا ہے مگر تم کب سننے والے ہو میاں یہ سب لغو باتیں ہیں، واللہ بنی ہوئی باتیں ہیں

دبلا: جیسے بھدے تم ویسی بھدی تمہاری عقل

موٹا: اس بات سے موٹے اور دبلے سے کیا واسطہ؟ اگر آپ بھوت دکھا دیں تو ٹانگ کے راستے نکل جاؤں

دبلا: پرسوں ہی میرے ایک دوست نے آدھی رات کے وقت دیوار پر ایک چڑیل دیکھی آپ کہہ دیں گے کہ جھوٹ ہے۔

موٹا: بھائی یہ سب غپ ہے۔ یہ وہم ہے اور میاں کروڑ باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ بغیر دیکھے ہم نہ مانیں گے۔ لوگ بات کا بتنگڑ، سوئی کا بھالا، بدرو کا نالا بنا دیتے ہیں۔ ایک صحیح تو ننانوے لغو اور آپ ایسے ڈھلمل یقین حضرات نے تو جو سنا

فوراً مان لیا میاں ہم سب پاپڑ بیل چکے ہیں۔کئی جن ہم نے اتارے، کئی چڑیلوں سے محلے ہم نے خالی کرائے۔میاں ہم جیتے جاگتے بھوت ہیں اور پڑھے لکھے جن یہ سب ڈھکوسلا ہی ڈھکوسلا ہے بھوت کوئی ہم پر بلائے تو جانیں۔

دبلا: خیر اس تو تو، میں میں سے کیا واسطہ۔چلیے ہمارے ساتھ یہاں سے کوئی دو تین کوس کے فاصلے پر گاؤں ہے، وہاں ایک صاحب رہتے ہیں اگر آپ کی کھوپڑی پر ان کے عمل سے بھوت نہ چڑھ بیٹھے تو گدھے کے پیشاپ سے مونچھ منڈوا ڈالوں کہیے گا شریف نہیں چمار ہے۔اب چلیے بندہ ثبوت دے گا۔

وہ دونوں اس گاؤں کی طرف چلے۔میاں آزاد تو دنیا بھر کے بےفکرے تھے ہی شوق چرایا کہ چلو سیر کر آؤ، اچھی دل لگی رہے گی سیدھے سرا چلے

''ارے کوئی اکہ یکہ کرائے کا ہو گا؟ کوئی اکے والا ہے؟''

''جی ہاں کہاں کو جایئے گا؟''

''کہاں کو۔۔۔۔۔'' سک جمل دی پور!

''کیا دیجیے گا؟''

''پہلے گھوڑا اکہ تو دیکھیں''

''وہ کمانی دار اکہ کھڑا ہے اور یہ سرنگ گھوڑی ہے''

''ارے تو بہ مریل، دبلی پتلی، ہڈی ہڈی گن لو، یہ تو کوئی نو دن میں ڈھائی کوس چلے گی۔''

''کون؟۔۔۔۔ یہ گھوڑی واہ ہجور (حضور) ہوا سے باتیں کرتی جاتی ہے۔ بیٹھے اور دن سے پہنچے واہ وا گھڑیا (گھوڑی) کیا ریل کا انجن ہے۔''

''اچھا کسو چار آنے دیں گے''

''دھیلی (آٹھ آنے) کے پیسے لیں گے''

میں آزاد دوسری طرف سے چلے پھر پلٹے

''اچھا پانچ آنے دیں گے''

''نہیں کھدواند (خداوند) سات گنڈے (سات آنے) سے کوڑی کم نہ لیں گے''

''اچھا کسو''

اتنے میں میاں آزاد نے ایک صاحب سے پوچھا ''کیوں حضرت اس گاؤں کو ''سک جمل دی پور'' کیوں کہتے ہیں؟''

جناب اس کی بڑی مزے کی داستان ہے ایک صاحب تھے شیخ جمال الدین انہوں نے گاؤں بسایا اور شوق چرایا کہ اپنا نام رکھیں شیخ جمال الدین پورا نام رکھا گنوار آدمی شیخ جمال الدین کیا جانیں انہوں نے شیخ کا سک جمال کا جمل اور الدین کا دی کر دیا۔

اتنے میں اکے والے نے آواز دی کہ اکہ تیار ہے۔ میاں آزاد جلدی سے اکے پر سوار ہوئے اور اکہ کھڑ کھڑاتا چلا۔ راستے میں انہوں نے اکے والے سے پوچھا:

''کیوں بھئی دن بھر میں کے امل جاتا ہوگا؟''

''اے ہجور! اب رجگار (روزگار) کہاں؟ صبح سے شام تک جو ملا چرندم پرندم دو ڈھائی آنے جنور (جانور) کھا گیا۔ دو تین گنڈے گھر کے خرچ میں گئے۔ دھیلے

پیسے کا سلجھا تماخو (سافا تمباکو) اڑایا پھر موچی کے موچی مہاجن کے پچیس روپے چھ ماہ سے ادا نہ ہوئے، کوئی دو پونے دو گھنٹے میں میاں آزاد سک جمل دی پور پہنچے پتا تو ان کو معلوم ہی تھا۔سیدھے چلے اور عامل کے مکان پر کھٹ سے داخل اللہ اللہ بڑی بھیڑ ہے خلقت ہے کہ اڈی چلی آتی ہے۔عورت مرد ٹوٹے پڑتے ہیں تماشائیوں کا تانتا لگا ہے اس ہجوم میں آزاد نے اس موٹے کو ڈھونڈ نکالا جو دعویٰ کر کے آئے تھے کہ بھلا ہم پر تو کوئی بھوت بلائے ایک گوشے میں لے جا کر ان سے یوں کہا''

آزاد: میاں ہم اس وقت مسجد کے پاس تمہاری باتیں کان دھر کے سن رہے تھے۔قسم لے لو جو ہم کبھی بھوت پریت کے قائل ہوں ہوں یار اب ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس عامل کی قلعی کھل جائے۔

موٹا: اور میں آیا کس فکر میں ہوں آپ خاموش رہیں میں ابھی سب ٹھیک بناتا ہوں آج ہی تو پھنسے ہیں چڑا گلیجر وایسا دباؤں کہ چھٹی کا دودھ نکل پڑے اب ہم ایک سے دو ہوئے۔

اتنے میں عامل صاحب تہہ باندھے، لمبے لمبے بال بڑھائے۔حنا کا تیل پڑا ہوا۔مانگ نکالے کھڑاؤں پہنے تشریف لائے آنکھوں سے جلال برستا تھا۔جن کی طرف نظر بھر کے دیکھا وہی کانپ اٹھا انہوں نے غل مچانا شروع کیا۔

''دھونی میری جلتی ہے، جلتی ہے اور ملتی ہے دھونی میری جلتی ہے
کھڑی مونچھیں اور چڑھی داڑھی لمبے گیسو والا ہے لمبی زلفوں والا ہے
میرا درجہ اعلیٰ ہے۔''

جھوم جھوم کر جو انہوں نے ہانگ لگائی تو سب سناٹے میں آ گئے ایک ہی دفعہ بآواز بلند پکارا کہ کسی کو دعویٰ ہو تو آ کر کشتی لڑے، ہاتھی کے ٹکر دوں تو چنگھاڑ کر نوک دم بھاگے (خم ٹھونک کر) آئے کون آتا ہے۔

اب سنیئے کہ پہلے سے ایک شخص کو پڑھا سکھا رکھا تھا، وہ تو سدھا ہوا تھا ہی جھٹ کھڑا ہو گیا۔

''ہم لڑیں گے''

لوگوں نے دیکھا کہ ایک شخص مقابلے کے لیے کھڑا ہوا ہے مگر عامل کی وہ ہوا بندی تھی کہ لوگ اس پہلوان کی حالت پر افسوس کرنے لگے۔ الغرض دونوں آمنے سامنے آئے۔ عامل نے گردن پکڑتے ہی زمین پر دے ٹپکا۔ پہلوان پندرہ منٹ تک بے ہوش پڑا رہا۔ اتنے میں عامل نے پھر اکڑتے ہوئے ہانک لگائی کہ'' کوئی اور زور آزمائے گا؟'' میاں آزاد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ چٹ لنگوٹ باندھ دھم سے کود پڑے

''آؤ استاد ایک ایک پکڑ ہم سے بھی ہو جائے''

تب تو عامل صاحب چکرائے کہ یہ اچھے بگڑے دل ہیں پوچھا:

''آپ انگریزی خواں ہیں''

آزاد نے کڑک کر کہا'' حضرت میں مفت خواں ہوں بس اب سنبھلیے میں آ گیا۔ یہ کہہ کر گھٹنا ٹیک کر قلا جنگ کے پیچ پر مارا، چاروں شانے چت، عامل زمین پر دھم سے گرے ان کا گرنا تھا کہ میاں آزاد چھاتی پر چڑھ بیٹھے''

''اب بتاؤ بچہ کاٹ لوں ناک، کتر لوں کان، ہات تیرے کی عامل بنے

ہیں۔‘‘

موٹے نے جھپٹ کر آزاد کو گود میں اٹھالیا ’’واہ استاد، عامل کی ساری شیخی خاک میں مل گئی‘‘ گنواروں کا عقیدہ جاتا رہا۔ عامل بچارے کو اسی دن گاؤں چھوڑنا پڑا۔ میاں آزاد عامل کی پٹخنی بتا کر اور گاؤں کے ڈھلمل یقین لوگوں کو سیدھے راستے پر لگا کر میاں موٹے کو ساتھ لے ہاتھ میں ہاتھ دیے شہر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں اسی عامل کی باتیں اور ٹھٹھے ہوتے جاتے ہیں۔

’’کیوں سچ کہنا کیسا اڑنگا دیا۔ بہت بلبلا رہے تھے۔ عامل کی دم بنے تھے۔ یاد ہی تو کرنا ہوگا۔ قسم حسین کی جوان باتوں کی ذرا بھی اصلیت ہو، کیسا پریت، کس کا بھوت، کہاں کی چڑیل۔ سب ڈھکوسلا سب گپ۔‘‘

☆☆☆☆☆☆

آزاد، یکرنگ اور پہلوان

میاں آزاد زمین کا گز بنے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ایک شہر میں پہنچے تو جس کو دیکھتے ہیں بانکا، تیکھا، ترچھا ایک بانکے کو دیکھ کر ایک دکاندار کہیں ہنس پڑا۔ بانکے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دن سے تپنچہ داغ دیا۔ مگر نشانہ اتفاق سے خالی گیا لوگوں نے پوچھا: ''کیوں کا کا کیوں بگڑ گئے؟''

تیکھے ہوکر فرمایا ''ہم کو دیکھ کر بچہ جی مسکرائے تھے ہم نے گولی لگائی کہ دانت پر پڑے اور اس دندان شکن جواب سے ان کے بھی دانت کھٹے ہو جائیں مگر زندگی تھی کہ گولی سے بچ نکلا۔''

میاں آزاد اپنے دل میں سوچے کہ یہ بانکے تو بالکل ناخدا ترس ہیں۔ ان کو زیر نہ کیا تو کچھ بات نہیں ایک پان والے سے پوچھا کہ ''کیوں بھئی اس شہر میں بانکے بہت ہیں؟''

اس نے کہا ''میاں بانکا ہونا تو دل لگی نہیں، ہاں یوں کہیے کہ بے فکرے بہت ہیں اور ان سب کے گرو گھنٹال وہ ہیں جن کو لوگ '' یکرنگ'' کہتے ہیں وہ صندلی جوڑا پہن کر نکلتے ہیں، مگر کیا مجال کہ شہر بھر میں کوئی صندلی جوڑا پہن تو لے۔ کوئی پہنے تو گولی ماردیں۔''

میاں آزاد سوچے کہ اس یکرنگ کو مزا نہ چکھایا تو کھانا حرام دوسرے دن میاں آزاد بھی صندلی بوٹ، صندلی جوڑا صندلی ٹوپی پہن کر نکلے۔ اب جس گلی، کوچے بازار سے گزرہوتا ہے، لوگ تعجب کرتے ہیں آج اس ڈھب سے کون نکلے ہیں۔

ہوتے ہوتے یکرنگ کو بھی پتا چل گیا۔ سنتے ہی منہ لال چقندر ہو گیا۔ کپڑے پہن ہتھیار لگا چھل کھڑے ہوئے۔ میاں آزاد پان والے کی دکان پر جا کر ٹک گئے۔ ان کا حلیہ دیکھتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ لگا ہاتھ جوڑنے اور منتیں کرنے کہ خدا کے لیے میری ٹوپی پہن لیجئے، میرا جوتا بدل ڈالیے ورنہ وہ آتا ہی ہو گا۔ مفت کی ٹھائیں ٹھائیں سے کیا واسطہ آزاد کہاں مانتے تھے۔ پان کی گلوری لی اور اکڑ کر کھڑے ہو گئے۔

اردگرد تماشائیوں کا ہجوم ہے اور شہر بھر میں دھوم ہے کہ آج یکرنگ سے تلوار چلے گی اتنے میں حضرت یکرنگ بھی نمودار ہوئے پان والے نے میاں آزاد سے کہا "سنبھلیے"

ان کے آتے ہی بھیڑ چھٹ گئی۔ کوئی ادھر کترا گیا کوئی ادھر دبک رہا۔ کوئی گلی میں گھسا کوئی کمرے پر چڑھ گیا یکرنگ نے جوان کو دیکھا کہ سر سے پاؤں تک صندل پوشاک پہنے ہیں تو جل ہی مرا قہر آلود نظر ڈال کر بولا

"ابے او! اتار ٹوپی، بدل جوتا، گستاخ ہمارے ہوتے تو صندلی جوڑا پہن کر نکلے اتار نہیں تو میں بڑھ کر کام تمام کر دوں گا"

میاں آزاد پینترا بدل کر تیر کی طرح جھپٹ پڑے اور نہایت پھرتی سے یکرنگ کی توند پر تنچہ رکھ دیا اور بولے

"او گدھے! جنبش کی اور دھواں اس پار رہا اور دھائیں کی آواز آئی بولا اور لاش پھڑکنے لگی بڑا بانکا بنا سینکڑوں شریفوں کو بے عزت کیا اب اتنے چابک ماروں گا کہ یاد کرو گے بچہ جی ابھی اتار ٹوپی اتار نہیں تو دھواں پار"

اتفاق سے کہیں ایک درزی کا ادھر سے گزر ہوا۔ آزاد نے اس کی ٹوپی اتار کر یکرنگ کے سر پر رکھی اور یکرنگ کی صندلی ٹوپی اپنی جیب میں رکھ لی۔ بات تیزی ایس تیسی بڑے بانکے بنے تھے شہر بھر میں کوئی یکرنگ جوڑا نہ پہننا دری حکم لگا دیا غریبوں اور شریفوں کو بہت ستاتے تھے ہم سے ایک نہ چلی حوصلہ ہو تو آؤ دو دو ہاتھ بھی ہو جائیں خبردار جو آج سے صندلی جوڑا پہنا تو تم جانو گے۔

شہر بھر میں یہ دھوم ہوگئی کہ میاں آزاد نے یکرنگ کے چھکے چھڑا دیے۔ گھگھی بندھ گئی چپ چاپ درزی سے ٹوپی بدل لی۔ سچ ہے دبے پر بلی چوہے سے کان کٹاتی ہے اب تو میاں آزاد پر بانکوں کی بھی نظر پڑنے لگی۔ جس جگہ بھی جاتے تھے لوگ تعظیم کے ساتھ پیش آتے تھے۔

ایک دن انہوں نے منادی کر دی آج میاں آزاد چھ بجے صبح سے آٹھ بجے تک اپنے فن کے کرتب دکھائیں گے جن کو شوق ہو آئیں اور لطف اٹھائیں مقررہ دن کو ایک وسیع میدان میں غٹ کے غٹ جمع ہوئے اور میاں آزاد نے طرح طرح کے جوہر دکھائے لیموں پر نشان بنایا اور تلوار سے اڑایا تو نشان کے پاس کھٹ سے دو ٹکڑے تلوار باڑھ سے دس بارہ کی آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ چراغ جلایا اور کھانڈا اچھنکتے چھنکتے گل کاٹ ڈالا۔ لوا لگ بتی الگ ایک پیالے میں دس کوڑیاں رکھیں اور دو پر نشان بنا دیا۔ دونوں کو تلوار سے پیالے ہی میں کاٹا اور باقی کوڑیاں بچ نکلیں لکڑی ٹیکی اور چھت پر ہو رہے گتکے کا ذرا سا اشارہ کیا اور بیس ہاتھ اڑ گئے چالیس چالیس آدمیوں نے گھیرا اور یہ صاف نکل بھاگے پلنگ کے نیچے ایک جنگلی کبوتر چھوڑ دیا گیا انہوں نے اس کو نکلنے نہ دیا وہ لاکھ کوشش کرتا رہا مگر پھڑ پھڑا کر پھڑ

پھڑ اکر رہ جاتا تھا۔

بازار میں میاں آزاد کے قریب سے ایک پہلوان اینڈتے ہوئے نکلے۔ لنگوٹ باندھے ململ کی چادر اوڑھے دو تین چٹھے ساتھ ایک کسیرو والے کے سر پر پہلوان نے خدا واسطے کو دھپ لگا دی وہ پیچھے پھر کر دیکھتا ہے تو دیو نما آدمی بولے تو مار کھائے دھپ کھا کر دل ہی دل میں کوستا ہوا چلا گیا تھوڑی ہی دیر میں پہلوان نے ایک خوانچے والے کا خوانچہ الٹ دیا۔ تین چار روپے کی مٹھائی خاک میں مل گئی جب اس نے خوب ہی غل غپاڑا مچایا تو شاگردوں نے سر سہلایا دو تین گدے گھونسے لگا دیے دو چار لپڑ جا دیے وہ بچارا روتا چلاتا دہائی دیتا چلا گیا "دہائی ہے میرا خوانچہ اٹ گیا" میاں آزاد نے سوچا کہ یہ تو کوئی بڑا ہی شہدہ معلوم ہوتا ہے کسی پر لپڑ، کسی پر تھپڑ واہ کیا پہلوانی ہے اس کی خبر نہ لی تو کچھ نہ کیا اس نے تو شہر بھر میں تہلکہ مچا دیا ہے یہ سوچتے ہی آزاد جھپٹ پڑا اور پہلوان کے پاس جا کر گھٹنے سے ایسا دھکا دیا کہ میاں پہلوان نے بیس لڑھکیاں کھائیں اور سنبھلتے ہی ان کی طرف ڈپٹ پڑے۔ یہ بھی شیر کی طرح ڈکارتے ہوئے چلے تماشائی تو سمجھے کہ پہلوان قوی ہیکل آدمی ہے آزاد کو چرمر کر ڈالے گا۔ لیکن آزاد نے پہلے ہی سے وہ داؤ پیچ کیے کہ پہلوان کے چھکے چھوٹ گئے۔ ایسا دبایا کہ چھٹی کا دودھ حضرت کو یاد آ گیا۔ پہلوان نے جیسے ہی میاں آزاد کا بایاں ہاتھ گھسیٹا انھوں نے داہنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ باندھا اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور کولھے پر لاد، گھٹنا ٹیک کر مارا، چاروں شانے چت پہلوان اب تک کورا تھا۔ کسی دنگل میں آسمان دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی میاں آزاد نے جو سر بازار ایک پٹخنی بتائی اور اس نے ہزاروں آدمیوں میں پچھاڑ

کھائی تو بڑی کرکری ہوئی اور تمام عمر کے لیے داغ لگا۔

اب تو میاں آزاد جگت استاد ہو گئے۔ یکر نگ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ پہلوان نے پٹخنی کھائی اور وہ وہ جوہر دکھائے کہ لوگ دم بھرنے لگے۔ شہر بھر میں دھوم تھی جدھر جاتے تھے لوگ تعظیم بجالاتے تھے۔ جس سے چار آنکھیں ہوئیں اس نے فرشی سلام کیا اچھے اچھے بانکے دبنے لگے۔ شہدے، لچے، لفنگے میاں آزاد سے ایسے تھراتے جیسے چوہے بلی سے نام سنا اور بغلیں جھانکنے لگے۔ صورت دیکھی اور گلی کوچوں میں دبک رہے۔ غرض شہر بھر میں ان کا ڈنکا بج گیا۔

☆☆☆☆☆

نواب صاحب کے ہاں

کمال بھی کیا چیز ہے میاں آزاد کے ٹھاٹھ دیکھیے کہ کیا آن بان ہے جدھر گزرتے ہیں انگلیاں اٹھتی ہیں ہوتے ہوئے نوابوں رئیسوں میں بھی ان کا ذکر ہونے لگا۔ رئیسوں کو مرض ہے کہ کسی پہلوان کو ساتھ رکھیں۔

ایک نواب صاحب نے آزاد کو بھی بلوایا۔ یہ اوچکی بنے ہوئے پہنچے دیکھتے کیا ہیں کہ ایک نواب صاحب، اپنی ماں کے لاڈلے اندھیرے گھر کے اجالے، بھولے بھالے مسند پر بیٹھے حقہ گڑ گڑا رہے ہیں اتنے میں میر آغا بٹیر کو موٹھ کرتے ہوئے تشریف لائے اور آداب بجالا کر دو زانو بیٹھ گئے میر آغا ابھی اچھی طرح بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ اچھے مرزا گنا چھیلتے ہوئے آ گئے اور کونے میں جا ڈٹے۔ میاں جمن انگرکھے کے بند کھولے۔ گدی پر ٹوپی رکھے کھٹ سے موجود

پھر کیا تھا تو آ، میں آدس پندرہ حضرات جمع ہو گئے۔ مگر سب شہدے، گرگے کوئی چینی کی پیالی میں افیون گھول رہا ہے۔ کوئی چانڈو کا قوام بنا رہا ہے کسی نے گنڈیریاں بنائیں، کسی نے امیر حمزہؓ کی داستان چھیڑی۔ سب اپنے اپنے دھندے میں مصروف ہوئے اتنے میں نواب صاحب نے میر آغا سے پوچھا:

نواب صاحب: میر صاحب! آپ نے چاول کا درخت بھی ملاحظہ فرمایا ہے؟

میر آغا: حضور قسم ہے جناب امیر علیہ السلام کی ستر اور دو چوہتر (دو بہتر لاحول مجھے تو گنتی بھی نہیں آتی) بہتر برس کی عمر ہونے کو آئی غلام نے آج تک آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن حضور ہوگا درخت بڑا ایک عالم کی اس سے پرورش ہوتی ہے

جیسے دیکھو چاولوں پر ٹھیے لگاتا ہے۔

اچھے مرزا: قربان جاؤں درخت کی بڑے ہونے میں کیا شک ہے کشمیر سے لے کر قربان جاؤں، بڑے گاؤں تک اور لندھن (لندن) سے والائت تک سب اسی کے خوشہ چین ہیں مگر حضور بنگال میں چاول کے پیڑ بڑے بڑے، کوئی بلینڈی کے برابر، ہوتے ہوں گے۔ وہاں تو اسی پر دارومدار ہے۔

نواب صاحب: میرا قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ درخت ہوگا عظیم الشان لیکن ہاں دریافت طلب یہ بات ہے کہ آخر کس درخت سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ اگر یہ دریافت ہو جائے تو پھر جانیے کہ ایک نئی بات ایجاد ہوئی اور بھئی سچ پوچھو تو تحقیقات کے بھی یہی معنی ہیں، کہ جب تک ایک ایک بات کی خوب چھان بان نہ ہو تب تک لطف نہیں۔

مسیتا بیگ: حضور برگد سنا ہے بڑا عظیم الشان درخت ہوتا ہے۔ اللہ بہتر جانے نیم کا پیڑ تو ہم نے بھی دیکھا ہے کتابوں میں البتہ پڑھا ہے۔

چھٹن: ہم نے کیلے کا پیڑ، امرود کا پیڑ خربوزے کا پیڑ یہ سب انہی آنکھوں دیکھ ڈالے۔

آزاد: بھلا یہاں کسی صاحب نے واہ وا کی پھلیوں کا پیڑ بھی دیکھا ہے

گپی: جی ہاں حضرت ایک دفعہ نیپال کی ترائی میں دیکھا تھا مگر شیر جوڑ کا تو میں گینڈے کے درخت پر جھپ سے چڑھ گیا۔ کچھ یاد نہیں کہ پتی کیسی ہوتی ہے۔

منے میاں: بھئی چاول کے درخت کا کچھ حال دریافت کرنا چاہیے لاکھ جتن کیجئے بھید ہی نہیں کھلتا اور یوں گدے بازیوں سے کام نہیں چلتا۔ پیپل سے بڑا

درخت تو آج تک سنا ہی نہیں حتیٰ کہ لوگ اس کے سائے تلے لوگوں کی قسم کھاتے ہیں مثلاً

پیپل تلے کے بھتنے کے شیطان کی قسم

اچھے مرزا: قربان جاؤں ان لوگوں کی باتوں کا اعتبار کیا۔ سب سنی سنائی کہتے ہیں قربان جاؤں غلام نے وہ بات سوچی کہ سنتے ہی پھڑک جایئے۔ قربان جان کہتے ہوئے لب بندھے جاتے ہیں۔

نواب صاحب: ہاں واللہ میر صاحب! آپ کو قسم ہے پنج تن پاک کی جو نہ کہیے حضرت اب اشتیاق بڑھتا جاتا ہے۔

اچھے مرزا: قربان جاؤں (گنے کو ٹیک کر) اگر چاول کا درخت ہوگا تو اس گنے کے برابر ہوگا جو بھر بڑا نہ تل بھر چھوٹا

نواب صاحب: واللہ واہ میر صاحب کیا بات نکالی ہے۔

آزاد: آپ تو اپنے وقت کے لال بجھکڑ نکلے۔ کیا بات پیدا کی ہے بھئی معلوم ہوتا ہے سفر بہت کیا ہے۔

اچھے مرزا: کون؟۔۔۔۔میں نے!۔۔۔۔۔سفر؟ ارے توبہ! قسم لو جو نخاس سے باہر گیا ہوں۔ مگر میاں میں لڑکپن ہی سے ذہین تھا۔ والد مرحوم تو بالکل بیوقوف تھے مگر اماں بلا کی عورت تھیں۔ افوہ! وہ بات میں بات پیدا کرتی تھیں کہ اچھے اچھے مردوں کی عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ سترہ برس کی عمر تک انہوں نے ہمیں پالا پرو سا۔ پھر بھلا ہم برق کیوں نہ ہوا۔

اتنے میں غل غپاڑے کی آواز آئی ہائیں خیر تو ہے بھئی آخر ماجرا کیا ہے۔ اندر

سے مبارک قدم لونڈی پاؤں ننگے، سر پیٹتی ہوئی آئی۔

لونڈی: حضور، حضور! میں صدقے واسطے خدا کے جلدی چلیے یہ ہنگامہ کہاں ہو رہا ہے۔ بڑی بیگم صاحبہ کھڑی رو رہی ہیں کہ میرے بچے پر آنچ نہ آجائے۔

نواب صاحب جوتیاں چھوڑ کر اندر بھاگے۔ دروازے سب بند اب کسی کو حکم نہیں کہ زور سے بولے۔ اتنے میں ایک مصاحب نے ڈیوڑھی پر سے پکارا:

مصاحب: پیرومرشد! میاں آزاد پھر آخر کس مرض کی دوا ہیں۔ گنڈیری چھیلنے کے کام کے نہیں، قوام بنانا نہیں آتا۔ بٹیر مٹھیا نے میں مانگو۔ ان کو بھیج کر دریافت نہ کروائیں کہ یہ دنگا کہاں ہو رہا ہے؟

مبارک قدم: ہاں ہاں بھیج دیجئے کہیے کتے کی چال جائیں اور بلی کی چال آئیں۔

میاں آزاد نے ایک خدمت گار کے ہاتھ میں تلوار دی اور خود کٹار لے کر اینڈتے ہوئے چلے۔ راہ میں لوگوں سے پوچھتے جاتے ہیں کہ: "کیوں بھئی یہ فساد کیا ہے۔ دنگا کہاں ہو رہا ہے" ایک نے کہا:

"اجی چلمنڈی میں قصابوں میں چھیچھڑے پر چھری چلی۔ ایک شخص گوشت لینے آیا تھا۔ اس کو یہ سوجھی کہ اپنے کتے کے لیے چھیچھڑے لے بھاگے۔ جب قصائی نے دبوچا تو سب قصائیوں کے نام لے لے کر کوسنے اور صلواتیں سنانے لگا۔ اس چھیچھڑے پر چھری چل گئی ایک نے پچھاڑا، دوسرے نے ٹنگڑی لی۔ اس دل گردے کو تو دیکھیے کہ دن دہاڑے آنکھ میں خاک جھونک کر دکان سے مال غائب کیا۔ یہ چوری ہے یا سینہ زوری"

پانچ چار قدم آگے بڑھے تو دو چار آدمی باتیں کرتے جاتے تھے "میاں! ہوا یہ کہ پنساری نے پڑیا میں جمال گوٹہ باندھ دیا۔ انہوں نے آتے ہی گردن ناپی کہ مغز کدو کے بدلے جمال گوٹہ ملا دیا۔"

اور دس قدم چلے تو ایک شخص نے کہا:

"وہ تو کہیے خیریت گذری کہ آنکھ کھل گئی ورنہ بھیڑیا گھر بھر کو اٹھا لے جاتا"

"بائیں بھیڑیا کیسا؟"

"جی حضور! ایک منہار گھر سے بھیڑیا تین بکریوں، دو مینڈھے، ایک خرگوش اور ایک خالی پنجرا اڑا لے گیا۔ اس کی عورت کو بھی پیٹھ پر لاد چکا تھا کہ منہار جاگ اٹھا"

اب میاں آزاد چکرائے گئے بھئی یہ عجب بات ہے۔ جو ہے نئی سناتا ہے۔ قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ پندرہ بیس آدمی مل کر چھپرا اٹھاتے ہیں اور غل مچا رہے ہیں۔ لاحول ولاقوۃ کوئی کہتا تھا کہ چھچھوندروں پر چھری چلی کوئی پنساری اور جمال گوٹے کی کہانی سناتا تھا۔ ایک بھیڑیے کی کہانی گھڑ لائے۔ دس ہی قدم میں پچاسوں باتیں سننے میں آئیں۔ اور قریب آئے تو ٹائیں ٹائیں فش جتنے منہ اتنی باتیں اور واللہ ہنسی تو یہ آئی کہ نواب صاحب کیسے بدحواس ہو کر غڑاپ سے گھر کے اندر ہو رہے اور گھر میں کہرام مچ گیا۔ رفقا اور مصاحبین نے دروازے بند کر لیے۔ آخر کار ہم اس میدان میں چن کر بھیجے گئے۔ اللہ ری دہشت واہ میاں واہ! بانکپن ختم ہے۔



تین سوال

نواب صاحب ایک دن اپنی کوٹھی کے ایک رنگین کمرے میں بیٹھے مصاحبوں، رفیقوں سے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں میاں آزاد نے دروازے میں سے گردن نکالی:

آزاد: آداب عرض کرتا ہوں پیر و مرشد!

نواب صاحب: آیئے میاں آزاد! کہیے کہاں سے سواری آتی ہے؟ اس وقت تو کچھ چہرا تمتمایا ہوا ہے کیا کسی سے جھگڑا ہوا ہے۔

آزاد: اے حضور! آپ کی جوتیوں کے صدقے میں اس جگہ کوئی آنکھ نہیں ملا سکتا۔ دھاک ہے۔ محلّہ محلّہ ہوا بندھی ہے۔ اچھے اچھے پہلوانوں نے پچھاڑیں کھائیں۔ ہم نے وہ پٹخنیاں بتائیں کہ چھٹی کا دودھ یاد آیا ہوگا۔ اس وقت بندہ ایک نانبائی کی دکان پر پلاؤ بنانا سیکھتا تھا۔ آنچ کے سامنے جو جم کے کچھ دیر بیٹھنا پڑا تو چہرہ لال انگارا ہو گیا۔

نواب صاحب: تو یہ کہیے نانبائی گری کا بھی شوق چرایا

مصاحب: حضور اس شہر میں ایک عالم آیا ہے کہتا ہے دنیا بھر کی کتابیں چاٹ گیا ہوں۔ مخصوصاً مناظرے کے علم میں تو کمال حاصل ہے منطق کے زور سے جھوٹ کو سچ کر دکھائے مگر خدا کو نہیں مانتا، پکا ملحد اور منکر ہے۔

آزاد: واہ منطق کی اچھی قدر کی حضرت ان سے تو ہم بھی ملنا چاہتے ہیں واللہ خدا کا وہ کامل ثبوت دوں کہ خود پھڑک جائیں۔ ذری یہاں تک لایئے تو سہی

بھاگے راہ نہ ملے۔ پھر جو اس شہر میں منہ، دکھائیں تو آدمی نہ کہنا۔

نواب صاحب: ہاں ہاں میر صاحب! ذری ان کو پھانس کر لائیے تو میاں آزاد کے جوہر تو کھلیں مگر میاں ان منکروں سے بھڑنا دل لگی نہیں۔ کسی کے قائل ہی نہیں ہوتے۔

اس پر میر صاحب نے زور سے دو چار قدم لگائے اور لڑھکتے ہوئے گئے اور چھپ سے اس دہریے کو لائے۔ یہاں ہجوم عام تھا ملحد نے آتے ہی پوچھا کہ کون صاحب بحث کریں گے۔

میاں آزاد بولے "ہم"

اب سب منتظر ہیں کہ دیکھیں کیا سوال جواب ہوتے ہیں چو طرفہ کھچڑی پک رہی ہے کہ یہ ملحد تو کسی سے آج تک قائل ہی نہیں ہوئے

آزاد: سامعین! اس دہریے کے دل گردے کو دیکھیے کہ اللہ میاں کے قائل نہیں۔ یہ شکل اور یہ صورت اور یہ خیال اے لعنت!

ملحد: پانی پی پی کر کوسنا اور بات ہے اور بحث کرنا اور بات ہے ہمیں کوئی قائل کر دے تو جانیں یہ کیا بات کہ لگے گالیاں دینے

آزاد: کوئی سوال کیجیے تو ہم جواب دیں گے۔ شک رفع کر دیں

ملحد: اچھا پہلے تو ان تین سوالوں کا جواب دیجیے پھر اور بحث چھڑیں گے۔

پہلا سوال: خدا ہے تو ہمیں نظر کیوں نہیں آتا؟

دوسرا سوال: شیطان اگر آگ کا بنا ہوا ہے اور وہ دوزخ میں جلایا جائے گا۔ واہ واواہ بلا آگ کی بنی ہوئی چیز کو آگ کا کیا ڈر ہے۔ اس سزا کا اس کو کیا خوف؟

تیسرا سوال: جو کرتا ہے خدا کرتا ہے، پھر انسان کا قصور کیا؟

چو طرفہ سناٹا پڑ گیا۔ واللہ کیا عالم ہے او ہو او ہو کیا کڑے سوالات کیے ہیں۔ سب کے اوسان خطا ہوش اڑے ہوئے۔ بگڑے دل لوگ دانت پیس رہے ہیں کہ باہر نکلے تو گردن ناپیں کوئی دل ہی دل میں کوس رہا ہے کہ خدا کرے یہ ابھی ابھی مر جائے۔ کوئی قہر کی نظر سے گھور رہا ہے کہ اتنے میں میاں آزاد نے کہا:

''یار ایسی باتیں نہ کرو جہنم میں جلائے جاؤ گے''

''جہنم میں؟'' اس نے مسکرا کر کہا

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کو خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اس پر آزاد نے ایک ڈھیلا کھینچ مارا۔ کھٹ سے اس منکر کی کھوپڑی پر پڑا۔ ہائے کر کے بیٹھ گیا۔

''اف لاحول ولاقوت اچھے وحشی سے پالا پڑا۔ میں بحث کرنے آیا یا لپاڈگی کرنے۔ جب ہارنے لگے تو ڈھیلے مارنے لگے۔ اور جو میں بھی ایک پتھر کھینچ ماروں تو پھر کیسی ہو بچہ جی؟ جاہلوں کا قاعدہ ہے کہ ہاتھا پائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں وہائی ہے نواب صاحب کی''

نواب صاحب: بھئی آزاد ہمیں یہ تمہاری حرکت پسند نہیں آئی یہ ڈھیلے بازی کے کیا معنی بحث کر کے انہیں منوایئے یہ نہیں کہ جوتا کھینچ مارا یا تان کے ایک ڈھیلا لگایا

آزاد: پیر و مرشد! میں نے تینوں سوالوں کا وہ جواب دیا کہ اگر کوئی قدردان

ہوتا تو اس وقت گلے سے لگالیتا اور کروڑوں روپیہ انعام کا دیتا۔ سنیے

پہلا سوال: خدا ہے تو ہمیں کیوں نظر نہیں آتا

جواب: اگر اس ڈھیلے سے ان کو چوٹ لگی تو چوٹ نظر کیوں نہیں آتی

سبحان اللہ کا ڈونگرا برس گیا۔ واہ استاد واہ واللہ کیا جواب تر کی بتر کی دیا ہے۔

دوسرا سوال: شیطان کو دوزخ کی آگ میں جلانا بے کار ہے کیونکہ وہ تو خود آگ کا بنا ہوا ہے۔

جواب: ان سے پوچھیے کہ یہ مٹی ہی کے بنے ہوئے ہیں یا نہیں ان کی کھوپڑی مٹی ہی کی بنی ہے۔ پھر مٹی کا ڈھیلا لگا تو سر کیوں بھنا گیا؟ بات تیرے کی!

واہ میاں آزاد کیا جواب دیا کہ دانت کھٹے کر دیے

تیسرا سوال: جو کرتا ہے خدا کرتا ہے

جواب: پھر ڈھیلا لگانے کا جرم ہم پر کیسا؟

ٹوپیاں چوطرفہ اچھلنے لگیں کہ واہ میرے شیر کیا کہنا ہے

اوہو ہو ہو کہو چڈا گل خیر واب خدا کے قائل ہوئے یا اب بھی کچھ مین میخ باقی ہے۔ کروڑوں باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ جب آپ ہی خاکی ہیں اور مٹی ہی کا ڈھیلا مارا تو آپ کی کھوپڑی کیوں بھنائی۔

لیجیے صاحب اب تک تو میاں آزاد پہلوان ہی تھے۔ اب صوفی صافی اور مولوی بھی مشہور ہو گئے۔ نواب نے میاں آزاد کی پیٹھ ٹھونکی واہ کیوں نہ ہو پہلے تو میں جھلایا کہ یہ ڈھیلا بازی کے کیا معنی مگر پھر تو پھڑک گیا کہ واہ کیا نازک خیال آدمی ہے۔

صف شکن

ایک دن میاں آزاد نواب صاحب کی کوٹھی میں دو زانو بیٹھے مصاحبین سے گپ اڑا رہے تھے۔ کسی کو لکڑی کی چوٹیں، کسی کو کشتی کے داؤ بتا رہے تھے کہ اتنے میں نواب صاحب نے کہا:

"کیوں میاں آزاد! کبھی بٹیریں بھی لڑائی ہیں؟ اب کی ربیع الاول میں وہ گھمسان کی لڑائیاں دکھائیں کہ واہ جی واہ"

مصاحب: میاں آزاد بٹیر کی لڑائی کے آگے توپ و تفنگ بھی گرد ہے آپ بھی کہیں گے کہ ہم آدمی ہیں اس ڈیوڑھی پر اتنے دن سے ہو اب تک بٹیر خانہ بھی نہ دیکھا۔ لے آؤ چلو! تم کو سیر کرائیں یہ کہہ کر بٹیر خانے لے گئے۔

میاں آزاد کیا دیکھتے ہیں کہ چوطرفہ کابکیں ہی کابکیں نظر آتی ہیں۔ اور کابکیں بھی ایسی قیمتی کہ اوہو ہو ہو۔ ہاتھی دانت کی تیلیاں، منقش کی جھالر، مخملی غلافیں رنگ برنگ سونے چاندی کی ننھی ننھی کٹوریاں جس میں بٹیر اپنی پیاری پیاری نکیلی چونچوں سے پانی پئیں۔ پانچ پانچ چھ چھ سو کی لاگت کی کابکیں ہر سمت ٹنگی میں کھونٹیاں بھی رنگ برنگی مصاحب ایک ایک کا پک اتار کر بٹیر دکھا کر تعریف کرنے لگے تو پل باندھ دیے۔ ایک بٹیر کو دکھا کر کہا کہ صف شکن جو آپ نے سنا ہوگا یہی حضرت ہیں۔ لندن تک اخبار میں اس کا حال چھپ گیا میری جان کی قسم ذرا اس کی آن بان کو تو دیکھیے گا (چوم کر) ہائے کیا بانکا بٹیر ہے۔ یہ نواب صاحب کے دادا جان کے وقت کا ہے۔ ان کی وفات کو کوئی بیس تیس برس ہوئے ہوں گے بس یہ

سمجھیے کہ محمد علی شاہ کے وقت خریدا گیا تھا۔اب کوئی سو برس کا ہوگا۔دو کم یا دو اوپر مگر اس وقت بھی مرغ پر لپک کرلات دے تو وہ بھی چیں بول جاوے۔

پارسال کی دل لگی سنیئے نواب صاحب کے ماموں تشریف لائے ان میں بھی ریاست کی بو ہے۔بٹیر بازی کا بھی پرلے درجے کا شوق ہے۔آپ کا ''ظفر پیکر'' تو بلا کا بٹیر ہے۔خیر آتے ہی نواب کو لے کر بٹیر دیکھنے گئے۔میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا

''حضور کو بٹیروں کا مدت سے شوق ہے کروڑوں ہی بٹیر دیکھ ڈالے ہوں گے مگر صف شکن کا سا بٹیر تو حضور نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔''

ماموں: ہونہہ اس کی کیا حقیقت ہے ظفر پیکر کو دیکھو تو آنکھیں کھل جائیں عقل کے ناخن لیجئے بڑھ کر ایک لات دے تو صف شکن کیا معنی آپ کو پالی باہر کردے۔ حوصلہ ہو تو منگواؤں؟

نواب: اچھا ماموں جان! پھر کل ہو جائے دو دو چونچیں تو ہوں

ماموں: کیا مضائقہ ہے مگر اپنا بٹیر آپ مفت میں کٹوائیں گے آپس کی لڑائی سے فائدہ؟ یا اچھا کل ہو ہی جائے ادھر یا ادھر

غرض دوسرے دن پالی ہوئی ہزاروں آدمی جوق در جوق آن موجود شہر بھر میں دھوم تھی کہ آج بڑے معرکے کی جنگ ہے۔ادھر ظفر پیکر اس ٹھاٹھ سے آیا کہ زمین ہل گئی اور میرا تو کلیجہ دہلنے لگا۔مگر صف شکن نے اس دن آبرو رکھ لی۔ جب ہی تو نواب صاحب اس کو بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ سچ تو یوں ہے کہ اس نے اس دن نواب صاحب کی سات پیڑھیوں پر احسان کیا! خیر صاحب! ظفر پیکر بجلی

کی طرح صف شکن کی طرف چلا۔ آتے ہی دبوچ بیٹھا اور چوٹی کو چونچ سے پکڑ کر ایسی ایسی مروڑیاں دیں کہ دوسرا ہوتا تو ایک رگڑے میں پھر سے بھاگ کھڑا ہوتا۔ نواب صاحب کا اس دم چہرہ فق ہوگیا۔ اتنے میں صف شکن قلفی کر کے لوٹ ہی تو پڑا۔ واہ میرے شیر خوب بھراہاں بیٹے دے بڑھ کر لات۔ ایک لات ایسی جمائی کہ ظفر پیکر نے منہ پھیر دیا۔ منہ پھرنا تھا کہ صف شکن نے اچک کر ایک ایسی جھنجھوڑی بتائی کہ واہ وا اسی مقام پر ایک لات اور کس کر او ر اوہو ہو لگا ایک اور مروڑی اتنے میں ظفر پیکر پالی سے باہر پھر سے اڑ گیا وہ مار بھگایا۔ چوطرفہ ٹوپیاں اچھل گئیں واہ رے صف شکن۔

میاں آزاد نے دیکھا کہ نواب کا ہزار ہا روپیہ بٹیروں کے پھیر میں ناحق گھوما جاتا ہے۔ ذہن کے پکے تو تھے ہی سوچے کہ آؤ آج ان سب کو اڑا دیں تو اچھی دل لگی ہو یہ سوچتے ہی مصاحب سے کہا:

''یار آج اچھی سی افیون گھول کر پلاؤ تو ہم بھی بسم اللہ کر دیں۔ مصاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ دوڑتے ہوئے گئے کہ افیون گھول لائیں ادھر میاں آزاد نے میدان خالی پا کر کابکوں کی کھڑکیاں کھول دیں۔ بٹیر سب پُھر سے بھاگ گئے۔ صف شکن کو انہوں نے چھپا لیا۔ باقی سب ہوا میں موجیں لے رہے ہیں۔ بات تیرے کی! گھر بھر میں کتاب کا نام نہیں کاغذ، قلم، دوات سے کام نہیں کابک اور بٹیر کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ لو بچہ! اور پالو بٹیر''

☆☆☆☆☆☆

افیمی

نواب صاحب باغیچہ میں بیٹھے تھے۔ مصاحب اور رفقاء خوشامد کی باتیں بنا رہے تھے اور میاں آزاد صحبت گرما رہے تھے۔ ایک افیمچی پلاؤ کی چاٹ پر مسخرے بن گئے۔ چوطرفہ ان پر بوچھار ہونے لگی۔ ایک شخص نے کہا:

''کیوں یار! واحد علی تمہارے کون ہیں؟ بھائی ہیں نا!'' تو فرمایئے کیا ہیں:

''جی واحد علی میری خالہ کی بہن کے لڑکے کے باپ کے بیٹے ہیں'' اس پر وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ ساتویں آسمان تک آواز پہنچی نواب صاحب نے کہا:

خوجی! اس حوض میں نہاؤ تو ایک اشرفی دیتا ہوں

پیرومرشد! اشرفیاں تو حضور کی جوتیوں کے صدقے میں بہت سی مل جائیں گی مگر پھر جینا دوبھر ہو جائے گا۔ نہ صاحب مجھے تو کوئی فی غوطہ ایک اشرفی دے تو بھی نہ نہاؤں۔ پانی کی صورت دیکھے بدن کانپ اٹھتا ہے اور روح لرزنے لگتی ہے۔

''وہ کیسے مرد ہو جی!''

''میاں نہاتے نہیں آپ کوئی قاضی ہیں۔ ہم نہیں نہاتے پھر آپ کو کیا ہے؟''

''اجی سرکار کا حکم ہے''

''چلیے آپ کی بلا سے کہنے لگے سرکار کا حکم ہے پھر کوئی اپنی جان دے دے''

''حضور جو اس وقت دھم سے حوض میں نہ کود پڑیں تو افیم انہیں نہ ملے''

'' آپ بہت چل نکلے ہیں افیم کھلائیں حضور، کھائیں ہم آپ کون بیچ میں

بولنے والے اڑسٹھ برس سے تو میں افیم کھاتا آیا ہوں اب آپ کے کہنے سے چھوڑ دوں تو کیسے مرا یا جیا؟"

نواب صاحب نے کہا:

"اچھا بھئی جانے دو دودھ کھاؤ گے؟"

"واہ خداوند! نیکی اور پوچھ پوچھ دودھ تو وہ شے ہے جس کو انسان ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی غٹ غٹ پیتا ہے۔ لیکن ذری مٹھاس خوب ہو۔ شاہ جہاں پور کی سفید شکر یا روس کی کوٹھی کا قند یا کالپی کی مصری گھولی لیے گا اور تھوڑا سا کیوڑا بھی گبڑ دیجیے تو پیتے ہی آنکھیں کھل جائیں۔"

نواب صاحب نے حکم دیا کہ بھئی ان کے واسطے دودھ لاؤ

غفور خدمت گار چاندی کے کٹورے میں دودھ لایا

"خواجہ صاحب دودھ پیجیے!"

"چپ نامعقول اتنا بڑا لومڑ ہوا ہے اب ابھی تک تمیز نہیں آئی ہے "دودھ پینا" کہاں کا محاورہ ہے گنوار "دودھ کھانا" نہیں کہتا کٹوری یہاں رکھ دے میں ابھی آیا۔ ذری کتے بلی کو دیکھتے رہنا"

"کہاں، کہاں، خوجی کہاں؟ اے دودھ تو کھائے جاؤ مرد آدمی"

"کہیں نہیں حضور، ابھی آیا"

خوجی جب نظر سے اوجھل ہوئے تو میاں آزاد آدھا دودھ کھا گئے اور کٹورا لبالب کرنے کے لیے حوض سے پانی لے کر بھر دیا۔ اتفاق سے ایک چھوٹی سی مچھلی بھی پانی کے ساتھ کٹورے میں آ رہی۔ جب خواجہ صاحب تھوڑی دیر پھونک

پھونک کر قدم اٹھاتے ہوئے بر آمد ہوئے اور کٹورے کو دودھ سے لبالب پایا تو باچھیں کھل گئیں۔ جاتے ہی منہ ڈال دیا۔ اتنے میں مچھلی بھی منہ میں آئی تب تو چکرائے کہ الٰہی یہ کیا اسرار ہے۔ غفور پر بہت ہی جھلائے اور نواب صاحب سے بڑی شکایت کی کہ حضور اس کے کان کھینچنے چاہئیں ایسا غافل ہو گیا کہ حوض سے مچھلی اچک آئی اور انہیں کانوں کان خبر نہیں او گیدی اتنی قرولیاں بھونکی ہوں گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔

حاضرین نے خوب قہقہہ لگایا۔ جسے دیکھو لوٹ رہا ہے کہ واللہ اچھی دل لگی ہوئی اس پر میاں آزاد نے کہا:

"ارے کھا جا یہ دودھ کی مچھلی ہے"

تب ہی تو میاں اپنچی نہایت ہی افسوس کرنے لگے کہ ہائے ہائے ہاتھ سے نکل گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ دودھ کی مچھلی ہے ورنہ کچا ہی چبا جاتا۔ اس قسم کی مچھلی میں یہ خاصیت ہے کہ اسی برس کا بڈھا کھائے تو جوان ہو جائے۔ نئے سر سے دانت نکل آئیں۔ اس پر گھنٹوں دل لگی رہی۔

اتنے میں ایک صاحب نے پوچھا:

"خواجہ صاحب لوگ آپ کے والد صاحب کو باورچی بتاتے ہیں، واللہ ہم تو آپ کو شریف زادہ سمجھتے تھے مگر آپ پاجی ہی نکلے"

"پاجی آپ اور آپ کے باپ یہ پاجی کی کون سی بات چیت ہے ہم نے تو عمر بھر کبھی چولہا نہیں پھونکا۔ باپ دادا کا حال نہیں معلوم کون تھے، کون نہیں تھے۔"

"واہ میاں واہ تو یہ کہیے آپ کو اپنے باپ دادا کا حال ہی نہیں، معلوم تو بندہ نواز

آپ کی حالی خاندان کی قلعی کھل گئی۔بس بس اب آپ اس دربار کے لائق نہیں''

نواب صاحب نے مسکرا کر کہا:

''ارے میاں خوجی یہ تم بک کیا گئے کوئی اپنے باپ دادا کو بھی نہیں جانتا واہ بے پاگل ساٹھ برس کا ہوا آدمیت نہ آئی۔''

میاں آزاد نے پوچھا:

''کیوں میاں صاحب! آپ پٹھان ہیں یا شیخ؟''

''جی میں تو ہندوستانی ہوں''

''اس یہ بھی خوب ارے بھئی مسلمان ہو یا کافر صاحب پیدا کہاں ہوئے''

''ہندوستان کے بیچ میں''

''پھر اس سے کیا واسطہ اگر اصطبل کے بیچ میں پیدا ہوتے تو لوگوں کے بیچ میں گھوڑے کہلاتے؟ اس معاملے کے بیچ میں انصاف تو کیجیے''

پھر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا اور حاضرین لوٹنے لگے۔

☆☆☆☆☆☆

افیمچی

میاں آزاد ایک دن منہ اندھیرے بازار میں گھوم رہے تھے۔ بازار بھر میں سناٹا۔ حلوائی بھٹی میں سو رہا ہے مگر تا بنائی برتن دھو رہا ہے کپڑے کی دکانیں بند جوہریوں کی دکان میں تالا لگا ہوا ہے۔ مگر تمباکو والا جاگ رہا ہے۔ خاکروب سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے۔ میاں قصاب دکان پر ڈٹے ہوئے کھٹا کھٹ چھری چلا رہے ہیں۔ کتے دم ہلا رہے ہیں اور بوٹیوں کی خیر منا رہے ہیں۔ اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ ایک شخص لنگی باندھے افیم کی پلیک میں جھوم رہا ہے اور بوکھلایا ہوا چوطرفہ گھوم رہا ہے۔ ہاتھ میں چلم دکان کے صدقے ہو رہا ہے کہ کہیں سے ایک چنگاڑی مل جائے تو دم لگے۔ دھواں دھار حقہ اڑے۔ لاحول ولاقوت بھی ایسا شہر نہیں دیکھا منحوس جہاں آگ مانگے نہ ملے۔ جانو اس میں بھی کوئی چھپن ٹکے صرف ہوتے ہیں یا جیب سے کچھ جاتا ہے۔ غرض محلے والوں کی صلواتیں سناتے اور دل ہی دل میں جھلاتے ہوئے نانبائی کی دکان پر حضرت پہنچے

حضرت: بڑے بھائی اک ذری آگ تو جھپ سے دے دینا۔ میرے یار لاتو جھٹ پٹ

نانبائی: اچھا تو دکان سے الگ رہو۔ چھاتی پر کیوں چڑھے بیٹھے ہو۔ یہاں سو دھندے کرنے ہیں۔ آپ کی طرح کوئی بے فکرا تو ہے نہیں کہ تڑکا ہوا اور چلم لی اور لگے کوڑی دکان مانگے۔ مل گئی تو خیر نہیں تو گالیاں دینی شروع کیں۔ صبح صبح اللہ کا نام نہ رسول پیغمبر سے کام نہ رام رام چلم لیے دکان پر ڈٹ گئے۔ واہ اچھی دل لگی

مقرر کی ہے اب ہم اپنا کام کریں، گاہکوں کو سودا دیں یا آگ دیتے پھریں۔ کسی دن میں چلم ولم نہ توڑ تاڑ کے پھینک دوں۔ تم تڑکے تڑکے دکان پر نہ آیا کرو جی نہیں کسی دن ٹھائیں ٹھائیں ہو جائے گی۔

حضرت کی آنکھوں میں خون ٹپکنے لگا۔ جی چاہا کہ بھٹی ہی میں سر گھسیڑ دیں۔ مگر سوچے کہ ہم افیمی آدمی وہ نانبائی گوشت پراٹھے کھا کھا کر کپے کی طرح پھول گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک پٹخنی بتائے دانت پیس کر رہ گئے۔ وہاں سے چلے تو حلوائی کی دکان پر پہنچے۔

حضرت: میاں اک ذری سی آگ دینا بھائی ہوت!

اس وقت حلوائی کا دودھ بلی پی گئی تھی جھلایا بیٹھا تھا سمجھا کہ کوئی فقیر بھیک مانگنے آیا ہے۔ کڑک کر اور جھڑک کر بولا:

حلوائی: اور کوئی دکان دیکھو جاتا ہے یا دوں دھکا رہیں کہیں ،مریں کہیں، اب کھڑا گھورتا کیا ہے۔ دونوں آنکھیں کہیں پھوڑ نہ ڈالوں میں۔

حضرت: کچھ پاگل ہوا ہے بے ابے ہم کوئی فقیر ہیں لو صاحب ہم تو آگ مانگنے آئے ہیں۔ یہ ہم کو بھک منگا بتاتا ہے۔ اندھا ہے بے کون؟

حلوائی: (دکان سے اتر کر) بھک منگا نہیں تو ہے کون؟ لنگوٹی باندھ لیں اور چلے آگ مانگنے۔ تمہارے باپ کا کرج (قرض) دینا ہے۔

جب انہوں نے دیکھا کہ لپاڈگی پر آمادہ ہو ہی گیا اور لنگوٹ کس کر دھم سے کود پڑا تو سوچے کہ بولے تو پٹ گئے۔ یہ اس وقت جھلایا ہوا ہے ایسا نہ ہو کہ دو چار گدلے کس کر لگا دے تو بھرکس ہی نکل جائے۔ چپکے سے کان دبائے اور چل

کھڑے ہوئے۔ آج تڑ کے تڑ کے کس کا منہ دیکھا تھا کہ جہاں جاتے ہیں جھوڑ ہو جاتی ہے اور آگ پھر بھی نہیں ملتی۔

اتنے میں دیکھا کہ ایک سنار کی دکان پر آگ دہک رہی ہے۔ اوہو ہو بھئی یہ بیچارہ بھلا مانس آدمی ہے آگ دے دے گا اتفاق سے اس وقت سنار دکان پر نہ تھا۔ یہ تو حقے کی فکر میں تھے جھپ سے دکان پر چڑھ گئے۔ ان کا دکان پر چڑھنا تھا کہ سنار بھی اسی وقت آ گیا اور ان کو دیکھ کر آگ بھبھوکا ہو گیا۔

''تو کون ہے بے؟''

''دیکھو بے تے نہ کرنا!''

سنار نے جھلا کر ایک چپت جمائی

'' ابے تو ہے کون؟ اور سنیئے صاحب! خالی دکان پر کیا مزے سے چڑھ گئے (ایک اور دھپ جما کر) اور جو کوئی چیز جاتی رہتی''

میاں اینچی نے دیکھا کہ تو مارے ہی جا رہا ہے۔ اچانک چلم پھینک کر سامنے کھڑے ہوئے

''اب کی تو ہاتھ چلا!''

سنار نے دیکھا کہ منحنی سا آدمی، دبلا پتلا اور اتنا اکڑتا ہے۔ بڑھ کر ایک چانٹا اور رسید کیا۔ اتنے میں تیس چالیس آدمی جمع ہو گئے ''کیا ہے میاں، کیا ہے؟''

''ہے کیا، یہ ہماری دکان پر چوری کرنے آئے تھے۔ ہم نے گردن ناپی''

''تو میں چوری کرنے آیا تھا؟ میں چور ہوں؟۔۔۔۔۔چور کی ایسی ہی صورت ہوتی ہے؟''

لوگ: کون، تم؟ تم تو ہمیں کالے چور معلوم ہوتے ہو اچھا پھر تم ان کی دکان پر گئے کیوں دکاندار نہیں تھا تو وہاں تمہارا کیا کام؟ اور جو سونے چاندی کا گہنا لے بھاگتے تو یہ تمہیں کہاں ڈھونڈتے پھرتے۔

سنار: توبہ کرو صاحب ان کا پھر پتہ کہاں ملتا یہ چانڈو خانے میں جاتے یا جمنا کے اس پار۔۔۔۔۔چلو تھانے

لوگ: میاں اب جانے دو (افیمی سے) جاؤ خبردار اب دکان پر نہ چڑھنا، نہیں تو مار کھاؤ گے۔

افیمی کی جان اس عذاب سے چھوٹی تو سب سے پہلے چلم کی فکر ہوئی۔ ایں! چلم کون لے بھاگا خدا خدا کر کے چلم ملی

سنار نے کہا: ''اچھا آگ لیتے جاؤ''

حضرت نے آگ پائی اور گھر کی راہ لی تڑکے تڑکے اچھی خاطر ہوئی چور بنے، مار کھائی، جھڑکے گئے تب کہیں آگ پائی ایسی طلب کو آگ لگے۔

☆☆☆☆☆

صف شکن غائب ہو گیا

میاں آزاد یہ دل لگی دیکھ کر آگے بڑھے۔ چلتے چلتے نواب کی ڈیوڑھی پر آئے اور آداب بجالائے۔

نواب: آج اتنا دن چڑھ گیا کہاں تھے کیا دربار گئے تھے؟

آزاد: حضور آج بڑی دل لگی دیکھنے میں آئی واللہ ہنستے ہنستے، لوٹ جایئے گا طلب بھی کیا بری چیز ہے۔ اور یہ اپنچی تو اور بھی ستم ڈھاتے ہیں (ساری داستان کہہ سنائی)

نواب: (کھلکھلا کر) واللہ اچھی دل لگی ہوئی۔ آگ کے عوض چپتیں پڑیں۔ ارے میاں ذرا خوجی کو بلایا۔ ہاں ذرا خوجی کے سامنے سنانا کسی دن وہ بھی بہکیں گے۔

اتنے میں خواجہ صاحب تولہ بھر افیم پی کر نشے میں غیں جھومتے جھامتے لڑھکتے پڑھکتے آئے۔

"غلام کو حضور نے یاد کیا ہے؟"

"جی ہاں! اس وقت کس فکر میں تھے؟"

"اے خداوند! افیم گھول رہا تھا اور فکر تو حضور کی بدولت قریب بھی پھٹکنے نہیں پاتی۔ میں فکر کیا جانوں دو وقتہ پلاؤ اڑانا اور افیم کی چسکی لگانا۔ حضور اب تو لٹ گیا۔ نوابی میں غلام پر بھی جوبن تھا۔ چوک میں انگلیاں اٹھتی تھیں۔"

مصاحب: (قہقہہ لگا کر) اچھی بے تکی سنائی

اتنے میں ایک چوبدار ننگےسر پریشان، لپکتا ہوا آیا۔

''خداوند! بڑا غضب ہو گیا''

''کیا؟''

''کیا کہوں''

''کہو ایں خیر ہے بولو تو ؟''

سب کا رنگ فق کہ خدا ہی خیر کرے نواب کا کلیجہ دہل گیا۔

''میاں کچھ منہ سے بولو۔ آخر کیا آفت آئی کچھ معلوم تو ہو''

چوبدار: حضور جان بخشی ہو تو عرض کروں بٹیر سب اڑ گئے

نواب: (ہاتھ ملتے ہوئے) سب!!! ارے سب اڑ گئے؟۔۔۔۔۔۔۔ہائے میرے صف شکن کو جو ڈھونڈ لائے۔ ہزار نقد گنوائے اس وقت میں جیتے جی مر مٹا اف بھئی ابھی، سانڈنی سواروں کو حکم دو کہ بیچ کوسی دورہ کریں۔ جہاں صف شکن ملے۔ سمجھا بجھا کر لے ہی آئیں۔

مصاحب: خداوند سمجھانا کیسا وہ بھی کوئی آدمی ہے کہ سمجھ جائے گا۔ جنور لاکھ پڑھے، پھر جنور ہے۔

نواب: کوئی ہے؟

رفقا: حاضر جی حضور

نواب: ان کے جوتے پڑیں۔ ہم تو اس وقت گھبرائے ہوئے ہیں یہ بات کاٹتا ہے۔ صف شکن کو تم ایسے گدھوں سے زیادہ تمیز ہے۔

رفقا: حق ہے حضور حضور وہ تو عربی سمجھ لیتا ہے

دوسرے بولے: ”خداوند! اس کو قرآن کے کئی پارے یاد ہیں“

تیسرے نے کہا: ”قسم ہے پنج تن پاک کی میں نے اس کو نماز پڑھتے دیکھا ہے۔“

چوتھے: ”ایک دن ہنس رہا تھا“

پانچویں: ”اجی ہم نے ڈنڈ پیلتے دیکھا ہے“

نواب صاحب کو ان کل باتوں کا یقین آ گیا

بٹیر کیا اڑ گئے کہ نواب صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ آنکھوں سے آنسو جاری ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔

دو ہائے میرا صف شکن پیارا صف شکن مجھے تو اس سے پیار ہو گیا تھا۔ یارو سینکڑوں معرکوں میں لڑایا مگر ہمیشہ جیت کر آیا۔ دو دو چونچیں ہوئیں اور بٹیر دم دبا کر بھاگا۔ پھر سامنا ہوا اور منہ پھیر دیا۔ کس بانکپن سے جھپٹ کر لات دیتا تھا کہ پالی تھرا اٹھتی تھی اور قسم ہے صف شکن کی خوبیاں تو مجھ پر آج کھلیں۔ صورت بٹیر کی مگر سیرت فقرا کی۔ اب سنا کہ نماز بھی پڑھتا تھا۔

مصاحب: حضور کو یاد ہو گا کہ رمضان شریف کے مہینے میں اس نے دن کے وقت دانہ تک نہ چھوا۔ حضور سمجھے شاید بیمار ہو گیا مگر میں تاڑ گیا کہ نماز روزے کا پابند ہے۔

خوجی: جل جلالہ، جل جلالہ، کیا شان کبریائی ہے خداوند اب میں حضور سے کہتا ہوں کہ دس پانچ دفعہ میں نے افیم بھی پلا دی، مگر واللہ جو ذرا بھی نشہ ہوا ہو۔ ہاں انکھڑیوں میں لال لال ڈورے تو پڑ گئے تھے۔

میر صاحب: پیرو مرشد یقین جانیے پچھلے پہر سے صبح تک حق حق کی آواز کابک سے آیا کرتی تھی غفور تم کو بھی تو ہم نے کئی بار جگا کر سنایا تھا کہ صف شکن خدا کی یاد میں مصروف ہیں۔

غفور: ہاں میاں حق حق کیا کرتے تھے اور اکثر دیکھا تھا کہ سجدہ کر رہے ہیں

خوجی: جل جلالہ، جل جلالہ، واہ میاں صف شکن علی شاہ

نواب: بھئی ہم نے اسے پہچانا ہی نہیں اف اف، بھئی کوئی پنکھا جھلنا

مصاحبین: (غل مچا کر) پنکھا لاؤ جلدی سامنے کھڑے ہو کر جھلو

نواب: پیتم جو میں جانتی کہ پیت کیے دکھ ہوئے

نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پیت کرے نہ کوئے

خوجی: (نشے سے چونک کر) ہاں ذرا اونچے سروں میں واہ استاد چھیڑے جا

نواب: چپ نامعقول کوئی ہے ان کو یہاں سے ٹہلاؤ یہ رئیسوں کی صحبت کے قابل نہیں۔ مجھ کو بھی کوئی گویا مقرر کیا ہے۔ ہمارا تو جی جلتا ہے اندر ہی اندر سے پھنک رہا ہوں۔ ان کے نزدیک قوالی ہو رہی ہے۔ تم ایسے مفت خوروں کو کسی کے دکھ درد سے کیا واسطہ

خوجی: خداوند! غلام تو اس دم اپنے آپے میں نہیں۔ ہائے صف شکن کی کابک خالی ہو اور میں اپنے ہوش و حواس میں رہوں۔ حضور نے اس وقت مجھ پر سختی کی۔ افسوس ہائے افسوس ارے یارو صف شکن کو کہیں سے ڈھونڈ ھ لاؤ کوئی تو پتا لگاؤ چور گیدی سے خدا سمجھے۔

نواب: شاباش خوجی! شاباش!! اس وقت طبیعت خوش ہو گئی۔ بیشک تم نمک

حلال تمہارے باپ دادا نمک حلال ارے بھئی سانڈنی سوار دوڑائے گئے یا نہیں

مصاحب: شجاعت علی سے کہوابھی سانڈنی تیار ہو۔اور بج کو سی چکر لگائے۔ جہاں صف شکن ملیں ان کو سمجھا بجھا کر لے ہی آئے۔

شجاعت: جاتا تو ہوں مگر وہ تو منطق پڑھے ہیں۔میری کیا سنیں گے کوئی مولوی بھی تو ساتھ بھیجئے ان سے بحث کون کرے گا۔غلام تو اونٹ ہی چلانا جانتا ہے۔ان سے دلیل کون کرے بھلا۔

خوجی: خداوند! قربان جاؤ افیم چانڈو کی بحث ہوتو مجھے بھڑا دیجئے مگر وہاں تو حقانی باتیں ہوں گی اس میں ہمیں واجبی ہی واجبی داخل ہے۔ پھر دخل ور معقولات دے کرالو بنوں مفت میں۔

میاں آزاد: پیر ومرشد! بانک بنوٹ لکڑی کا معاملہ ہوتا ہے تو بندہ بھی تلوار سونت کا جا ڈٹتا۔اور زخم پر زخم لگاتا۔مگر منطق کی بحث کچھ خالہ جی کا گھر تو ہے نہیں کسی مولانا کو بلوایئے۔

مصاحبوں نے ایک مولانا کا نام تجویز کیا چوبدار ان کے مکان پر گیا اور کہا کہ نواب صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے چلیے کسی بڑے عالم سے بحث ہوگی۔

مولانا: السلام علیکم! حضور نے یاد فرمایا ہے؟

نواب: وعلیک السلام آپ کو اس وجہ سے تکلیف دی کہ میرے جگر کا ٹکڑا میری آنکھوں کا نور ناراض ہوکر چلا گیا ہے۔مگر منطقی آدمی ہے علم مناظرہ میں طاق، نماز روزے کا پابند آپ بحث کیجئے اور قائل کرکے لے آیئے۔

مولانا: انشاء اللہ والدین کا بڑا حق ہوتا ہے۔وہ کیسے نادان آدمی ہیں کہ

والدین سے خفا ہو گئے بڑا تعجب ہے۔

خوجی: مولانا صاحب وہ بٹیر ہے مگر بڑا تمیز والا

میر صاحب: کیا صف شکن کا نام مولانا صاحب نے نہ سنا ہوگا۔ وہ تو روم تک مشہور تھے قبلہ! بات یوں ہے کہ سرکار کا بٹیر، صف شکن کل کابک سے اڑ گیا۔ اب تجویز یہ ہوئی ہے کہ ایک سانڈنی سوار ہو جائے اور سمجھا بجھا کر لے آئے۔ مگر شتر بان پھر شتر بان ہے۔ لہذا آپ بلائے گئے کہ سانڈنی پر سوار ہو جیے اور ان کو بلا لائیے۔

مولانا: آپ سب کے سب نشے میں تو نہیں ہیں۔ ہوش کی باتیں کیجیے خود مسخرے بنتے ہو یا مجھے مسخرہ بناتے ہو۔ بٹیر منطقی کیسا لاحول ولاقوت اور سینیے بٹیر اڑ گیا ہے، اس کو سمجھا کر لاؤ وہ بھی کوئی مولوی ہے یا آدمی ہے۔ صف شکن؟ کون سی لڑائی سر کی تھی؟ استغفر اللہ استغفر اللہ اچھے احمقوں کا مجمع ہے۔ بندہ رخصت ہوتا ہے۔

نواب: یہ کس کوڑھ خضر کو لائے تھے خاصا جانگلو ہے۔

آزاد: اچھا حضور بھی کیا یاد کریں گے کہ اتنے بڑے دربار میں ایک بھی منطقی نہ نکلا۔ اب میں جاؤں گا اور اسے لاؤں گا۔ ایک تو سانڈنی دیجیے تیز رفتار اور دو دن کی خوراک دیجیے اور ایک خط اپنے دست مبارک سے لکھ دیجیے۔ تیسرے دن صف شکن خان بہادر سمیت ڈیوڑھی پر موجود نہ ہوں تو مونچھیں منڈوا ڈالیے۔

نواب: اچھا آپ جائیے اور کامیاب ہو کر آئیے۔ میں یہاں بندوبست کرتا ہوں۔ مگر ابھی جائیے، دیر نہ ہونے پائے اتنا خیال رہے۔

یہاں آزاد گھر گئے تو مصاحبوں میں کھچڑی پکنے لگی۔ یارو یہ تو بازی لے گیا۔ اور جو کہیں صف شکن کو لے آیا تو پھر ہم سب پر شیر ہو جائے گا۔ پھر آزاد ہی آزاد چو طرفہ نظر آئیں گے، ہم کو آپ کو کوئی نہ پوچھے گا۔ اس کی فکر ضرور کیجیے۔

خوجی: حضور! جان بخشی ہو تو عرض کروں

نواب: کہیے نا! یہ جان بخشی کا کون سا موقع ہے۔ کوئی عمدہ صلاح بتایئے کوئی معقول تدبیر نکالیے

خوجی: حضور میاں آزاد ابھی دو دن سے اس دربار میں آئے ہیں۔ ان کا اعتبار کیا۔ خدا جانے اچکے ہیں، اٹھائی گیرے ہیں، چور ہیں، جیب کترے ہیں، کوئی کیا جانے اور جو سانڈنی ہی لے کر رفو چکر ہوں تو کوئی کہاں ان کا پتا لگاتے پھرے۔ انصاف سے کہیے گا کہ ایک خانہ برباد، خانہ بدوش آدمی کا ٹھکانا کیا اور وہ کچھ پاگل ہے کہ پھر واپس آئے گا۔

مصاحب: ہاں خداوند! کہتے تو سچ ہیں

میر صاحب: یہ خوجی صورت ہی سے ایسے معلوم ہوتے تھے لیکن بات کہی ٹھکانے کی۔ اسے ہاں ایسے آزاد کا ٹھکانا کیا۔ سانڈنی کے بھی پیسے کھرے کرے اور اپنی راہ لے۔

مسیتا بیگ: ہم تو حضور کو صلاح نہ دیں گے کہ میاں آزاد کو سانڈنی دیجیے

نواب: چلو بس بہت نہ بکو۔ تم اٹھائی گیرے، مفت خورے ہونا! سب کو اپنا ہی ایسا سمجھتے ہو آزاد کی چتون کہے دیتی ہے کہ وہ وزارت کے قابل ہے۔ تم میں سے کوئی اس کی جوتی کی پھٹ پھٹ کو بھی نہیں پہنچتا۔ اور فرض کرو کہ سانڈنی جاتی ہی

رہے تو کیا میں کوئی اتنا ہی گیا گزرا ہوں کہ سانڈنی کے کھونے سے مجھے بھیک مانگنے کی نوبت آئے گی۔اور ہزار بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ صف شکن پر سے لاکھوں صدقے ہیں سانڈنی کیا چیز ہے۔

☆☆☆☆☆

خوجی کو انعام ملا

اب نواب کے یہاں کا حال سنیے کہ وہاں کیا ہوتا تھا۔ جب کئی دن گزر گئے تو خوشامدیوں نے کہنا شروع کیا: پیرومرشد دیکھا ہم نہ کہتے تھے کہ میاں آزاد کا کیا ٹھکانا۔ حضور نے نہ مانا، اب سانڈنی کی سانڈنی گئی اور رنج کا رنج ہوا۔

خوجی: اور بیوقوف کے بیوقوف بنے

میر صاحب: اور انعام اور سفرخرچ جو دیا وہ گیا۔ اس کی گنتی ہی نہیں۔

غفور: ہجور (حضور) اب وہ پھرتے نہیں، دو تین سو کی سانڈنی پر پانی پھر گیا۔

خوجی: ہونہہ: یہ دو تین سو لیے پھرتے ہیں اے میاں وہ سانڈنی بلا کی دھاوا کرنے والی تھی۔ ریل کی دم سے باندھ دو۔ دیکھو برابر چھم چھم کرتی چلی جاتی ہے یا نہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں ویسی ایک بھی نظر نہیں آتی کیا دم خم ہے بھئی ایک دو دفعہ سوار ہوا۔ واللہ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے میں ہوا پر جا رہا ہوں وہ ٹھمک ٹھمک چال کی اوہو ہو سواری، اونٹ، بگھی، گھوڑا، پالکی، ہاتھی سب اس کے مقابل میں گرد ہیں۔ اور بھئی سچ پوچھو تو میاں صف شکن سے اس کے کھونے کا زیادہ رنج ہوا۔

میر صاحب: واہ خواجہ صاحب! آپ بھی واللہ کیا بے تکی باتیں کرتے ہیں۔ کجا بے زبان جانور کجا ہمارے صف شکن ایسی ہزار سانڈنیاں اس کی ایک لات پر نثار کہنے لگے سانڈنی کے کھونے کا زیادہ افسوس ہوا۔

نواب: اتنے بڑے لونبڑ ہو گئے مگر بیوقوف ہی رہے۔ جو بات کریں گے بے ٹھکانے۔ سانڈنی ٹکے کا جانور گئی سو گئی، اب اس کا رونا کیا ہائے رنج تو یہ ہے کہ

میاں صف شکن اب ہاتھ نہ آئیں گے میرا دل ہی جانتا ہے کہ کلیجے پر کیسی چوٹ لگی ہے۔ بئی اس سے تو مجھے موت ہی آ جاتی تو سمجھتا کہ بڑا خوش نصیب ہوں افسوس!۔۔۔۔۔

میر صاحب: حضور صبر کیجئے صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ آتش کہہ گئے ہیں بڑے نواب صاحب مر گئے تو حضور نے کیا کرلیا۔ چچا حضور کو چھوڑ کر چلے گئے حضور نے کیا کرلیا۔ دادا جان منہ موڑ کر جدائی کا داغ دے گئے تو حضور نے کیا کرلیا۔ اب صبر کیجئے، صبر کیجئے

نواب: میاں بات یہ ہے کہ باپ دادا تو سب ہی کے مرا کرتے ہیں مگر صف شکن جیسے وفادار جانور کا ایک دم بھی جدا ہونا بڑا کھلتا ہے۔

خوجی: میر صاحب! یہ کیا بک دیا کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، آتش کہہ گئے ہیں۔ واہ ری معلومات اے حضرت! یہ سعدی کا قول ہے

نواب: کیا خرافات بک رہا ہے۔ یہ شعروشاعری کی تحقیقات کا بھلا کون سا موقع ہے۔ وہ سعدی نہیں رودکی کہہ گئے ہی، پھر اس سے واسطہ؟ معلوم ہے کہ آپ بڑے شاعر کی دم ہیں عجب نامعقول آدمی ہے بھئی

مصاحب: اور خداوند! یہ ان میں سخت عیب ہے کہ کسی نے بات کی اور انہوں نے جھٹ کاٹ دی۔ یوں نہیں دوں ہے، دوں نہیں یوں ہے۔ آم نہیں املی ہے۔ ان سے پوچھیے کہ ہم تو اپنے آقا کیلئے تسلی کی باتیں کر رہے ہیں کہ صبر کیجئے، یہ سر پر چڑھے بیٹھتے ہیں کہ آتش کا نہیں سعدی کا قول ہے۔ تا کہ لوگ سمجھیں کہ آپ بھی بڑے شاعر ہیں اور ہمارا تک درست نہیں۔ بھلا صف شکن تو اس کاغذ پر لکھ دیجیے۔

کھوجی: چلیے صاحب! ہم گھامڑ، گاؤدی سہی آپ تو اپنے وقت کے افلاطون ہیں نا! بس چھٹی ہوئی۔

نواب: چھٹی وٹی کے بھروسے نہ رہیے گا۔ چھٹی نہیں ہوتی ایک بھلے مانس کو آپ نے دس آدمیوں کے سامنے ذلیل کیا۔ آپ کو ہم ذلیل کریں گے۔ غفور! قلم، دولت، کاغذ خوجی کو دو۔ لکھیے قبلہ! صف شکن کا لفظ لکھیے

مصاحب: نہیں حضور! یہ فقرہ لکھوایئے کہ اس وقت ہوش وحواس درست نہیں

(خوجی نے یوں لکھا: اس وقت ہوش وحواس درست نہیں)

مصاحب: (ہنس کر) واہ کیا لیاقت ہے

نواب: اے لعنت خدا کی اور بڑھ بڑھ کے باتیں بناؤ گے پھر کسی کو ٹوکو گے بچہ جی! اے میاں ہوش وحواس نہیں لکھ سکتے۔ اے پھٹکار، شرمائے تو نہ ہو گے۔

میر صاحب: وہ شرما چکے۔ شرم تو انہوں نے بھون کھائی ہے تب تو شرمائے نہیں جب بڑی بڑی محفلوں سے نکالے گئے۔

خوجی: حضور کے مزاج میں انصاف تو ضرور ہے۔ لیکن اس وقت حضور نے میری گردن پر کند چھری پھیری ہائے ہائے اتنا تو سمجھے کہ اگر ہوش وحواس درست ہوتے تو ایسے آسان الفاظ کے املا میں بھلا کیوں غلطی کرتا۔ ہائے صف شکن کا پتا نہ ملے تو ہوش کیسے قائم رہیں

نواب: واہ خوجی واہ اس وقت طبیعت تمہاری نمک حلالی دیکھ کر خوش ہو گئی شاباش کوئی ہے؟

پیرو: پیرو مرشد! کیا حکم ہے؟

نواب: داروغہ سے کہو کہ ہمارے رفیق خواجہ صاحب کو وہ عباسی رومال اڑھا دیں جو پرسوں خرید اتھا۔اوخوجی! یہ ہم نے انعام دیا۔

داروغہ نے طشت میں وہ رومال لاکر خوجی کو اڑھا دیا۔خوجی نے اٹھ کر سات دفعہ سلام کیا اور کہا:

''واہ حضور! اب خدا گواہ ہے کہ تہ دل سے دعا نکلتی ہے کہ میاں آزاد صف شکن سمیت کھٹ سے آجائیں اور حضور واللہ دل گواہی دیتا ہے کہ آیا ہی چاہتے ہیں۔''

نواب: تمہارے منہ میں گھی شکر!

مسیتا بیگ: حضور مٹھائی کا اقرار کرلیں

خوجی: اور سنیئے اب مٹھائی کیسی وہ جلسے اڑیں، وہ جشن ہوں کہ واہ جی واہ مہینوں طبلے پر تھاپ پڑے دور دور سے طائفے آئیں۔صف شکن کا آنا کوئی ایسی ویسی بات ہے۔گیدی کہیں کا۔

نواب: انشاءاللہ پھر میں اپنے دل کا ارمان نکالوں۔وہ دھاچوکڑی چلے کہ واہ بھئی واہ

سیتا بیگ: (میر صاحب کے کان میں چپکے سے) واللہ آزاد بھی بلا کا جوان ہے۔وہ جھانسا دیا کہ نواب بھی ساری عمر نہ بھولیں گے۔

سانڈنی تو بھئی اس نے بیچ لی۔اونے پونے دام سیدھے کیے۔صف شکن کی دم میں نمدا

میر صاحب: (آہستہ سے) کیوں جی یہ ہمارے رئیس بھی کتنے بھولے ہیں۔ بٹیر سے صف شکن ہوئے اور صف شکن سے صف شکن علی شاہ بنے (اہاہاہا) لاحول

واقعہ

مسیتا بیگ: اجی خدا کرے ایسا ہی بنا رہے۔ مگر یار خوجی کا عباسی رومال آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ یہ بگڑی بات کو ایسا بنالیتا ہے کہ کچھ پوچھیے نہیں

میر صاحب: ہاں! مگر آزاد ان کے بھی چچا نکلے۔ ان کے کان انہوں ہی نے کاٹے اور بھئی آدمی بھی آفت کا پرکالہ ہے پڑھا لکھا، عالم فاضل، شاعر پھر کشتی پٹے میں طاق

نواب: اب ہم اندر جاتے ہیں رخصت

ایک دن نواب صاحب بیگم صاحبہ سے باتیں کر رہے تھے

بیگم: اے ہاں آزاد کس کھوہ میں دھنس گیا میرا تو خیال ہے کوئی دو مہینے سے کم نہ ہوئے ہوں گے۔ ار پھند کر گیا تھا۔ میں کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔

سدا بہار: اے وہ چمپت ہوا مورا چور

بیگم: بس انہی باتوں پر تو میں جھلا اٹھتی ہوں

نواب: مرتی کیوں ہو چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میرا آزاد میاں صف شکن علی شاہ کو لا کر ہی چھوڑے گا۔ ہم جانتے ہیں علمی بحث ہو رہی ہے۔

بیگم: (قہقہہ لگا کر) علمی بحث ہو رہی ہو گی؟ کیوں صاحب میاں صف شکن علی شاہ علم بھی جانتے ہیں (پھر قہقہہ) میں کہتی ہوں آخر اللہ نے تم کو کچھ رتی ماشہ علم بھی دیا ہے۔ موا بٹیر ذری سا آپ اس کو بوڑھے حافظ سے بھی زیادہ علم والا سمجھتے ہیں (پھر قہقہہ) میرے میکے کے پڑوس میں ایک سڑی سودائی دن رات واہی تباہی بکا کرتا ہے۔ اس کی اور تمہاری باتیں ایک ہی ہیں۔

سدا بہار: نا بیوی (دانت کے تلے انگلی دبا کر) اوئی کوئی ایسا کہتا ہے؟ اس سو دائی نگوڑے کو ان پر صدقے کردوں واہ وا

اتنے میں غفور خدمت گار نے پکارا: ''فرخندہ اے بوا فرخندہ سرکار سے کہہ دو حقہ بھر ارکھا ہے۔ یہاں بھیج دوں یا باغیچے میں رکھوں حضور باہر نہ آئیں گے کیا؟''

نواب: وہ چاندی والی چھوٹی گڑگڑی بیگم صاحب کے واسطے بھرلاؤ ہم ابھی آئے۔

یہ کہہ کر نواب صاحب مسکراتے ہوئے باہر تشریف لے گئے۔ مصاحب رفقا جاتے ہی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔

''آداب بجالاتا ہوں حضور''

''کورنش ہے پیرومرشد''

''تسلیمات عرض ہے خداوند''

''مجرا عرض ہے حضور والا''

خوجی: اف اس وقت ملک الموت سے سامنا ہوا۔ ایسا دھچکا لگا کہ کلیجا بیٹھا جاتا ہے اور بے اختیار رونا آتا ہے۔ ہات تیرے گیدی چورکی

نواب: کیوں کیا بات ہے؟

خوجی: پیرومرشد اس وقت بٹیر خانے کی طرف گیا تھا۔ وہاں ۔۔۔۔۔

نواب: اف ۔۔۔۔۔

(دھم سے گر پڑے نواب صاحب)

مصاحبین: یا علیؑ!

نواب: بھئی دل بے قرار ہے۔ طبیعت بےلطف ہو گئی۔ خوجی میاں تم کو تو ہمیں تسلی دینی چاہیے نہ کہ الٹے خود ہی روتے کہ ہمارے ہاتھ پاؤں اور بھی پھول جائیں۔ اب شاہ جی سے ہاتھ دھونا چاہیے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کی وفات ہو چکی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

رفقا: انا للہ وانا الیہ راجعون

خوجی: (افیم کے نشے سے چونک کر) اسی بات پر کچھ مٹھائی میں کھلواتے منگواؤ تو کولی کی دکان سے مٹھائی

نواب: کوئی ہے اس کی گردن تو ناپنا ہم تو اپنی قسمتوں کو رو رہے ہیں یہ مٹھائی مانگتا ہے۔ بے تکا، نمک حرام

خوجی: دیکھیے دیکھیے پھر میری گردن پر کند چھری نہ پھیریے میں مٹھائی کھانے کے لیے تھوڑا ہی منگواتا ہوں۔ میں تو اس لیے منگواتا ہوں کہ فاتحہ پڑھوں

نواب: شاباش! جی خوش ہو گیا۔ خوجی مجھے معاف کرنا۔ بے اختیار نمک حرام کا لفظ نکل گیا تم بڑے ------

مصاحب: حلال خور، حلال خور ہو

اس پر وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ نواب صاحب لوٹنے لگے اور بیگم صاحب نے گھر سے لونڈی کو بھیجا کہ دیکھنا تو یہ کیا ہنسی ہو رہی ہے۔

نواب: بھئی کیا آدمی ہو واللہ روتے کو ہنسانا اسی کا نام ہے خوجی بچارے کو حلال خور بنا دیا۔

خوجی: حضور اب میں یہاں نہ رہوں گا کیا بے وقت کی شہنائی ہے افسوس

صف شکن علی کا کسی کو خیال نہیں۔

اتنے میں نواب صاحب پلنگ پر لیٹ گئے اور رفقا میں سے کوئی پانڈوی نے
پہنچا۔ کوئی افیم گھولنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆



آزاد کی واپسی

جگہ جگہ کی خاک چھاننے کے بعد ایک روز آزاد پھر چلے۔ چلتے چلتے خدا خدا کر کے نواب کے شہر کے قریب پہنچے۔ جب کوئی دو، ڈھائی کوس شہر رہ گیا تو ایک کنویں پر پانی پیا کہ اتنے میں ایک نجومی جو آزاد کو پہچانتا تھا آ نکلا

نجومی: تمہاری نواب صاحب کے یہاں بڑی تلاش تھی جی تم گائب، (غائب) کہاں ہو گئے تھے اونٹ لے کے اب میں جا کے کہوں گا کہ میں نے اپنی کتاب میں دیکھا ہے کہ آجاد (آزاد) پانچ کوس کے اندر ہی اندر ہیں۔ جو ملے گا آدھا بانٹ لیں گے مگر بھانڈا نہ پھوڑنا جو تم راضی ہو جاؤ تو چاندی ہے۔

آزاد: واللہ کیا سوجھی ہے منظور ہے بس اب تم جاؤ اور کہو جا کر نجومی نے کتاب بغل میں داب کر راہ لی اور نواب کے یہاں جا پہنچے

خوجی: اجی جاؤ بھی تمہاری ایک بات بھی ٹھیک نہ نکلی۔ اب کہو کچھ حساب لگاتے ہو

نواب: برسوں ہمارا نمک تم نے کھایا ہے برسوں ایک دو دن نہیں برسوں برسوں اب اس وقت کوئی حساب بھی لگاؤ گے یا باتیں ہی بناؤ گے

نجومی: وہ حساب لگاتا ہوں کہ فوراً پتا چل جائے آجاد (آزاد) کا

خوجی: اجی جاؤ بھی دیکھ لیا۔ بس زبانی باتیں مرد آدمی سال بھر میں ایک دفعہ تو

سچ بولا کرو۔

مصاحب: واہ سچ بولتے تو قصائی کے کتے کی طرح پھول نہ جائے؟

نواب: یہ کیا واہیات گفتگو ہے

نجومی: ناہیں ہم سے ان سے ہنسی ہوتی ہے یہ ہمیں کہتے ہیں، ہم انہیں اب آپ کسی پھول کا نام اپنے دل میں سوچیں

نواب: یہ ڈھکوسلے ہمیں اچھے نہیں معلوم ہوتے ہمیں صاف صاف بتادو کہ میاں آزاد کب تک آویں گے۔

نجومی: (کچھ بڑبڑا کر) پانی کے پاس ہیں۔ یہاں سے کوئی تین کوس کے اندر ہی اندر ہیں، جو نہ ہوتوں ناک کٹا ڈالوں

خوجی: آؤ آوے ناک ناک کی شرط رہی۔ وہ سانڈنی بیچ کر گلچھرے اڑا رہے ہوں گے آپ تین کوس لیے پھرتے ہیں۔

رفقا: حضور یہ نجومی بڑا جھوٹا ہے آپ تو پوچھتے ہیں کہ میاں آزاد کب آئیں گے وہ کہتا ہے کہ تین کوس کے اندر ہی اندر ہیں۔

نجومی: تو بتاتے بتاتے بتائیں گے یا ایک دم سے بتادیں۔ سوچیں بچاریں بھی تو لے ناک ناک کی شرط کون لگاتا ہے کاٹ ہی لوں گا گوندنی والے باغ میں آجاد بیٹھے ہوں گے۔ جاؤ دیکھ لو کتاب جلا دوں ناک کٹا ڈالوں جو جھوٹ نکلے۔

نواب: چابک سوار کو بلاؤ ابھی حکم دو کہ تیز رفتار گھوڑی پر جائے اور دیکھے میاں آزاد ہیں یا نہیں۔ ہوں تو اس نجومی کا آج گھر بھر دوں۔ میں آج سے اس کا معتقد ہی ہو جاؤں۔

چابک سوار نے منڈا سا باندھا۔ اور تیز رفتار گھوڑی پر کاٹھی کس یہ جا وہ جا پچاس ہی قدم گئے ہوں گے کہ گھوڑی بھڑکی اور چابک سوار دھم سے منہ کے بل سڑک پر

خوجی: حضور گھوڑی نے نادر علی خاں کو دے ٹپکا اور کیا جانے کس طرح نکل گئی۔

نواب: چلو خیر سمجھا جائے گا۔ تم دوسرا گھوڑا کسکواؤ اور دوڑ جاؤ

خوجی: پیر و مرشد! میں بوڑھا ہو گیا اور رہی سہی سکت افیم نے لے لی گھوڑا کہیں پھینک پھانک دے، ہاتھ پاؤں ٹوٹیں تو دین و دنیا دونوں سے جاؤں۔ آزاد خود بھی گئے اور ہم سب کو بھی بلا میں مبتلا کر گئے۔ حضور مجھے معاف فرمائیے گھوڑا تو دولتیں جھاڑتا ہے خدائی بھر کے عیب تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ میرا تو بھرکس ہی نکل جائے گا۔

ادھر چابک سوار نے گھوڑی سے پٹخنی کھائی۔ ادھر ایک لڑکے نے تالی بجائی مگر واہ رے شہسوار کچومر نکل گیا لیکن وہی خم و دم گرد بعد میں جھاڑی پہلے نواب صاحب کے اصطبل میں گئے اور ایک دوسرے گھوڑے پر کاٹھی کس، سوار ہوتے ہی ہوا ہو گئے۔ ہوا سے باتیں کرتے جا رہے ہیں۔ گوندنی والے باغ میں جا کر دیکھا۔ تو سانڈنی پر کارچوبی جھول جھلک رہی ہے اور اونٹنی گردن جھکائے چو طرفہ مٹک رہی ہے۔ پکارا:

''میاں آزاد، میاں آزاد، ہوت اخاہ آپ ہیں۔ آئیے ذرا بغل گیر تو ہو جیے کہیے مزاج کیسے ہیں؟''

"اجی ہمارے مزاج کی نہ پوچھیے گھڑی میں ماشہ گھڑی میں تولہ آپ کہیے"

"نواب صاحب کے یہاں تو خیریت ہے مگر آپ کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ چلو پھر اب نواب نے یاد کیا ہے۔"

"نہیں ہمارے آنے کی کہاں سے خبر ہو گئی بھئی؟"

"اجی یہ ساری داستان راہ میں سنا دیں گے"

"اچھا تو پہلے آپ ہمارا خط نواب کے پاس لے جائیں"

"لائیے۔ ایک نہیں دس خط لے جاتا ہوں"

میاں آزاد نے تڑ سے خط کھینچ ڈالا

حضور کے نمک کی قسم زمین کی تہہ اور عرش و کرسی تک ہو آیا تب کہیں جا کے کھوج پایا۔ شاہ جی ہر روز داڑھیں مار مار کر روتے ہیں اور حق حق کرتے ہیں۔

سنیے حضور! بندے نے وہ کام کیا ہے کہ انعام و اکرام دیجیے زر و جواہر دیجیے یا قوت و جواہر میرے اوپر سے صدقہ دیجیے اللہ اللہ کتنا بڑا کام کیا ہے کہ صف شکن علی شاہ غازی کو سمجھا بجھا منوا کے لے آیا۔ بڑی بڑی دلیلیں چھانٹتے تھے۔ دو ہفتے تک مجھ سے بحث ہوتی رہی۔ آخر میں نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ آپ چلیے ورنہ میں زہر کھا کر مر جاؤں گا مجھے سمجھایا کہ یہ زندگی خدا کی نعمت ہے اس کو گنوانا بیوقوفی ہے۔ مگر خیر تمہاری خاطر چلتا ہوں لیکن وہ خوجی جو نواب صاحب کے پاس ہے اس سے مجھے سخت نفرت ہے میں ایک شرط سے چلتا ہوں کہ جس وقت میں وہاں پہنچوں تو نواب صاحب کے سامنے خوجی کو بیس کوڑے پڑیں۔ میں نے عرض کیا بیس نہیں بائیس تب کہیں آئے

اب آپ لوگوں کو ٹھاٹھ سے بھیجیے تو دھوم دھام سے میاں آزاد کو ساتھ لائیں۔
لیجیے اب جلوس جلد بھیجیے ہتو شاہ جی صاحب تشریف لائیں۔

یہ خط لے کر چابک سوار روانہ ہو گیا اور نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

چابک سوار: سلام عرض ہے

نواب: کہو جلدی سے بولو یہاں پیٹ میں چوہے چھوٹے موٹے ہیں

چابک سوار: حضور غلام نے راہ میں دم لیا ہو تو جرمانہ دوں بس گھوڑے کی پیٹھ پر گیا اور آیا۔

خوجی: کتنے بے تکے ہو میاں! سوال کچھ جواب کچھ بھلا اپنی کارگزاری بتانے کا یہ کون سا موقع ہے جی آزاد کا پتا بتاؤ

چابک سوار: حضور گوندنی والی بگیر کے پاس بیٹھے ہیں اور حضور کو یہ عرضی دی ہے۔

نواب: لاؤ، لاؤ، لاؤ بھئی لاؤ کہیں لاؤ تو کوئی ہے

منشی صاحب کو آواز دینا

منشی: تسلیمات عرض کرتا ہوں، پیر و مرشد

منشی صاحب نے خط پڑھنا شروع کیا تو حاضرین کا رنگ فق ہو گیا۔

خوجی: خداوند جان بخشی ہو تو غلام کچھ عرض کرے

نواب: جان بخشی کیسی؟ آج تو وہ خوشی ہے کہ بادشاہ قیدیوں کو چھوڑ دیتے ہیں ایسی خوشی کے موقع پر جان بخشی بھی کیسی بے تکی بات ہے کہو نا!

خوجی: پیرومرشداورتومیاں آزاد نے جو کچھ لکھا ہے اس میں رتی بھرفرق نہیں مگر غلام کا جوحال لکھا ہے وہ سب ڈھکوسلا ہے۔ جو ذری بھی اصلیت ہوتو ہاتھ کٹا ڈالوں۔

نجومی: بس بیٹھے رہیے تم پہلے بھی ناک کٹاتے تھے۔اب کاٹ لوں جڑ سے ناک بجور غلام کا حساب کیسا ٹھیک نکلا۔

نواب: ہاتھی، گھوڑا، جاگیر انعام اکرام جوکہو گے دیں گے مگر ذرا میاں آزاد کو آنے تو دو اور یوں بھئی ایک نجومی نے تو بیان کیا تھا کہ صف شکن علی شاہ مر گئے ہیں اور اب یہ میاں آزاد کو کہاں سے مل گئے کیوں میر صاحب! واللہ عالم یہ کیا اسرار ہے۔

میر صاحب: خداوند! اس بات کی تہ تک پہنچنا محال ہے

رفیق: قربان جاؤں حضور ہمیں تو کچھ دال میں کالا کالا معلوم ہوتا ہے یہ ہمارے فرشتوں نے بھی نہیں سنا کہ مردہ بٹیر از سر نو زندہ ہو جائے، کیا لوٹ پوٹ کے پر پرزے جھاڑ کر اٹھ بیٹھے ہیں تو بہ کیجئے جو سچ ہوتو داڑھی منڈوا ڈالوں

اتنے میں اندر چھوٹی بیگم کو خبر ہوئی مبارک قدم نے کچا چٹھا کہہ سنایا

بیگم: ہمارے میاں کا ایسا ست اعتقاد کوئی خدائی بھر میں تو ہووے گا نہیں میری باتیں تو انہیں بری لگتی ہیں میں روز روز کہاں تک بکوں مجھے تو ڈر ہے کہ کوئی مجھ پر کچھ طوفان نہ باندھ دے ان کے پاس جو آتا ہے، جھوٹوں کا سردار

مبارک قدم: جھوٹے خوشامدیوں کی ہر وقت فوج کی فوج جمع رہتی ہے۔ آپ تو جان بوجھ کے انجام بنی جاتی ہیں۔

صف شکن کا جلوس

ادھر سنیے! نواب نے سب کو بلا کر حکم دیا کہ اصطبل کے سب ترکی، عربی گھوڑے اور فیل خانے کے ہاتھی فٹن اور بگھیاں اور جھنڈی بردار سپاہی جتنے ہماری سرکار میں ہیں سب سے کہو تیار ہو جائیں اور شہر بھر کے امیروں سے جلوس طلب کرو اور سجا کر لے جاؤ اور صف شکن علی شاہ کو ساتھ لے آؤ، مگر انتظام ایسا ہو کہ لوگ دور دور تک تعریف کریں انگریزی باجا ضرور ہو۔

خوجی: پیرو مرشد! جو دھوم دھام چاہتے ہوں تو غلام کو افسر مقرر کیجئے اور میر صاحب کو میرا نائب بنا دیجئے۔ پھر مزہ دیکھیے انتظام کا:

میر صاحب: جی بجا ہے ہم بادشاہوں کی مصاحبتوں میں رہے اور اب آپ کے نائب ہوں۔

نواب: اچھا تم دونوں مل جل کر انتظام کر لو

پھر کیا تھا اتنا اشارہ پانا تھا کہ لگے ہاتھوں سب بندوبست ہو گیا کیل کانٹے سے درست چھوٹی بیگم کوٹھے پر کھڑے کھڑے جلوس دیکھ رہی ہیں اور دل ہی دل میں ہنس رہی ہیں کہ نواب کا دماغ خراب ہوا ہے۔ اس وقت کوئی خوجی کو دیکھتا ہے دماغ ہی نہیں ملتے تھے۔ اس کو ڈانٹ اس کو ڈپٹ کسی پر دھول جمائی کسی کو چانٹا رسید کیا اس کو پکڑ لاؤ اس کو گرفتار کرو۔

غرض بڑی جدوجہد کے بعد جلوس اس ترتیب سے چلا۔ سب سے آگے نشان کا ہاتھی، ہری بھری جھول پڑی ہوئی مستک پر سیندور سے گل بوٹے بنے ہوئے

ہاتھی جھوم جھام کر جا رہا ہے۔ اس کے بعد ہندوستانی باجا ترڑ ترڑ ترڑ، دھم دھم دھم دھم اس کے بعد آرائش، پھولوں کے تخت اس کے بعد انگریزی باجا تال سر سے درست اس کے بعد گھوڑے چھم چھم کرتے ہوئے جا رہے ہیں۔ گھوڑے دلہن بنے ہوئے۔ مہندی کا رنگ رچائے ہوئے۔ کمر نازک، ذرا سی تھوتھنی چوڑی پیشانی اس کے بعد فنس، پالکی، اس کے بعد پھر باجا، اس کے بعد ہاتھیوں کی قطار جھومتے جھامتے سونڈ سے کھیلتے جاتے ہیں۔ روشنی کا انتظام بھی مکمل تھا۔ پنشاخے اور لالٹینیں جھک جھک کر رہی تھیں۔ سوئی گرے تو اٹھا لیجئے رائی کا دانہ صاف نظر آئے۔ اس ٹھاٹھ سے بارات چلی، ارے توبہ، بارات کیسی جلوس چلا کہ میاں صف شکن علی شاہ کو لائیں راہ میں جو دیکھتا ہے چکر میں آتا ہے کہ واوا اچھی برات ہے دولہا کا پتا ہی نہیں تمام شہر اور شہر کے گلی کوچوں سے ہوتا، جلوس عین گوندنی والی بگیہ میں پہنچا۔

اب سنیے کہ میاں آزاد اپنی سانڈنی پر سوار صف شکن علی شاہ کو کابک میں بٹھائے سڑک پر ڈٹے ہوئے تھے۔ مگر صف شکن علی شاہ کہاں سے آ گئے؟ اجی کسی ایڑ بٹیر کو ادھر ادھر سے خرید لیا ہوگا۔ آزاد صاحب وہی صف شکن

آپ کو یاد ہوگا کہ میاں آزاد نے اور سب بٹیروں کو تو اڑا دیا تھا مگر صف شکن علی شاہ کو چھپا رکھا تھا اب اس کو نکالا۔۔۔۔۔۔

خیر خوجی آتے ہی ان سے بغل گیر ہوئے اور میر صاحب گلے ملے اور غفور خدمت گار نے سلام کیا۔

خوجی: مثل مشہور ہے کہ سو برس کے بعد گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں۔ سو

ہمارے آج دن پھرے کہ آپ آئے اور شاہ جی کو لائے۔نواب کے یہاں سناٹا پڑا ہوا تھا۔وہ چہل پہل ہی نہیں، وہ دل لگی ہی نہیں، صف شکن کے سوگ میں سب پر مردنی چھائی تھی۔نواب چونک چونک پڑتے تھے۔کھٹ ہوا اور پوچھا آزاد آئے مگر آپ نہ آئے نہ آئے۔حاسدوں نے تو جڑ دی کہ حضور وہ سانڈنی لے کر لمبے ہوئے۔کیسے آزاد اور کہاں کے صف شکن۔وہ پہنچے یہاں سے سو منزل پر مگر یار ہم تمہاری ہی طرفداری کرتے تھے۔

میر صاحب: جی ہاں اور ہم بھی آپ ہی کی طرف سے لڑتے تھے۔ہم اور خواجہ صاحب دونوں

آزاد: بھائی کچھ پوچھو نہیں واللہ آسمان میں تھگلی لگائی تب کہیں جا کر ان کی زیارت نصیب ہوئی۔خدا جانے کن کن جنگلوں میں جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں کیا کیا مصیبتیں جھیلیں۔

خوجی: جی اس میں کیا شک ہے حضرت! یہاں لوگوں نے وہ گپیں، اڑائی تھیں کہ توبہ ہی بھلی۔کسی نے کہا بھانڈوں کے یہاں نوکری کر لی۔کوئی طوفان باندھتا تھا کہ بھٹیاری کے گھر پڑ گئے۔مگر سب بہتان لوگ تہمتیں تراشتے تھے مگر اب سب نے منہ کی کھائی بات تیرے گیدی کی۔

خلاصہ یہ کہ خوجی اور میر صاحب اور رفقاء اور مصاحبین سب کے سب مل کر میاں آزاد کو یار بناتے تھے مگر ہمارے آزاد ایک ہی آزاد ان سب کی قبر تک سے واقف خوب سمجھتے تھے کہ اب نواب کے یہاں جو ہمارا طوطی بولے گا۔اس سے یہ سب ہمارے یار بن رہے ہیں۔تھوڑی دیر تک خوب گھل گھل کر باتیں ہوئیں تو

میاں آزاد نے کہا:

''حضرت اب رات جاتی ہے یا آتی ہے چلیے نہ بس
اب انتظار کس کا ہے اچھا بسم اللہ کیجئے، پٹاخے
چڑھاؤ، لالٹینیں جلاؤ، گھوڑے چلاؤ، باجا بجاؤ''

جب جلوس آراستہ ہوا تو میاں آزاد ایک ہاتھی پر جا ڈٹے۔۔۔۔۔اور صف شکن علی شاہ کی کا بک کو آگے رکھ لیا۔شہر میں تو پہلے ہی ہلڑ تھا کہ نواب والا بٹیر بڑے ٹھسے سے آرہا ہے۔لاکھوں آدمی چوک میں تماشا دیکھنے کو ڈٹے ہوئے تھے۔چھتیں پھٹی پڑتی تھیں۔وہ بھیڑ بھڑ کا کہ شانے سے شانہ چھلتا تھا باجے کی آواز پڑی تو تماشائی تیار ہوئے۔جیسے ہی عین چوک میں میاں آزاد کا ہاتھی پہنچا۔ ویسے ہی فیل بان نے جو دیکھا کہ سرکاری آدمی لال لال پگڑیاں باندھے، کالی کالی وردی ڈانٹے، خاکی پتلون پہنے، ہاتھی روکے کھڑے ہیں، تو اس کے ہوش اڑ گئے اور ہاتھی کو جدھر انہوں نے کہا ادھر ہی پھیر دیا۔میاں آزاد، خوجی، میر صاحب، صف شکن علی شاہ فیل بان مع ہاتھی کی دم ان کے ساتھ چلے۔جلوس تتر بتر کوئی تخت کے لیے بھاگا جاتا ہے کوئی جھنڈی لیے دبکا پھرتا ہے۔جلوس کا پتا نہیں برات ورات سب غائب خوجی ابھی افیم کے نشے میں تھے اور میر صاحب چانڈو کے نشے میں۔

سپاہی ان سب کو لے کر ایک جنگل میں سے گزر رہے تھے اتنے میں ہاتھی جو گرجا تو جنگل میں ہوک پڑ گئی اور خوجی، اور میر صاحب یکدم نشے سے چونک پڑے۔

خوجی: اب یہ کیا اندھیرا مچایا ہے (آنکھیں ابھی آدھی کھلی ہیں) اور سنیئے گا ذرا سی یوں ہی آنکھ جھپک گئی تو کی کرائی محنت ساری خاک میں ملادی اب میں اتر کر کوڑے پھٹکاروں گا تب مانیں گے۔ باتوں کے آدمی کہیں لاتوں سے مانتے ہیں (کہتے کچھ میں منہ سے کچھ نکلتا ہے)

میر صاحب: ہائیں! ہائیں اور فیل بان یہ کہاں گلی میں آیا یہ کیا آتش بازی سے بھڑکتا ہے ہاتھی؟ بڑھا لے چلو (آنکھیں کھولی کر) ارے میاں خوجی! یہ کس چٹیل میدان میں آنکلے ذری نیند سے جاگو بھاگو بھاگو آخر ماجرا کیا ہے بھئی ذرامیاں دیکھو تو سہی۔ الٰہی خیر۔۔۔۔۔۔ یا اللہ بچائیو!

خوجی: (چونک کر) ارے باجے والوں کو کیا سانپ سونگھ گیا ہے ذرا زور زور سے چھیڑے جاؤ۔

میر صاحب تو جلے بھنے بیٹھے ہی تھے۔ خوجی نے جب کئی بار یہ ہانگ لگائی تو وہ جھلا اٹھا۔ ایک دفعہ ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ خوجی بیچارے کو دھم سے ہاتھی پر سے نیچے دھکیل دیا۔

خوجی: کون گرا، کون گرا، ذری پتا تو لینا کون گرا۔۔۔۔۔۔۔ کون؟

ایک: اے حضرت پتا کیا لیں آپ ہی تو لڑھکے ہیں

خوجی: ارے! میں؟ ہائے ہائے وہ تو کہیے ہڈی پسلی بچ گئی۔۔۔۔ یارو! ذری دیکھنا تو ہمارا سر بچا یا نہیں۔

قصہ دراصل یہ تھا کہ نواب صاحب سے رخصت ہونے کے بعد آزاد شہر شہر آوارہ گردی کرتے پھرے اور کھیل تماشے دیکھتے رہے۔ اسی دوران میں سرائے

کی ایک بھٹیاری (اللہ رکھی) سے مذاق میں کہیں وعدہ کر بیٹھے کہ اس سے شادی کر لیں گے۔ وہ سچ سمجھ بیٹھی اور شادی کا تقاضہ کرنے لگی۔ آزاد وہاں سے بھاگے بی بھٹیاری نے آزاد پر مقدمہ کر دیا اب یہ دونوں سپاہی جنہوں نے ہاتھی کو روکا تھا، آزاد کے وارنٹ لے کر آئے تھے اور سب کو گرفتار کر کے لیے جا رہے تھے۔ دونوں سپاہیوں نے خوجی اور میر صاحب کو ہاتھی سے اتار دیا اور سامان ان پر لاد کر پیدال چلنے کو کہا۔

خوجی: ہائیں، ہمیں مزدور مقرر کیا ہے۔ شریف اور پاجی کو نہیں، پہچانتے لو اب اتارتے ہو بوجھ یا میں نالے میں پھینک دوں۔ یا باپ کا سر سمجھ کر بوجھ لاد دیا۔ جانو ہم گدھے ہیں او گیدی لانا قرولی

میر صاحب نے نیچے اتر کر دیکھا تو سرکاری پیادہ لال پگڑی سجائے وردی ڈانٹے کھڑا ہے۔ اوسان خطا ہو گئے۔ لگے تھر تھر کانپنے چپ چپاتے سامان اٹھایا اور مچل مچل کر چلنے لگے۔ سپاہی دونوں ہاتھی پر جا بیٹھے۔ اب خوجی اور میر صاحب دونوں مزدور بنے لدے پھندے گرتے پڑتے جانے لگے۔

خوجی: واہ ری قسمت کہاں تو ہاتھی پر بیٹھے تھے۔ کہاں اب مزدور بنے چلتے ہیں کیوں جی میر صاحب ہم تو یا دالہی میں تھے، یہ تم کو کیا ہوا تھا؟ تم کہاں تھے؟

میر صاحب: جہاں حضور تھے وہاں بندہ بھی تھا آپ بھی نشے میں تھے۔ میں بھی نشے میں تھا دونوں غیں واللہ باللہ یہ آزاد چکمہ دے گیا۔ یہ اس کی ساری کارستانی ہے۔

خوجی: خدا سمجھے ایسا شریر آدمی تو دیکھا ہی نہیں۔

آزاد: ذرا چونچ سنبھالتے ہوئے ۔۔۔۔۔ نہیں اترتا ہوں۔ پھر آؤں کردوں مرمت؟

☆☆☆☆☆



آزاد فرار ہو گئے

چلتے چلتے سویرا ہو گیا خوجی بولے:

"لو بھئی! اب جو بوجھا اٹھا کر لے چلے اس کی سات پشتوں پر لعنت (بوجھ پھینک کر) اسے جس کا جی چاہے اٹھائے۔ سپاہیوں سے جھٹ سے سامان اٹھالیا اور دونوں کو بھی ہاتھی پر بٹھالیا۔"

جب دن چڑھا تو ایک سپاہی نے کہا

" بھئی، پھیلبان (فیلبان) سامنے ہاتھی روک لینا۔ ہم ایک دو گوتے (غوطے) تو لگالیں۔"

فیلبان: کیوں کیا کتیا گھٹی ہے؟

سپاہی: ہاں تم کو کیا۔۔۔۔۔۔تم تو چاہے بیس بیس دن نہ نہاؤ۔ ہم تو جات (ذات) باہر کر دیے جائیں۔

فیلبان: اجی تو ایسا نہانا بھی کیا۔ تالاب دیکھا اور کود پڑے گڑھیا ملی اور پھاند پڑے۔ واہ نہانا بھی کچھ موت ہے کہ ٹلے ہی نہیں اچھے رہے۔

آزاد: خوجی! کہو یار نہاؤ گے؟ بھئی ایک غوطہ لگاؤ ہماری خاطر سے۔۔۔۔۔۔واسطے خدا کے۔۔۔۔۔

خوجی: یوں ہی نہ زہر کی پڑیا دے دو۔ گلا گھونٹ ڈالو۔ یہ دل لگی ہمیں پسند نہیں۔

خیر صاحب خدا خدا کر کے کہیں شہر میں داخل ہوئے۔

اب ادھر سنیئے نواب پھول کے کپا ہو گئے تھے مارے خوشی کے ایسے پھولے کہ سچ مچ جامے میں نہ سمائے۔ بڑے ٹھسے سے باغیچے میں جھوم جھوم کر ٹہل رہے تھے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے جاتے ہیں کہ جلوس اب آیا اور اب آیا صف شکن علی شاہ کی زیارت اب نصیب ہوئی اور اب نصیب ہوئی اتنے میں چوبدار بدحواس دوڑتا ہوا آیا۔

چوبدار: خداوند! لٹ گئے، لٹ گئے، لٹ گئے، ہائے لٹ گئے، وہ دیکھو صاحب، تمہارے لٹ گئے۔

نواب: ہائیں، ہائیں! یہ کوئی بہروپیا تو نہیں ہے، میاں لٹ کیا گئے؟ کچھ کہو گے بھی یا لٹ گئے لٹ گئے ہی بکا کرو گے؟ کہیں پاگل خانے سے تو نہیں بھاگ آیا ہے؟

چوبدار: خداوند! برات کو اٹھائی گیروں نے لوٹ لیا۔ برات مع ہاتھی غائب!

نواب: ہوں برات! برات کس کی؟ کہیں شاہ جی کی سواری سے تو نہیں مطلب ہے؟ ارے یارو جلدی بتاؤ اف ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

چابک سوار: غلام عرض کرے جو جان بخشی ہو تو

نواب: اے ہے تو اب ان چونچلوں کا بھلا کونسا موقع ہے۔ میری بائیں آنکھ پھڑکنے لگی۔

چوبدار: وہ دیکھو صاحب تمہارے! برات پھرتی پھراتی گھومتی بڑے ٹھسے سے آ رہی تھی۔ چوک میں تماشائیوں کا یہ عالم چھتیں پھٹی پڑتی تھیں۔ ایک پر دس اور دس پر بارہ گرے پڑتے تھے۔ اجی وہ دیکھو صاحب تمہارے بس جیسے بادشاہوں

کی سواری نکلتی ہے، بس جیسے ہی بیچ چوک پہنچے کہ بس دو چپراسیوں نے للکارا کہ ہاتھی کو روک لو۔ ہاتھی ابھی پھیر دے۔ ہاتھی پھیر ادھر، بس وہ دیکھو صاحب تمہارے ہاتھی ادھر جھک پڑا۔ اب ادھر صاحب تمہارے پنشاخے تو یار لوگ لے اڑے اور دو چار بد معاشوں نے ٹوپیاں بھی اتار لیں۔ سب تتر بتر غائب غلہ وہ دیکھو صاحب تمہارے کہاں تو باجے بج رہے تھے کہاں سناٹا

نواب: بھلا شاہ جی کہاں ہیں

چوبدار: اجی حضور شاہ جی کو لیے پھرتے ہیں یہاں دیکھیے صاحب تمہارے

نواب: کوئی ہے؟ ادھر آنا ان کے کلے پر کھڑے ہو۔ جتنی مرتبہ ''وہ دیکھو صاحب تمہارے'' ان کی زبان سے نکلے اتنے جوتے ان پر پڑیں ''وہ دیکھو صاحب تمہارے'' انہوں نے کہا اور جوتا پڑا تڑسے۔ نامعقول ایک لفظ بولتا ہے اور تین سو ساٹھ بار ''وہ دیکھو صاحب تمہارے''

چابک سوار: اجی خداوند! اب اس وقت غصے کا وقت نہیں ہے اب کوئی فکر کیجیے کہ شاہ جی صاحب تو چھوٹ جائیں۔

نواب: ایں! کیا وہ بھی گرفتار ہو گئے؟

چابک سوار: جی اور میر صاحب بھی

چوبدار: اور خوجی بھی

غفور: اور میاں آزاد بھی

چوبدار: اور ہاتھی بھی اور ہاتھی کی دم بھی

نواب: اخاہ تو یہ کہیے بیڑے کا بیڑا گیا ہے۔ اب ہمیں یہ کیا معلوم تھا بھلا ورنہ

ایک گارد ساتھ کر دیتے۔ چلو خیر اب تو جو ہوا، سو ہوا۔ افسوس صف شکن علی شاہ کی زیارت نصیبوں میں نہیں ہے آخر کچھ معلوم ہو کہ یہ دھڑ پکڑ کیسی تھی۔ بھئی سچ تو یوں ہے کہ اس وقت ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے ہم سے تو کچھ امید نہ رکھو۔ روپیہ ہم سے لو اور فکر تم کرو۔

مصاحبین کی بن آئی۔ اب کیا پوچھنا ہے پانچوں گھی میں اب تو چاندی ہے آپس میں ہنڈیا پکنے لگی کہ واللہ ایسا موقع پھر تو کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔ جو کچھ لینا ہو لے لو اور عمر بھر چین کرو۔ اس وقت یہ بوکھلایا ہوا ہے جو کہو گے بے دھڑک دے دے گا۔ لیکن ایک کام کرو۔ دس پانچ آدمی مل جل کر باتیں بناؤ ایک آدمی کے کیے کچھ بھی نہ ہو گا۔ کہیں بھڑک گئے تو پھر غضب ہی ہو جائے گا۔ اکیلی تو لکڑی بھی چولہے میں نہیں جلتی۔ آج تو واللہ، بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا ہے۔ خدا کرے روز اسی طرح وارنٹ جاری ہوں تو دل لگی ہے۔ مگر اتنا یاد رکھیے گا جو کہیں زنان خانے میں خبر ہوئی تو چھوٹی بیگم واللہ چھچھوندر کی طرح سے ناچیں گی۔

میاں آزاد جس دن شہر میں داخل ہوئے اس دن اتفاق سے چھٹی تھی دوسرے دن پھر چھٹی، کچہریاں بند لیکن جس گلی، کوچے، بازار کی طرف نکل جاتے ہیں لوگ آپس میں باتیں کرتے ہیں کہ کیوں بھئی یہ کہاں کے رئیس ہیں:

ایک بولا:

"راجہ ہیں کہیں کے"

دوسرے نے کہا

"کوئی ٹھاکر ہیں"

اس وقت تو یہ رئیس بنے ہوئے ہی تھے۔ ہاتھی پر بیٹھے یہ کسی کو معلوم ہی نہیں کہ میاں کے نام وارنٹ جاری ہوا ہے سپاہیوں نے حضرت کو ایک باغ میں اتارا آپ الا اللہ کہہ کر ہاتھی پر سے دھم سے کودے۔

خوجی: میاں فیل بان ذرا سیڑھی تو لگا دینا

فیلبان: کیا سیڑھی اچھے آئے اب آپ کے لیے سیڑھی بنواؤں ایسے بھی تو خوبصورت نہیں ہیں آپ

میر صاحب: ہونہہ سیڑھی ڈھونڈتے ہیں ہاتھی پر سے کودنا کتنی بڑی بات ہے؟

یہ کہہ کر میر صاحب ہاتھی کی دم کی طرف سے کودے اس بوکھلاہٹ میں کہ سر نیچے اور پاؤں اوپر۔

خوجی بیچارے جان پر کھیل کر جیسے ہی اترنے کو تھے کہ اتفاق سے ہاتھی اٹھ کھڑا ہوا "یا علیؑ یا علیؑ بچائیوں خداوند، خداوند! میں گنہ گار بندہ ہوں" اب سنیے کہ فیلبان نے سچ مچ دھکیل ہی دیا دھڑرر دھم "ارے او ظالم اور جو میری ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی تو پھر کیسی ہوتی۔"

فیلبان: ہونہہ ٹوٹ جاتی تو ٹوٹ جاتی

خوجی: ہونہہ وونہہ کے بھروسے نہ رہیے گا۔ ذری ہاں میں نے بتا دیا ہے۔

فیلبان: اچھا تو ہڈی پسلی ٹوٹتی تو سمجھ لیتے۔ اب پیڑ کے تلے لیٹیے

خوجی: ہاں بھئی! لیٹیں گے نہیں تو اور کیا کریں گے نہ تو اور کیا کریں گے بھلا یہاں کچھ کھانے والے کو بھی ملتا ہے؟

فیلبان: جی ہاں گھاس کھائیے

باغ میں میاں آزاد سپاہیوں کی آنکھ بچا کر چل دیئے یہ جا وہ جا اسٹیشن پر جھٹ سے ٹکٹ لے کر ریل کے ڈبے میں بیٹھے جارہے تھے۔

ایک سٹیشن پر ریل ٹھہری تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خوبصورت جوان کوئی بیس اکیس برس کا پڑھنے لکھنے کے دن گیر دے کپڑے پہنے ہاتھوں میں ہتھکڑی، پاؤں میں بیڑی ہے اور دو کانسٹیبل ساتھ گردن نیوڑھائے، آنکھیں جھکائے، منہ بنائے ان کے ساتھ چلا جاتا ہے اور پیچھے ایک بوڑھا روتا آتا ہے۔ دیکھ کر میاں آزاد کا بھی دل بھر آیا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اتنے میں میاں آزاد کے قریب کے ڈبے میں کانسٹیبل اس نوجوان کو لے کر بیٹھے۔ گاڑی چلی تو میاں آزاد نے بوڑھے سے یوں گفتگو کی:

آزاد: کیوں قبلہ! اگر بے ادبی نہ ہو تو دریافت کروں آپ کے رونے کا سبب کیا ہے؟ روئے آپ ہیں مگر آواز میرے کلیجے کے پار ہوتی ہے۔

بوڑھا: کیا کہوں کل تک بھلا چنگا تھا۔ آج مجھ سے زیادہ مصیبت کا مارا ساری خدائی میں کوئی نہیں۔ یہ جوان بد بخت میرا داماد ہے ایک لڑکی کے سوا میری اور کوئی اولاد نہیں۔ جب اس کی شادی ہوئی تو یہ کوئی گیارہ برس کا تھا۔ مگر اسی عمر میں اس کے ماں باپ نے اس کو بالکل بے لگام چھوڑ دیا تھا۔ بازاروں میں گھومنا بات بات پر زبان سے گالی نکالنا۔ کسی کو دھول کسی کو چپت جانا۔ دو دو دن گھر میں نہ آنا۔ ہر بات پر مچل جانا۔ اس کے والد کو اس کا بالکل خیال نہ تھا۔ میں نے دو چار بار سمجھایا کہ بھائی دیکھو لڑکا خراب ہوا جاتا ہے تو مجھے للکارنے لگے کہ واہ آپ ٹوکنے والے کون؟ آپ نے لڑکی کیا بیاہی کہ استاد بن بیٹھے۔ رفتہ رفتہ صاحبزادے نے

چوری چوری اسباب بیچنا شروع کر دیا۔ کبھی لوٹا غائب، کبھی زیور کا پتہ نہیں۔ کبھی میوہ فروش دروازے پر غل مچا رہے ہیں کہ دو مہینے سے ڈھائی روپیہ نہیں دیا۔ کبھی پان فروش نے مقدمہ کر دیا کہ گیارہ روپے کے پان کھا گیا۔ قیمت مانگتا ہوں تو اوپر سے غراتے اور آنکھیں دکھاتے ہیں۔ آخر کار یہ نوبت پہنچی کہ آج گرفتار ہیں افسوس۔۔۔۔۔۔۔

آزاد: پھر اب علاج؟

بوڑھا: علاج؟۔۔۔۔۔۔ علاج اب کیا؟ مگر وکیلوں نے رائے دی ہے کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ مقدمہ جان دار ہے اپیل میں رہا ہو جائے گا۔ لیکن اس سے کیا ہو گا اب کی اگر رہا بھی ہوئے تو آگے چل کر کیا ہونا ہے۔ اگر یہی حرکتیں رہیں تو خدا ہی حافظ ہے۔

میاں آزاد بڑی دیر تک اس نوجوان کو سمجھایا کیے۔ بعد میں دوسرے سٹیشن پر وہ نوجوان اور بوڑھا اتر گئے۔

☆☆☆☆☆

نئے شہر میں

میں آزاد گھومتے پھرتے ایک شہر میں پہنچے۔ نئے شہر کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔

ایک راہگیر سے میاں آزاد نے پوچھا

آزاد: (ایک راہگیر سے) اس کوٹھی اور بارہ دری میں کون رئیس رہتا ہے؟

راہگیر: رئیس نہیں ایک رئیسہ رہتی ہیں۔ بڑی مال دار ہیں اب تو کوئی ساٹھ برس کی ہوں گی۔ رات کو روز کشتی پر دریا کی سیر کو نکلتی ہیں۔ ان کی دو لڑکیاں بھی ہیں۔ تیرہ تیرہ چودہ چودہ برس کی ہوں گی۔ شریف زادیاں، رئیس زادیاں ہیں، بڑی تمیز دار، بڑی سلیقہ شعار ہیں۔ آنکھوں میں شرم، پاک نظر، پڑھی لکھی۔

آزاد: شادی ابھی نہیں ہوئی۔ بھلا کہیں پیغام ہے؟

راہگیر: ابھی شادی نہیں ہوئی نہ کہیں بات چیت ہے دونوں بہنوں کو کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ پڑھنے لکھنے، دریا کی سیر اور باغ کی سیر کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ سینے پرونے، اور کاڑھنے میں بھی دونوں بہنیں بڑی تیز ہیں۔ کھانا بھی خوب پکا لیتی ہیں۔ صفائی کا دونوں کو خیال ہے۔ میلے کچیلے مکان میں دم بھر نہ بیٹھیں خدا کرے ان کی شادی اچھے گھروں میں ہو۔

میاں آزاد کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی اپنے لڑکے کو گودی میں لیے ہوئے تھپکی دے دے کر سلا رہا ہے اور بہلا رہا ہے، کہ آ جا ری نندیا تو آ کیوں نہ جا۔ میاں آزاد بڑے خوش ہوئے، کہ خیر سے ایک ظریف تو ملا۔ فوراً ہاتھ ملایا۔ گلے لگایا اور

کہا یار و اللہ خوش مذاق آدمی ہو استاد اب چلو ذرا اپنے شہر کی ہمیں سیر تو کرا لاؤ۔

ظریف: ہم تاڑ گئے ہم بھانپ گئے شہر کے باہر دیکھے گا یا اندر

آزاد: جہاں لے جایئے

ظریف: اچھا کل شام کے وقت

آزاد: اچھا رخصت

ظریف: خدا حافظ

میاں آزاد کی رگوں میں خون کی جگہ پارہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا پھر ایک جگہ ان کو چین کہاں! کبھی اس محلے میں کبھی اس محلے میں چوطرفہ گھومتے پھرتے تھے۔ صبح سویرے ہی اٹھے اور پہنچے ظریف کے مکان پر۔

کیوں حضرت اب لمبی تانے پڑے سویا ہی کیجیے گا۔ یا اب اٹھیے گا بھی کیا گھوڑے بیچ کر سوئے ہو بھئی میاں سات بج گئے۔ اتنے میں ان کے دو چار دوست اور آ گئے

''اللہ اللہ ہم دو کوس سے آئے یہاں ابھی چارپائی بھی نہ چھوٹی بھئی بڑا سونے والا ہے۔ ہم نے غسل کیا حقہ پیا دو چپاتیاں کباب کے ساتھ کھائیں منہ ہاتھ دھویا کپڑے پہنے ان سب کو ان کے گھروں سے لیا یہاں تک آئے اور یہ ابھی تک سوئے ہوئے ہی ہیں۔''

دوسرے نے کہا ''اجی ان پر پانی ڈالیے''

یاروں نے منہ پر چھینٹے دینے شروع کیے۔ کسی نے کان میں پانی ڈالا۔ کسی نے بستر پر تب تو حضرت کلبلائے اور انتہا کے جھلائے

''دیکھو۔۔۔دیکھو ہائیں ہائیں نہیں مانتے واہ اچھی دل لگی نکالی ہے۔''

لگے صلواتیں سنانے

''اے صاحب ذرا آنکھ تو کھولیے''

''نہیں کھولتے آپ کا زور''

''دیکھیے یہ میاں آزاد تشریف لائے ہیں اٹھیے ادھر مولوی صاحب کھڑے ہیں ان سے تو ملیے سوسو کے نحوست پھیلا رکھی ہے۔''

مولوی صاحب: اجی حضرت!

ظریف: بھئی تنگ نہ کرو۔ ہمیں سونے دو اجی حضرت یہاں مارے نیند کے برا حال ہے۔ آپ کو دل لگی سوجھتی ہے۔ بس اب ہم سے نہ بولیے گا۔ آپ کو تو کچھ کرنا نہیں ہے۔

آزاد: یا حضرت!

ظریف: لیجیے آپ اور آنے وہاں سے جان کھائے۔ سویرے سویرے آپ کو بلایا کس نامعقول نے تھا۔ کسی بھلے مانس کے مکان پر جانے کا یہ کون سا وقت ہے (آنکھیں کھول کر) آخاہ۔۔۔۔ آپ ہیں معاف کیجیے گا حضرت آزاد! میں نے آپ کی آواز نہیں پہچانی

مولوی صاحب: میں بھی سلام عرض کرتا ہوں کہیے میری آواز بھی پہچانی یا نہیں۔

ظریف: آخاہ۔۔۔ جناب مولانا ہیں سلام عرض ہے، معاف فرمائیے گا۔ میں اپنے آپ میں نہ تھا۔

مولوی صاحب: اے حضرت! اتنا بھی نیند کے ہاتھ بک جانا کیا بھلا کوئی بات بھی ہے آٹھ بجا چاہتے ہیں اور آپ پڑے سو رہے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ کیا کل رات بھر جاگتے رہے تھے؟ خیر بندہ تو اب رخصت ہوتا ہے ریل کا وقت قریب ہے اچھا اب رخصت!

ظریف: (آزاد سے) اور باتیں تو پیچھے ہوں گی پہلے آپ اس بات کا جواب دیجئے کہ آپ کھانے وانے سے تو فراغت کر کے آئے ہیں نا! آج نوکرانی بیمار ہو گئی ہے اور گھر میں بیوی کی طبیعت بھی خراب ہے بندے نے بھی روزے کی نیت کی ہے۔ آپ بھی روزہ رکھ لیں، روزے کا روزہ اور ثواب کا ثواب۔

آزاد: میاں ثواب کی ہمیں خواہش نہیں اللہ میاں ہمیں یوں ہی بخش دیں گے واللہ تم بڑے دل لگی باز آدمی ہو۔

ظریف: جی تو کہیں دل لگی کے بھروسے بھی نہ رہے گا۔ ہاں بندہ کھرا آدمی ہے۔

آزاد: خیر صاحب یہ باتیں تو ہوا ہی کریں گی۔ پہلے آپ اس شہر کی سیر تو کرا لائیے

ظریف: اچھا پھر آپ بھی کیا یاد کیجئے گا آئیے چلیے (دونوں ہاتھ چلے) دیکھیے یہ سکول ہے۔

اتنے میں دو چار لڑکے سکول سے نکلے۔ سب ہم عمر اور کم عمر مگر ان میں سے ایک بڑا شریر کسی پر دھپ جمائی، کسی کو چپت لگائی۔ کسی کے کان گرمائے کپڑے سب پھٹے پھٹے، پرانے دھرانے، میلے کچیلے، روشنائی سے آستین اس کی صورت کی

طرح سیاہ ہاتھ پاؤں پر اس درجہ گرد کہ خدا کی پناہ آزاد نے ظریف سے پوچھا کہ:

"کیوں صاحب! یہ حضرت تو بڑے پرلے سرے کے بدمعاش معلوم ہوتے ہیں ذرا دیکھیے تو اپنے سے دگنے تک کی خبر لیتا ہے۔ مگر دیکھ لیجیے گا کوئی ان کا بھی گرو پیدا ہو ہی جائے گا۔"

ظریف نے مسکرا کر چپکے سے کہا کہ میاں خدا کے لیے ان کے منہ نہ لگنا۔ ان کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔ یہ سکول بھر میں مشہور ہیں جس طرف جاتے ہیں انگلیاں اٹھتی ہیں دو دفعہ شوری کے الزام میں دھرے گئے۔ ایک مرتبہ مار پیٹ کی وجہ سے چالان ہوا کچھ پوچھیے نہ ان کے مارے محلے بھر کا ناکوں میں دم ہے۔ ایک دفعہ حضرت کو شرارت سوجھی۔ فوراً ایک پاؤں کا جوتا اتار کر حضرت نے ایک الماری پر رکھ دیا۔ اس الماری پر ایک طالب علم کی کتابیں بھی رکھی تھیں۔ ان کتابوں پر آپ نے جوتا احتیاط کے ساتھ رکھ دیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اسی طالب علم سے کہا کہ ارے یار ذرا جیومیٹری کی کتاب تو دینا رات کو سور ہے۔ ایک شکل بھی نہیں یاد نہیں کی آج ماسٹر صاحب بری طرح ماریں گے۔ اب بچنا محال ہے لاؤ بھائی ذرا بستے میں سے جیومیٹری نکال دو سب نہیں تو کچھ یاد کر لیں گے۔ وہ سیدھا سادا لڑکا چپکے سے اٹھا کہ جیومیٹری کی کتاب نکال دے۔ جیسے ہی کتاب الماری پر سے اٹھائی ویسے ہی جوتی منہ پر آئی۔ اور اچھل کر قریب کے ایک اور طالب علم کے کندھے سے چھو کر زمین پر گری تڑ سے اور کلاس میں قہقہہ پڑا سب لڑکے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ماسٹر صاحب بھی چونک پڑے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بہت ہی جھلا کر پوچھا:

"یہ کس کی جوتی کا پاؤں ہے"

اب آپ چپ چاپ بیٹھے جغرافیہ پڑھ رہے ہیں۔ گویا ان سے کچھ واسطہ ہی نہیں کانوں کان خبر ہی نہیں مگر ان کا تو درجہ بھر دشمن تھا کیوں کہ یہ سب کو چھیڑا کرتے تھے۔ کسی لڑکے نے اشارہ کر دیا کہ یہ ہیں۔ زور سے چلا کر نہیں کہا کہ ایسا نہ ہو باہر نکل کر مارے۔ ماسٹر صاحب نے ان کو میز کے قریب بلایا۔ اب قلعی کھل گئی حضرت کا حلیہ ملاحظہ فرمائیے گا۔ بال بکھرے ہوئے سر پر خاک بدن پر مٹی ایک پاؤں میں بوٹ دوسرے میں صفایا۔

ماسٹر: تمہارا دوسرا پاؤں کہاں رہے؟

جواب: جناب پاؤں تو میرے دونوں موجود ہیں (پاؤں دکھا کر) لیجیے ایک اور یہ دوسرا دونوں ہو گئے یا نہیں؟

ماسٹر: پاؤں نہیں جوتا جوتی

جواب: بہت خوب جوتا مذکر جوتی مونث

ماسٹر: بے حیا بنچ پر کھڑا ہو

جواب: نا صاحب کوئی اور سزا تجویز کیجیے

ماسٹر: اچھا کل کے سبق کو سو بار کاغذ پر لکھ لانا

جواب: کتنے کتنے کتنے مرتبہ؟ سو!!! اور سبق کب یاد کروں گا نا قبلہ کوئی اور سزا تجویز کیجیے۔

ایک آپ نے ایک کتے کی دم میں کپڑا باندھا اور اس میں چھچھونڈ باندھی اور آگ دکھا دی۔ پھر لطف دیکھیے کہ چو طرفہ کتا ناچتا تھا کئی چھپر پھونک دیے۔ کئی

دکانیں جھلس دیں۔ کئی آدمیوں کے کپڑے جلا دیے۔ بستی بھر میں شور تھا۔ مارے خدا خدا کر کے آگ بجھی مگر اس بے زبان بچارے کی جان ہی پر بن آئی۔

اور سنیئے ایک بھلے مانس کے یہاں کہہ آئے کہ تمہارے لڑکے کو سکول میں ہیضہ ہو گیا ہے جلدی جاؤ اور اسے لے آؤ۔ ان کے گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا۔ اس لڑکے کا باپ اور بھائی اور چچا اور ماموں سب دوڑتے ہوئے سکول پہنچے اور عورتوں نے رونا شروع کیا کوئی سر پیٹتی ہے۔ کوئی نام لے لے کر پکارتی ہے۔ وہ لوگ جو سکول گئے تو دیکھتے ہیں کہ لڑکا مزے سے باتیں کرتا ہوا دوسرے لڑکوں کے ساتھ آ رہا ہے۔ گلے ملے اور خدا کا شکریہ ادا کیا۔ آخر کار معلوم ہوا کہ یہ انہی ذات شریف کی کارستانی ہے۔ شرارت کی انتہا ہے کہ ایک بار اپنے باپ کو نمک کی بجائے پھٹکری کھلا دی اور جان بوجھ کر

میاں آزاد اور ظریف گھر پہنچے۔ روشن نوکر نے کہا حضور بیگم صاحب آپ کو کوئی بیس بار پوچھ چکی ہیں اتنے میں لونڈی اندر سے آئی (میاں گھر میں بلاتی ہیں)

میاں ظریف نے دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ ان کی بیوی نے آڑے ہاتھوں لیا "یہ دن دن بھر آپ غائب کہاں رہنے لگے۔"

اب تو خیر سے بڑے سیلانی ہو گئے۔ صبح کے نکلے شام کو خبر لی۔ چلو میرے سامنے سے جاؤ۔ مجھے ان باتوں سے نفرت ہے آج کھانا وانا کچھ نہیں ہے۔ کچھ پکاو کا نہیں ہے یہاں کسی کو کتے نے نہیں کاٹا کہ وخت (وقت) بے وخت چولہے کا منہ کالا کیا جائے۔ بھلے مانس آدمی ایک گھڑی کے لیے ذرا کہیں گئے تو گئے یہ نہیں

کہ دن دن بھر پتا ہی نہیں اچھے ہتھکنڈے سیکھے ہیں۔

ظریف نے چپکے سے کہا کہ "نیک بخت ذرا آہستہ آہستہ باتیں کر باہر ایک بھلا مانس ٹکا ہوا ہے اتنی بھی کیا بے حیائی"

اس پر وہ چمک کر بولیں کہ: "بس بس زبان نہ کھلاؤ بہت تمہیں جو دوست ملتا ہے خدائی خوار گھر نہ بار کبھی کسی شریف زادے سے دوستی کرتے دیکھا نہیں چلیے اب دور ہو جیے نہیں تو ہم بری طرح پیش آئیں گے مجھ سے برا کوئی نہیں"

میاں ظریف بچارے کی جان عذات میں کہ گھر میں بیوی سنا رہی ہے اور میاں آزاد لاکھوں ہی گالیاں دیں گے کہ آپ کی بیوی نے آپ کو تو خیر جو کہا تھا وہ کہا ہی تھا مجھے کیوں لے ڈالا میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا؟ اپنا سا منہ لے کر باہر نکل آئے اور آزاد سے کہا کہ "یار آج روزے کی نیت کر لو یا سمجھ لو آج فاقہ ہی سہی"

آزاد بولے کہ: "فاقہ آپ کے دشمنوں کو چلیے نانبائی، حلوائی کسی کی دکان پر مزے سے چل کر کھانا کھا آئیں۔"

انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اتنے ہی ہوتے تو بیوی کی باتیں کیوں سنتے میاں پیسہ ٹکا پاس نہیں، حلوائی کیا ہمارا ماموں ہے؟"

آزاد ایک ہی خرانٹ بولے: "اس کی فکر نہ کریں آپ ہمارے ساتھ چلیے اور مزے سے مٹھائیاں چکھیے مگر جو تدبیر بتا دیں اس میں ذرا فرق نہ آنے پائے۔"

غرض میاں آزاد ظریف کو لے کر بازار پہنچے اور حلوائی کی دکان کے قریب سے یہ آگے بڑھ گئے اور آزار ذرا پیچھے رہ گئے۔ ظریف سکھائے پڑھائے، سمجھائے بجھائے تو تھے ہی جاتے ہی حلوائی سے کہا کہ میاں آٹھ آنے کے پیسے دو

اور آٹھ آنے کی پنج قسم کی مٹھائی۔ حلوائی نے پنج قسم کی مٹھائی خاصی تازی تازی تول دی۔ اور آٹھ آنے ڈبل گن دیے۔ پیسے تو میاں ظریف نے رومال میں باندھے اور مٹھائی اسی کی دکان پر کھانے لگے۔ اتنے میں میاں آزاد نمودار ہوئے:

''بھئی لالہ ذرا عمدہ تازہ لڈو تو ایک روپیہ کے تول دینا مگر بیسن ہی کے ہوں۔

اس نے ایک روپیہ کے لڈو تول کر دیے اتنے میں حضرت ظریف نے پیسے اور مٹھائی جو حلوائی سے پہلے لی تھی سنبھال کر چلنے کا ارادہ کیا اور بسم اللہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے تب تو حلوائی نے للکارا کہ ''میاں چلے کہاں ذری پہلے بائیں ہاتھ سے پیسے تو رکھے جاؤ''

''اے روپیہ کیا تو نے پایا نہیں۔ پہلے روپیہ دیا پھر سودا لیا۔ کیا چاروں اچکوں سے سابقہ رہا ہے۔''

اس پر حلوائی اور ظریف میں تکرار ہونے لگی اور اس درجہ بڑھی کہ تو تو، میں میں ہونے لگی اردگرد لوگ اکٹھے ہو گئے کوئی کہتا لالہ گھاس کھا گئے ہو۔ کوئی کہتا میاں ایک روپیہ کے لیے نیت ڈانواں ڈول نہ کرو۔ اتنے میں میاں آزاد نے کہا:

''میاں حلوائی اب کہیں اسی طرح میرا روپیہ بھی نہ بھول جایئے گا۔''

''کیا آپ کا روپیہ! آپ نے روپیہ دیا کس کو؟ چلیے پہلے ایک تھا، اب دو ہو گئے'' اب جو سنتا ہے وہ حلوائی ہی کو الو بناتا ہے۔ لوگوں نے بہت لعنت ملامت کی شریف آدمیوں کو بے عزت کرتے ہو۔ روپیہ لے کر مکر جاتے ہو۔ لالہ ساکھ جاتی رہے گی۔

اتنے میں اس حلوائی کا بڈھا باپ جو آیا تو دیکھتا کیا ہے کہ مکان کے اردگرد

ہجوم ہے پوچھا ''کیا ماجرا ہے؟ کیا دکان لٹ گئی ہے؟''

ایک نے کہا: ''اجی لٹ تو نہیں گئی مگر اب تمہاری دکان کی ساکھ جاتی رہی ابھی ایک بھلے مانس نے کھن سے روپیہ پھینکا اب کہتا ہے کہ ہم نے روپیہ پایا ہی نہیں اس کو چھوڑا تو دوسرے بیچارے شریف کا دامن پکڑ لیا کہ تم نے بھی روپیہ نہیں دیا۔ حالانکہ وہ بچارے سینکڑوں قسم کھاتے ہیں کہ میں دے چکا ہوں حلوائی بڑا تیکھا بڈھا تھا۔ سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا۔ اور جھلا کر اپنے لڑکے کی کھوپڑی پر تان کر ایک لگائی ''ہات تیرے کی کہتا ہوں بھنگ نہ کھایا کر مانتا ہی نہیں'' کیوں، پھر کھائے گا بھنگ؟''

ظریف اور میاں آزاد نے مزے سے ڈیڑھ روپیہ کی مٹھائی باندھ لی اور آٹھ آنے الگ لے لیے۔ راستے میں قہقہے لگاتے چلے۔ جب گھر پہنچے تو خوب لڈو اور برفی اور پیڑے کھائے۔ بچے بچائے اندر بھیجے اب آزاد سے میاں ظریف نے کہا۔

''یار اس طرح روپے پیدا نہیں کرتے کہیں سے روپے لوٹو تو جانیں''

انہوں نے کہا: ''یہ کتنی بڑی بات ہے استاد ابھی چلو مگر کسی سے مانگ کر کچھ اشرفیاں یا روپیہ لے لو۔ اشرفی ہو تو کیا ہی بات ہے ظریف نے دو اشرفیاں نکالیں اور کہا:''

''لیجیے موجود ہیں''

میاں آزاد ظریف اور ایک نوکر اب پھر بازار پہنچے

ایک سیٹھ کو اشرفیاں دکھائیاں اور کہا:

"یہ بیچنی ہیں، کھری کھوٹی دیکھ لیجئے"

سیٹھ نے ان کو خوب دیکھا بھالا اور بالکل کھرا پایا اور کہا: "انیس روپے کے حساب سے لیں گے۔"

ظریف وہاں سے دوسری دکان پر پہنچے اور وہاں بھی اشرفیاں گنوائیں اور پرکھوائیں

اس کے بعد ایک سیٹھ کی کوٹھی پر پہنچے مگر اشرفیاں راستے میں آزاد کو دے دیں اور کہا:

"تم سیدھے گھر کی راہ لو"

خود سیٹھ کی کوٹھی پر پہنچ کر کہا کہ: "ہم کو دوسو اشرفیاں خریدنی ہیں سیٹھ نے دیکھا آدمی شریف ہیں کپڑے بھی نفیس اور قیمتی پہنے ہوئے ہیں فوراً دوسو اشرفیاں ان کے سامنے ڈھیر کر دیں ظریف نے پوچھا:"

"ان کی قیمت کیا ہے؟"

سیٹھ بولے: "خریدتے ساڑھے انیس روپے کے حساب سے اور بیچتے بیس روپے کے حساب سے ہیں۔"

"اخاہ! اتنا فرق اچھا ذرا ساڑھے انیس روپے کے حساب سے کسی کاغذ پر ان کی قیمت لکھ دیجئے"

سیٹھ کے منشی نے ایک پرچہ پر حساب لکھ دیا۔ حضرت نے وہ کاغذ تو جیب میں رکھا اور اشرفیاں باندھ کر کھڑے ہوئے پلک جھپکتے میں وہ کوٹھی کے باہر تھے۔

"ہائیں، ہائیں، ہائیں ہاں لینا، لینا پکڑنا"

''کہاں کہاں''ظریف کھڑے ہو گئے''بس دور ہی سے بات ہو سامنے آئے تو میں نے ایک ہاتھ دیا۔''

''اے صاحب روپے تو دیجیے''

''کیسے روپے آخر روپے کیسے، ہم نہیں بیچتے''

''کیا کہا نہیں بیچتے کیا اشرفیاں آپ کی ہیں؟''

''جی اور نہیں تو کیا آپ کے باپ کی ہیں ہم نہیں بیچتے آپ کون ہیں زبردستی کرنے والے''

اتنے میں آزاد بھی آن پہنچے ظریف بولا:

''ساڑھے انیس کے حساب سے ہم کیوں بیچیں''

سیٹھ، اس کا منشی اور چیلے چاپڑ غل مچا رہے ہیں، کہ تم اشرفیاں لائے کب تھے؟ وہ ایک نہیں سنتے اتنے میں کوئی دو سو آدمی جمع ہو گئے اور پولیس آن موجود

جمعدار: یہ کیا فساد ہے لالہ چنا مل! وہ نہیں بیچتے تو زبردستی کیوں کرتے ہو اپنے مال پر سب کو اختیار ہے۔ وہ بیس چھوڑ بائیس کے حساب سے دیں۔ پھر آپ کون، مفت میں دروزے پر فساد کرنا کون سی دانائی ہے بھلا؟ چلو اب جاؤ اپنا کام دیکھو۔

سیٹھ: آپ اچھے منصف بنے ہیں یہاں چار ہزار روپے پر پانی پھرا جاتا ہے۔ آپ کہتے ہیں جانے بھی دو۔ یہ تو ہماری اشرفیاں ہیں یہ تو خریدنے آئے تھے۔ ہم نے گن دیں بس باندھ بوندھ کر چل کھڑے ہوئے۔

تماشائی: واہ بھلا کوئی بات بھی ہے یہ اکیلے آپ دس جو ایسا ہوتا تو یہ کوٹھی کے باہر بھی نہ آنے پاتے۔ آپ سب مل کر ان کا اچار نہ نکال ڈالتے اب تک ان کا

کچھ مر نکل گیا ہوتا۔ اتنے بڑے سیٹھ اور دو سو اشرفیوں کے لیے ایمان چھوڑے دیتے ہو

جمعدار: حد درجہ بری بات ہے

ظریف: دیکھیے آپ بازار میں دریافت کر لیں کہ ہم نے کتنی دکانوں میں یہ اشرفیاں دکھلائیں۔ بازار بھر گواہ ہے۔ کچھ ایک دو آدمی وہاں تھوڑا ہی تھے۔ اس کو بھی جانے دیجئے۔ یہ پرچہ پڑھیے اس میں ساڑھے انیس روپے کا حساب لگایا گیا ہے یا کچھ اور اور اگر بیچتے تو بیس کے حساب سے نہ لکھا ہوتا۔ مفت میں ایک شریف کے پیچھے پڑے ہیں لینا ایک نہ دینا دو۔

جمعدار: یہ تو خوب ثبوت دیا۔ لالہ جی افسوس ہے کہ آپ اور یہ جھگڑا آخر یہ آپ کے منشی کے ہاتھ کا لکھا ہے یا کسی اور کے پھر جھگڑا کا ہے کا بھلا سو بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ بازار میں چلیے دیکھیے ان کے پاس اشرفیاں تھیں یا نہ تھیں۔ اچھا اس وقت وہاں کوئی اور بھی تھا؟

ظریف کا نوکر: جی ہاں میں تھا

جمعدار: تم نے کیا دیکھا؟

نوکر: یہ میاں آئے اور اشرپھی (اشرفی) انڈیل دی۔ لالہ سے چھاؤ تاؤ نہ ہوا۔ بس باندھ کے لے گئے تو لالہ نے غل مچایا کہ لوٹ لیا لوٹ لیا بس اور کچھ نہیں دیکھا ایمان نہیں چھوڑنا ہے۔

جمعدار: تو اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا اب چلو بازار بھی چلیں۔

عرض میاں ظریف اور سیٹھ، ان کی منشی اور جمعدار اور تماشائی سب مل کر بزار

چلے وہاں تحقیقات کی تو سب نے گواہی دی کہ بیشک ان کے پاس اشرفیاں تھیں اورانہوں نے پرکھوائی بھی تھیں ابھی ابھی یہاں سے گئے تھے۔

جمعدار: لالہ صاحب اب خیر اسی میں ہے کہ چپکے ہو رہیے ورنہ بیڈھب ٹھہرے گی۔ثبوت کافی موجود ہے آپ کی لاکھ کی ساکھ جائے گی اور منشی کی تو شامت ہی آئے گی آئندہ آپ کو اختیار ہے۔

سیٹھ: کیا اندھیر ہے چار ہزار روپے پر پانی پڑ گیا جو ہے ہمیں کو الو بناتا ہے خیر ہاتھ دھویا۔

میاں آزاد تو کھسکے اور نوکر ظریف کے ساتھ گھر پہنچے باچھیں کھلی جاتی ہیں جاتے ہی دوسو اشرفیاں کھن کھن کرکے سامنے ڈال دیں دیکھایوں لاتے ہیں لو یہ اشرفیاں ہماری بھابھی جان کے پاس رکھو۔خدا کی قسم تم نے وہ دھوکا کیا ہے واہ جی واہ

ظریف: یہ فن تم بھی سیکھ لو آج سے ہمارے شاگرد ہو۔

آزاد: یہ زبانی باتیں ہیں ہمیں پسند نہیں

ظریف: مٹھائی رکھو سامنے دل لگی نہیں ہے، ڈیڑھ روپیہ کی مٹھائی

آزاد: لو بھابھی سے خوشخبری کہہ دو بہت منہ پھلائے بیٹھی تھیں

ظریف: (گھر جا کر) کہاں ہو کیا سو رہیں

بیوی: کیا کمائی کر کے آئے ہو جو ڈانٹ رہے ہو سو نہ رہیں تو کیا تمہاری طرح رات بھر چوکی پہرا کریں۔

ظریف: (اشرفیاں کھنکا کر) لو ادھر آؤ بہت صلواتیں نہ سناؤ یہ لو دس ہزار کی

اشرفیاں

بیوی: یہ دھوکا کسی اور کو دیجیے گا یہ تو وہی اشرفیاں ہیں جو چچا جان امانت رکھوا گئے ہیں۔

ظریف: وہ تو یہ الگ ہے

بیوی: دیکھوں (کھلکھلا کر) واہ واواہ یہ کس کے گھر سے لائے بس چپکے سے صندوقچے میں ہمارے رکھ دو۔

ظریف: جی بجا ہے آپ کا صندوقچہ ایسا ہی تو بڑا ہے۔

بیوی: (ہنس کر) واہ اے واہ الا یچی رکھنے والا نہیں وہ بڑا صندوق جس میں ہمارا زیور رہتا ہے

ظریف: یہ اشرفیاں وہی لائے ہیں جن کو تم لفتے اور لقے بناتی تھیں اور ہم نے مدد دی۔

بیوی: (ہاتھ جوڑ کر) میاں قصور معاف کر دو ہماری خاطر سے کہا سنا بھول جاؤ۔ انسان کی طبیعت ہمیشہ ایک سی تھوڑا ہی رہتی ہے میں تو تمہاری لونڈی ہوں بیوی پیاری بیوی ہوں۔

آزاد: (باہر سے) ہم بھی سن رہے ہیں بھابی صاحب ابھی تو آپ نے ہمارے بھائی بچارے کو ڈانٹ دیا تھا گھر سے باہر کر دیا۔ کھانا نہ دیا کھڑے کھڑے نکال دیا اور ہم کو جو سنائیں وہ الگ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ اب جو زر دزرد اشرفیاں دیکھیں تو پیاری بیوی بن گئیں۔ خیر چلو بھائی تو بچ گئے۔ ہم برس چھ مہینے ٹک گئے تو سونے کی اینٹوں سے مکان بنوا لیجیے گا۔

بیوی: (قہقہہ لگا کر) اب آپ ہمارے مہمان ہیں آپ کو کیا کہوں آپ تو ہنسی ہنسی میں دو چار فقرے چست کر گئے مگر آپ کی ہنسی ہمارے سر آنکھوں پر۔

☆☆☆☆☆

خوجی سے ملاقات

اسی شہر میں ایک امیر عورت رہتی تھی ۔اس کی دو بیٹیاں تھیں حسن آرا اور سپہر آرا دونوں لڑکیاں بڑی خوبصورت ،پڑھی لکھی اور انتہائی شریف تھیں ۔بڑی لڑکی حسن آرا کے لیے اس کی ماں کو کسی اچھے رشتے کی تلاش تھی ۔اتفاق سے آزاد اس خاندان سے متعارف ہو جاتا ہے ۔سبھی آزاد کو بے حد پسند کرتے ہیں مگر حسن آراء باوجود آزاد کو پسند کرنے کے ،شادی کے لیے ایک شرط رکھ دیتی ہے ۔حسن آرا کہتی ہے کہ ان دنوں ترکی اور روس میں جنگ ہو رہی ہے مسلمانوں کو اس کڑے وقت میں مدد کی ضرورت ہے ۔آزاد ترکی جائیں اور روس کے خلاف ترکوں کے ساتھ مل کر لڑیں ۔جنگ کے بعد اگر آزاد فاتح بن کے لوٹے تو شادی ہو جائے گی ۔ آزاد ترکی جانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور وعدہ کر لیتے ہیں کہ پرسوں روانہ ہو جائیں گے آزاد واپس جا رہے تھے کہ ایک باغیچے میں چند لڑکیاں جھولا جھولتی نظر آئیں ۔آزاد ایسے خوش ہوئے کہ لڑکیوں کو جھولا جھلانے لگے ۔

اتنے میں آزاد کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پستہ قد ،چھوٹی گردن ،تنگ پیشانی والا آدمی کھڑا لڑکیوں کو گھور رہا ہے ۔آزاد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک چپت زناٹے سے جما ہی تو دی چپت کھاتے ہی وہ جھلا اٹھا اور گالیاں دے کر کہنے لگا

"نہ ہوتی ولائتی اس وقت ،میرے پاس ورنہ بھٹا سا سر اڑا دیتا اور جو کہیں جوان ہوتا تو اس وقت کھود کر دفن کر دیتا اور جو کہیں بھوکا ہوتا تو کچا ہی کھا جاتا ۔اور جو کہیں نشے کی طلب ہوتی تو گھول کر پی ہی جاتا ۔"

میاں آزاد نے نشے کا نام جو سنا تو چونکے۔ غور سے دیکھا تو سن سے جان نکل گئی یہ تو میاں خوجی تھے کون خوجی؟۔۔۔۔۔نواب صاحب کے مصاحب کون نواب؟۔۔۔۔۔وہی بٹیر باز۔۔۔۔۔۔۔کون بٹیر؟۔۔۔۔۔وہی صف شکن علی شاہ کون صف شکن علی شاہ۔۔۔۔۔وہی جن کی تلاش کو میاں آزاد نکلے۔ چار آنکھیں ہوتے ہی انہوں نے ان پر اور انہوں نے ان پر نظر ڈالی:

آزاد: ایں بھائی خوجی! اللہ اکبر برسوں کے بعد ملاقات ہوئی مزاج تو اچھا ہے؟

خوجی: جی ہاں مزاج تو اچھا ہے لیکن کھوپڑی بھنا رہی ہے واہ استاد بات کرتے ہی گال کاٹ لیا۔ آتے ہی وہ زناٹے کی چپت جمائی کہ تو بہ ہی بھلی بھلا آخر ہم نے تمہارا بگاڑا کیا تھا اف کھوپڑی کے پرخچے اڑ گئے نہ ہوئی قرولی

آزاد: بھائی معاف کرنا قصور ہوا معاف کرنا

خوجی: جی ہاں جوتیاں لگایئے اور کہیے معاف کرنا اور دل لگی، یہ کہ بیس بیس دفعہ معافی مانگتے ہیں اچھی مزاج پرسی کی کہ آتے ہی تڑ سے ایک دھول جمائی۔ وہ تو کہیے مجھے جلدی سے معلوم ہو گیا ورنہ اس وقت میں آپ کو جان سے مار ڈالتا۔۔۔لانا میری قرولی

آزاد: اس میں کیا شک ہے؟ کہیے آخر آپ آئے کہاں؟

خوجی: آپ ہی کی تلاش میں آئے تھے آپ نے ملتے ہی کھوپڑی سہلا دی

آزاد: نواب تو اچھے ہیں؟

خوجی: اجی وہ گئے چولہے میں یہاں سر بھنا رہے ہے، قف، لے اب چلو

تمہارے ساتھ چلیں، کچھ تو کھلاؤ یار اس وقت مارے بھوک کے بے دم ہوئے جا رہے ہیں۔

آزاد: چلیے آیئے بسم اللہ مگر واسطے خدا کے سچ کہنا کہیں ہماری گرفتاری کے لیے تو نہیں آئے ہو؟ بھائی تم ہرگز نہ جانے کے اب یہاں اور ہی دھن ہے۔

آزاد اور خوجی دونوں مل کر چلے تو کالی کالی گھٹا نے وہ لطف دکھایا کہ او ہو ہو ہو میاں آزاد نے اپنے دوست خوجی کو ایک کوٹھی میں لے گئے اور وہاں لے جا کر اسی شراب پلا دی کہ خوجی غین ہو گئے۔ تب میاں آزاد دم دے دے کر ان سے پوچھا کہ سچ بتاؤ کہ کہاں آئے ہو۔ خوجی اس وقت اپنے آپے میں نہ تھے۔ سب حال صاف صاف کہہ دیا کہ نواب نے بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ میاں آزاد جہاں ہوں وہاں سے لے آؤ آپ سے بہت ہی ناراض ہیں تین آدمی اور میرے ساتھ ہیں اب ہم آپ کو گرفتار کر کے لے جائیں گے۔

یہ سنتے ہی میاں آزاد کے کان کھڑے ہوئے اور وہاں سے بھاگے تو سیدھے میاں ظریف کے گھر پہنچے۔

☆☆☆☆☆

دوسرے روز آزاد حسن آراء سے ملنے کے بعد واپس ظریف کے ہاں پہنچے تو دیکھا کہ خوجی بھی موجود ہیں۔

بلا کہاں سے آئی اے لاحول بھئی اس نے تو بے طور پیچھا کیا ہے۔ مگر اس وقت پڑا رہنے دو پھر سمجھا جائے گا میاں آزاد پلنگ پر لیٹے مگر سونا حرام نیند نہیں آتی اتنے میں صبح ہو گئی میاں آزاد کو شوق چرایا کہ چلو حسن آراء سے ملو چلے تو بازار میں دو

شرابیوں کولڑتے جھگڑتے دیکھ کر کہا:

''خدائی خوار گدھے سوار تم دونوں پر شیطان کی پھٹکار خدا کی مار سر بازار تکرار اور مار دھاڑ ذرا تو دل میں شرماؤ مارے شرم کے زمین میں گڑ جاؤ۔''

ایک شرابی نے دوسرے کو چھوڑ کر آزاد کا پیچھا کیا۔ آزاد کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا اب سنیئے کہ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ میاں آزاد کی ٹوپی اچھال دی۔ میاں آزاد جھلائے اور وہ دونوں بھی طیش میں آئے۔ آزاد نے چپت لگائی۔ اور دھول جمائی ہات تیرے کی تڑ اور پھٹ دم اور کھٹ تڑاق اور پڑاق بازار میں بلڑ مچا ہوا تماشائی ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع اتنے میں غل جو ہوا تو میاں خوجی نشے سے چونک پڑے ظریف کی لونڈی نے کہا:

''میاں! ایسی نیند فوج کسی بھلے مانس کو آئے۔ آزاد سے باہر لڑائی ہو رہی ہے اور تم یہاں خراٹے لے رہے ہو۔''

اتنا سننا تھا کہ میاں خوجی آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے ادھر ادھر دیکھا تو سٹھ نہ ڈنڈا۔ انہوں نے جھپ سے چانڈو کی نگالی اٹھائی اور لپکے اور لپکتے ہی غل مچایا کہ:

''بے او گیدی! ٹھہر جا میں آن پہنچا؟''

شرابیوں نے جوان پر نظر ڈالی تو واہ جی واہ کیا قطع شریف ہے۔ ننھے سے آدمی ٹینی مرغ کے برابر قد اور یہ خم اور دم انہوں نے آزاد سے اپنے کو چھڑا کر ان کی خبر لی۔ جھلا کر خوجی نے نگالی اٹھائی۔ ایک نے نگالی چھینی اور لگا کھٹا کھٹ جمانے میاں ہی کی جوتی میاں ہی کا سر دوسرے نے کسی سے پوچھا نہ پاچھا جھپٹ کر میاں خوجی کو کاٹ کھایا۔ اتنے میں میاں آزاد نے چپکے سے اپنی راہ لی۔ خوجی

بچارے پٹ پٹا کر اٹھے کچومر نکل گیا مگر واہ رے خوجی پھر وہی خم و دم ہیں۔ ماشہ بھر کا قد شریف مگر اکڑے جاتے ہیں اور دونوں شرابیوں کو اس طرح گھور رہے ہیں جیسے کھا ہی جائیں گے لوگ حضرت کی قطع دیکھ دیکھ کر لوٹن کوبتر ہوئے جاتے ہیں۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں اب خوجی ہیں کہ دنیا بھر کو گالیاں دے رہے ہیں۔ آخر جھاڑ پونچھ کر چل دیے لونڈی نے کہا:

"واہ میاں گئے تھے پیٹنے اور الٹے پٹ کر آئے۔ اتنی پڑیں نے بھاؤ کی کہ کھوپڑی گنجی ہوگئی۔ چاند پر ایک بال تک نظر نہیں آتا۔"

خوجی بہت جھلائے اور آگ بھبھوکا ہو کر کہنے لگے کہ

"چپ رہ! تو ہمیں کیا جانے کھوپڑی گنجی کیسی یہ گنجی کھوپڑی کے کیا معنی آخر تو نے یہ کیا کہا؟ ہماری کھوپڑی پر بال تھے ہی کب؟ یہاں پیدائشی ہی ایسے بال ہیں اور صاف چاند تو اقبال مندوں کی نشانی ہے"

اس نے قہقہہ اڑا کر کہا کہ:

"اب ہٹو بھی آئے وہاں سے بڑے اقبال مند ہو کر واہ کیا اقبال ہے صورت سے تو پھٹکار برستی ہے اقبال والے بنے ہیں۔"

خوجی دانت پیس کر رہ گئے اور بولے کہ

"بس اب چلی جاؤ نہ ہوئی جوانی ورنہ کھود کر اسی جگہ دفنا دیتا۔"

(آزاد حسن آرا کے ہاں تھے گفتگو ہو رہی تھی آزاد کل ترکی روانہ ہونے والے تھے اس لیے آخری بار ملنے آئے تھے کہ)

اتنے میں میاں خوجی لڑھکتے پڑھکتے پتا پوچھتے ہوئے، آن موجود ہوئے

(دربان سے)

خوجی: میاں ہوت! ذرا آزاد کو تو بلاؤ

دربان: کس سے کہتے ہو آئے کہاں سے جاؤ گے کہاں ہو کون؟

خوجی: ایں یہ تو کوئی تقریر یا سا معلوم ہوتا ہے ابے اطلاع کر دے کہ خواجہ صاحب آئے ہیں۔

دربان: ہونہہ خواجہ صاحب ہمیں تو جولا ہے سے معلوم ہوتے ہو بھلے مانسوں کی ایسی ہی صورت ہوا کرتی ہے

خوجی: اور نہیں تو پھر کیسی ہوا کرتی ہے

یہ تقریر میاں آزاد نے سنی تو خوجی کو پردے کے پاس بلالیا

خوجی: اجی ایک ذرا آئینہ تو بھیج دینا آئینہ بھیجے گا ذری

آزاد: یا وحشت! یہ آئینہ کیا ہو گا؟ بندگی نہ سلام نہ مزاج پرسی نہ کچھ بات چیت، آتے ہی آئینہ یاد آیا بندر کے ہاتھ میں بھلا آئینہ کون دے گا۔

خوجی: اجی بھیجتے ہو یا دل لگی کرتے ہو۔ دربان سے اس وقت ہمارا جھگڑا ہو گیا۔ مردود کہتا ہے تمہاری صورت بھلے مانسوں کی سی نہیں۔ اب کوئی اس گیدی گدھے سے پوچھے تو کہ پھر کیا چمار کی سی ہے یا پاجی کی سی ذرا آئینہ بھیجئے میں دیکھوں تو مجھے خود شک ہو گیا۔

یہ فقرہ جو سنا تو حسن آرا اور سپہر آرا کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اور آزاد سے کہا: ”کون جانگلو ہیں؟“

آزاد: بھئی اگر سچ پوچھتے ہو تو صاف صاف یوں ہے کہ تمہاری صورت سے

ایک طرح کا پاجی پن برستا ہے۔خدا چاہے پاجی بنائے، مگر پاجی کی صورت نہ بنائے مگراب اس کا علاج کیا؟

خوجی: واہ اس کا کچھ علاج ہی نہیں آپ کے پاس ڈاکٹروں نے مردے تک کو زندہ کرنے کا بندوبست کرلیا۔آپ فرماتے ہیں کہ علاج ہی نہیں دیکھیے ہم بتادیں گے صورت ہی بدلنی ہے پھر یہ کتنی بڑی بات ہے؟

آزاد: کہیں ایسا نہ ہو کہ اینڈا بینڈا علاج ہو اور منہ ہی بگڑ جائے اس سے تو پاجی ہی بنا رہنا اچھا ہے۔

خوجی: نہ صاحب! پاجی نہیں بنیں گے پاجی بن کے جیے تو کیا؟

آزاد: کل ہم ترکی جانے والے ہیں چلتے ہو ساتھ

خوجی: جو نہ چلے اس پر بھی لعنت جو نہ لے چلے اس پر بھی (خم ٹھونک کر) ہم خوش ہمارا خدا خوش۔

آزاد: مگر وہاں چانڈو نہ ملے گا، اتنا یاد رکھیے

خوجی: جی افیم ملے گی کہ وہ بھی نہ ملے گی بس تو پھر ہم اپنے چانڈو بنالیں گے آپ ہماری فکر نہ کیجیے ہمیں ضرور لے چلیے بالضرور لے چلیے

آزاد: اب آپ میاں ظریف کے ہاں جائیے اور ان سے کہیے، کہ ہم ابھی آتے ہیں۔آج ہی سفر کا ارادہ ہے۔سب سامان درست کر رکھیں ہم پہنچے کھانا کھایا اور لمبے ہوئے۔

خوجی ظریف کے گھر جو وہاں سے ڈیڑھ میل تھا۔سوا تین گھنٹے میں پہنچے اور پہنچتے ہی غل مچانا شروع کیا کہ جلدی تیاری کرو۔میاں آزاد ابھی ابھی جانے

والے ہیں اورانہوں نے کہا ہے کہ ایک پانچ سیر میٹھے ٹکڑے تین سیر والے چاول کا پلاؤ۔اور دس سیر فیرنی اور دس ہی سیر کھیر اور کوئی چودہ سیر زردہ اور کوئی پانچ سیر مربہ اور میٹھے اچار کی دو اچاریاں یہ سب سامان جلد تیار ہو رہے ۔۔واہ بھئی واہ خوجی کیوں نہ ہو کہی بھی تو اپنے ہی مطلب کی افیونی آدمی سب میٹھی ہی میٹھی چیزیں بتائیں اور طرہ یہ ہے کہ دس سیر اور پانچ سیر سے کوئی کم نہیں خیر میاں ظریف کی بیوی تو کھانے پکانے میں طاق تھیں اور گھر لونڈیاں بھی بجلی تھیں۔ جلدی جلدی سب انتظام کرلیا اور ہاتھوں ہاتھ سامان ہوا

(اتنے میں آزاد بھی آگئے)

ظریف: کہیے اب تو رخصت ہے بھئی کھانا تیار ہے، کہیے تو نکلوایا جائے برف بھی منگوارکھی ہے

آزاد: کھانا اس وقت ہم نہ کھائیں گے بھوک بالکل نہیں

ظریف: ایں کیا خوب پھر اتنا پکوایا کیوں؟ اجی دونوالے تو کھالو

آزاد: پکوایا کس نے؟ مجھے تو صبح سے کھٹی ڈکاریں آرہی ہیں یہ آپ سے کہا کس نے تھا کہ آپ کھانا پکوائیں

ظریف: اور سنیے گا کہا کس نے کی ایک ہی کہی کہا آپ کے خوجی نے اور کس نے؟ بولو میاں خوجی دس سیر فیرنی اور دس ہی سیر کھیر اور اٹھارہ سیر میٹھے ٹکڑے اور خدا جانے کیاالم غلم بتا گئے۔گھر میں بڑے اہتمام سے سب سامان تیار کیا۔اب دو چار نوالے تو آپ کو ان کی خاطر سے ضرور کھانے چاہئیں۔

آزاد: لاحول ولاقوت خوجی بھی لالچی ہی رہے

خوجی: لاحول کا ہے کی آخر لاحول کے کیا معنی آپ نہ کھایئے بندہ تو ڈٹ کے کھا چکا

آزاد: کیا یہ کھانا کھا چکے

خوجی: جی نہیں تو کیا آپ کی طرح بیوقوف ہیں اور سب میٹھی میٹھی چیزیں پکوائیں آج افیم بھی معمول سے زیادہ ہی پی خوب چسکی لگائی اور مطنجن پر ہتھے لگائے۔

آزاد: بس اب پھر بوریا بستر اٹھایئے چلیے بسم اللہ کر کے لدیے پھندے

خوجی: قبلہ اب تو اس وقت حال یہ ہے جیسے چوہے کو کوئی پارہ پلا دے چلنا چلانا مشکل اور سواری کیا ہے؟

ظریف: یکہ

خوجی: ارے غضب خدا کا تو بندہ جا چکا۔ یکے پر تو آج تک کبھی سوار ہی نہ ہوئے۔ اور پھر کھانا کھا کے ارے تو بہ مر ہی جاؤں گا بھئی! ذرا سا پانی پلانا۔ یار افیمی تو بہت سے دیکھے مگر سچ کہنا ایسا بھی کوئی دیکھا جو نشے کا نام بھی نہ جانتا ہو۔

غرض میاں آزاد نے جھٹ پٹ کھانا کھایا اور اسباب کس کر آمادہ سفر ہوئے خوجی کو بھی لات جمائی کہ اٹھنا معقول! بس اب سونا وونا ہو چکا۔

قہر درویش بر جان درویش اٹھے۔ باہر جا کر دیکھتے ہیں تو ایک گھوڑی دوسرا ٹٹو۔ آزاد میاں ظریف کی بیوی سے رخصت ہوئے

"آداب بجا لاتا ہوں بھابی صاحبہ بھول نہ جایئے گا، بھائی تو ایک بھولکڑ آدمی ہیں آپ نظر عنایت رکھیے گا آپ کا کھانا عمر بھر نہ بھولوں گا۔"

انہوں نے بہت ہی افسوس کیا اور کہا کہ

''بھائی تمہارے سبب سے دو گھڑی غم غلط ہوتا تھا۔ اور تمہارے بھائی تو جیسے ہیں ویسے ہیں مگر خیر اب منزل کھوٹی ہوتی ہے امام ضامن کو سونپا، خدا کرے جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو، اسی طرح منہ بھی دکھاؤ۔''

آزاد نے کہا:

''بندگی آپ گھبرائیں نہیں، میں برس بھر کے اندر ہی اندر قدم بوسی کروں گا یہ کہہ کر میاں آزاد باہر گئے اور رٹ سے گھوڑی کی پیٹھ پر تھے۔''

اب سنیے کہ میاں خوجی نے اپنے مریل ٹٹو کو دیکھا تو لگے دوہتڑ پیٹنے یارو واسطہ خدا کا ہمیں بچا لو بھئی ہم ایسے جانے سے درگزرے۔ بلی بخشیے چوہا لنڈورا ہی جیے گا۔ آخر کار لوگوں نے للکارا کہ بیوقوف ہوا ہے مرا کیوں جاتا ہے۔

اب یہ چاہتے ہیں کہ سوار ہو جائیں لیکن یار لوگ ڈراتے ہیں کہ دیکھ دیکھ وہ دولتی جھاڑی وہ کاٹنے دوڑا وہ منہ کھول کر لپکا وہ دبوچا حالانکہ ٹٹو کھڑا ہے۔ کان تک نہیں ہلاتا ایک ہی دفعہ آنکھ بند کر کے حضرت نے چاہا کہ لد لیں مگر یاروں نے تالیاں جو بجائیں تو ٹٹو بھاگا اور میاں خوجی بھد سے زمین پر

''اف دیکھا! کہتے تھے نا کہ ہم اس ٹٹو پر نہ سوار ہوں گے مگر حضرت ذات شریف نے دو گھڑی دل لگی دیکھنے کے لیے ہم کو الو بنایا۔ کچومر ہی نکل گیا۔ ہڈی پسلی بچ گئی ورنہ چرمر ہی ہو جاتے۔ خیر دو آدمیوں نے ان کو اٹھایا اور لاد کر گھوڑے کی پیٹھ پر رکھ دیا۔ لگام انہوں نے پکڑی ہی تھی کہ ایک بگڑے دل نے چابک جمایا اور ٹٹو دم دبا کر بھاگا۔ اور میاں خوجی نے غل مچایا''

"مرا مرا گرا گرا یا علی مشکل کشا مشکل کشائی کیجئے" را را دوں دھم۔۔۔۔۔۔وہ میاں خوجی لڑھک گئے تب تو میاں آزاد نے گھوڑی بڑھائی اور میاں ظریف سے رخصت ہو کر خوجی کی مدد کو چلے۔ان کو جو تماشائیوں نے دیکھا تو کھسکے اور خوجی ٹٹو پر لدے ہوئے آہستہ آہستہ چلے۔

خوجی: اب کیا ترکی تک اسی ٹٹو ہی پر جانا ہوگا؟

آزاد: جی اور نہیں تو کیا۔۔۔۔۔۔۔اور کیا آپ کے واسطے اڑن کھٹولا آئے گا۔

خوجی: بندہ رخصت ہوتا ہے

آزاد: بندہ ایک تھپڑ دیتا ہے

خوجی: بھلا اس ٹٹو پر کون جائے گا بھئی ہمیں آزاد کرو ہم درگزرے

آزاد: ارے بیوقوف لکھنو تک یوں ہی چلنا ہوگا وہاں سے پھر ریل ہے بمبئی تک ریل پر جائیں گے اور وہاں سے جہاز

خوجی: (غل مچا کر) کیا! جہاز؟۔۔۔۔۔اف میرے مولا۔۔۔پانی کا سفر ہو کس سے سکے گا اور وہاں افیون کہاں ملے گی مرے بے موت بھائی ہمیں آزاد کرو

آزاد: بس چلے چلو

☆☆☆☆☆

خوجی کی پٹائی

میاں آزاد اور ان کے لنگوٹیے یار میاں خوجی گھوڑوں کی باگ اٹھائے چلے جاتے تھے میاں خوجی کی ٹٹوی بھی گرمائی تو آزاد کی گھوڑی سے دس پانچ ہی قدم پیچھے رہنے لگی۔ چلتے چلتے شام کے وقت ایک گاؤں نظر آیا۔ میاں آزاد نے کہا کہ یہیں بستر جماؤ۔ آج یہاں پڑاؤ ہو۔ کل دن سے لکھنو داخل ہو جائیں گے۔

رات بھر وہاں رہے۔ صبح پھر چلے تو کوئی تین ہی چار کوس گئے ہوں گے کہ میاں خوجی ادہر کے کھیت میں گئے اور ٹٹوی کو راہ خدا پر چھوڑ دیا کہ جہاں جی چاہے آزادی سے چرے۔ ٹٹوی دیکھنے میں تو دبلی پتلی تھی صورت حرام مگر انتہا کی شریر یہ تو ادہر کے کھیت میں ہو رہے وہ سیدھی چل کے بوٹ کے کھیت میں پہنچی اور لگی چرنے

اتنے میں کسان نے جو دیکھا تو لٹھ لے کر دوڑا اور لگا، برا بھلا کہنے اس کی جورو (بیوی) بھی چمک کر لپکی اور کوسنا شروع کیا کہ پلویا (گھوڑی) مرے پلویا کے کیڑے پڑیں ابھی ابھی پیٹ پھٹے اور کسان نے گالیاں دیں کہ ارے یو ٹٹو کس سار کے آئے۔ (یہ ٹٹو کس کا ہے) میاں خوجی جو باہر نکلے تو دیکھا کہ ٹٹوی بھاگی جاتی ہے اور پیچھے پیچھے کسان کی جورو غل مچاتی ہے اور کسان لٹھ لیے ہوئے چلا آتا ہے اس نے گدے لٹھ جمایا اور پھر تان کر دوسرا دیا اور پھر تیسرا چکھانے ہی کو تھا کہ میاں خوجی نے لکارا

”اوگیدی اے اوگیدی! خبردار اس حرکت ناشائستہ سے باز آ ورنہ کھوپڑی پر

ایک بال باقی نہ رہے گا اور جوتے کی ضرب سے بوکھلا جائے گا"

وہ گنوار بلکہ گنوار کا لٹھ عربی ترکی پڑھا نہ تھا۔ اس پر جھلا کر جھپٹ پڑا اور اتنے لٹھ رسید کیے کہ ٹٹوے کے پنجر بگڑ گئے۔ میاں خوجی میں ایک وصف تھا کہ بے سوچے سمجھے، بے دیکھے بھالے لڑ پڑتے تھے۔ چاہے اپنے سے دوگنا چوگنا ہو یہ چمٹ ہی جائیں گے۔ غصہ کی یہ خاصیت ہے کہ جب آتا ہے کمزور پر۔ مگر میاں خوجی کا غصہ بھی نرالا تھا۔ ان کو جب غصہ آتا تھا تو شہ زور پر جوان کو اٹھا کر پھینکے تو اٹھارہ لڑھکیاں کھائیں چاہے کچومر نکل جائے۔

دوسرا وصف یہ تھا کہ پٹ پٹا کر جھاڑ پونچھ کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے مگر ممکن کیا کہ ذرا اف کریں وہی تیور، وہی خم ودم کسان نے اتنی بڑی گستاخی ان کے حضور میں کی کہ ان کی ٹٹوی کو ان کے سامنے اتنا مارا کہ اس کا بھرکس ہی نکل گیا۔ پھر بھلا، ان کو تاب کیسے لوٹا پھینکا اور تڑ سے دوڑ کر کسان سے گتھ گئے۔ وہ گنوار آدمی اور انتہا کا کرار یہ منحنی، دبلے پتلے مہین آدمی، ہوا کے جھونکے میں اڑ جائیں۔ اس نے ان کی گردن دبوچی، اور گد سے زمین پر پھینکا۔ پھر چھٹنے کی کوشش کی تو کسان کی جورو ان سے چمٹ گئی اور لگی ہاتھا پائی ہونے اس نے ایک گھونسا جمایا اور ان کے پٹے پکڑ کر پھینکا تو چاروں شانے چت دو تھپڑ رسید کیے ایک ادھر ایک ادھر اور کسان کھڑا ہنس رہا ہے کہ

"مہر روا سے جیت پاوت ناہیں یو مسٹنڈوں سے کا لڑ یے لے بھلا (عورت سے جیت پاتے نہیں تم مردوں سے بھلا کیا لڑو گے؟)"

کسان کی جورو تو ٹھونک ٹھانک اور پیٹ پاٹ کر چل دی آپ نے پکارنا

شروع کردیا:

"قسم بابا جان کی جو کہیں چھرا پاس ہوتا تو ان دونوں کی لاش اس وقت پھڑکتی ہوتی وہ تو کہیے خدا کو اچھا کرنا منظور تھا کہ میں اپنے زور میں آپ گر گیا۔ ورنہ اتنی قرولیاں بھونکتا کہ عمر بھر یاد کرتے۔ بات تیرے کی نابکار لعین کھڑا تو رہ او گیدی دوزخی"

اس پر گاؤں والوں نے خوب قہقہہ اڑایا اور اتنا بنایا کہ میاں خوجی جھلا کر سب کو گالیاں دینے لگے۔

"او گیدی! تم سب پر میں اکیلا بھاری ہوں۔ پرے کے پرے صاف کر دوں۔ وہ تو کہیے چھری نہ ہوئی۔ اس سے خیریت ہے۔"

ایک نے پوچھا کہ:

"کیوں میاں صاحب! چھری ہوتی تو کیا بھونک کر مر جاتے، یا اپنے پیٹ میں لگاتے آخر نتیجہ کیا ہوتا؟" اس پر میاں خوجی اور بھی آگ بھبھوکا ہو گئے۔

میاں آزاد کوئی دو گولی کے ٹپے پر نکل گئے تھے۔ جب خوجی کو ساتھ نہ دیکھا تو حیرت ہوئی کہ ایں! یہ کہاں رہ گئے ایک مسافر سے پوچھا کہ کیوں جی پیچھے کوئی شخص ٹٹو پر سوار آتا دیکھا؟ اس نے کہا

"جی ہاں ایک کسان سے لڑائی ہو رہی تھی اور اس کی جورو (بیوی) نے ان کو خوب مارا وہ کھیت میں پڑے قرولی ڈھونڈ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرولی ہوتی تو مار ہی ڈالتا"

میاں آزاد نے گھوڑی پھیری اور دم کے دم میں ہوا ہو گئے تو کھٹ سے اس

کھیت میں داخل

آزاد: اے میاں خوجی! خیریت تو ہے آخر یہ ماجرا کیا ہے یہ یہاں کھیت میں پڑے رہنے کا سبب کیا؟ چلو اٹھو گرد جھاڑو آخر کب تک پڑے رہو گے۔

خوجی: قرولی نہ ہوئی پاس ورنہ اس وقت دو لاشیں یہاں پھڑکتی ہوئی دیکھتے۔

آزاد: اجی وہ تو جب دیکھتے تب دیکھتے اس وقت تو تمہاری لاتھ (لاش دیکھ رہے ہیں)

پھر تو تھمبو کر کے اٹھایا اور گھوڑی پر سوار کرایا چلے تو تھوڑی دور تک میاں آزاد کا ساتھ رہا پھر کوئی ایک کھیت کا فاصلہ ہو گیا۔ خوجی سے ایک پٹھان نے پوچھا

''کیوں شیخ جی آپ کہاں رہتے ہیں؟''

حضرت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے ایک کوڑا چکھایا اور کہا کہ

''ابے ہم شیخ نہیں خواجہ ہیں''

وہ شخص غصے سے آگ بھبوکا ہو گیا اور ٹانگ پکڑ کر گھسیٹا تو خوجی کھٹ سے زمین پر چاہا کہ گلا گھونٹ کر مار ڈالے مگر رحم آیا اور چھوڑ دیا کہ مفت کا خون کون اپنی گردن پر لے۔ اب ان کی سنیے کہ ٹٹوی سے گر کر چاروں شانے چت پڑے ہیں۔ آزاد نے جو پیچھے پھر کر دیکھا تو ٹٹوی چلی آتی ہے مگر خواجہ ندارد سمجھے کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے پلٹے کہ دیکھیں اب کیا واقعہ ہوا

خوجی ٹٹوی پر سے گر کر حسب معمول غل مچانے لگے کہ ''نہ ہوئی قرولی ورنہ اتنی بھونکتا کہ یاد ہی کرتا عمر بھر''

آزاد نے آ کر دیکھا کہ پھر اسی طرح زمین پر پڑے ہوئے قرولی کی تلاش

میں ہیں۔

آزاد: اے پھٹکار شرم نہیں آئی کمزور مار کھانے کی نشانی بدن میں سکت نہیں تو پھڑ کتے کیوں مرتے ہو مفت میں جوتیاں کھانا کون سی جوانمردی ہے۔

خوجی: واللہ آزاد جو قرولی کہیں آس پاس ہو تو بدن چھلنی کر ڈالوں دم تو نہ لینے دوں مگر چلیے خیر گذری ورنہ اس وقت گیدی کے کفن دفن کی فکر پڑتی۔

آزاد: چلو اب اٹھو اٹھو گے بھی یا پرسوں تک یہاں ہی پڑے رہو گے یار تم نے تو اچھا ناک میں دم کر دیا۔ اب یار اسی کے ہو رہے کہ تم کو ڈھونڈنے نکلیں

خوجی: اجی ہم نہ اٹھیں گے تاوقتیکہ قرولی نہ لا دو بس اب بنا قرولی کے نہ بنے گی

آزاد: (دھپ لگا کر) بس اب بیہودہ بہ نکو اٹھو ورنہ ایک لات جماؤں گا

غرض میاں آزاد اور میاں خوجی پھر راہ راہ چلے

☆☆☆☆☆

آزاد کی بیماری

میاں آزاد آج کچھ تھکے بہت ہیں۔ خدا جانے کیا سبب ہوا طبیعت ہی تو ہے میاں خوجی جانڈو پینے، گپ اڑانے، خوشامد کرنے کے عادی ان کو یہ بات کہاں کہ منزلوں ٹٹو پر جائیں۔ سفر کی مصیبت کون سہے دو دن جو منزلوں چلنا پڑا تو گھبرا گئے اور پڑے اتنے کہ بھرکس نکل گیا بند بند درد کرتا ہے عضو عضو ٹوٹ رہا ہے میاں آزاد اور خوجی دونوں باتیں کرتے ہوئے جا رہے ہیں

آزاد: آج طبیعت بے حد خراب ہے انتہا کی بے لطف

خوجی: یہاں جوڑ جوڑ میں درد ہے اور تو خیر لڑائی ہوئی ہے مگر اس کسان کی مسٹنڈی عورت نے واللہ کچومر ہی نکال ڈالا۔ مگر قسم ہے خدائے پاک کی جو بھی کہیں چھری یا قرولی پاس ہوتی تو غضب ہی بپا ہو جاتا۔ ایک تو جیتا چھوڑتا نہیں۔

آزاد: خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا۔ قرولی کی تو آپ کو ہمیشہ ہی تلاش رہی مگر جب آئے پٹ ہی کے آئے۔ جوتیاں ہی کھائیں بس انتہا کی بے حیائی ہے مرد خدا ذرا تو دل میں شرما۔۔۔۔ بے شرمی بھی کتنی کچھ ٹھکانا ہے خیر یہ دکھڑا کوئی کہاں تک روئے یہ تو بتاؤ کہ آخر اب ہم کریں کیا؟ طبیعت بے حد بے لطف ہے اور جی متلا تاہ۔ بند بند ٹوٹ رہا ہے۔ آنکھیں بھی جلتی ہیں اور دل کی حالت بیان نہیں ہو سکتی۔

خوجی: پیش خیمہ آ گیا استاد بس آ گیا اب حضرت بھی کوئی دم کے دم میں آ دھمکیں گے

آزاد: کیا؟ پیش خیمہ کیسا؟ اور حضرت کون میں کچھ سمجھا نہیں ذرا بتاؤ تو

خوجی: ابھی صاجز ادے ہیں نا آپ اجی آئے گا کون بخار پیش خیمہ یہی اعضا کا دکھنا، آنکھوں کا جانا کلیجے کی دھڑکن ہے اس وقت گھوڑے پر سوار ہو کر منزل چلنا بے حد نقصان دہ ہے تم ابھی صاجزادے ہو یہ کیا جانو ہم خرانٹ ہو گئے ہیں اب آپ گھوڑے پر سے اتر پڑے اور کسی گاؤں میں چل کر لیٹ رہیے ورنہ طبیعت اور بھی بےلطف ہو جائے گی۔

اب کہنا مانیے بیماری کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ یہ بھی کوئی ہنسی ٹھٹھا مقرر کیا ہے آپ نے کہا؟

آزاد: پھر بھئی اتر کہاں پڑوں کوئی گاؤں نظر بھی آئے، یار اب طبیعت میں بے چینی اور بھی بڑھتی جا رہی ہے اور نا کوں دم آ گیا اف بدن بھر پھونک دیا۔

خوجی: بخار آ گیا ذرا گھوڑی کو روک لیجئے گا (ٹٹو ی پر سے اتر کر) ذرا ہاتھ لائیے۔ نبض تو دیکھوں اف اوہ بڑی حرارت ہے ماتھا جل رہا ہے مگر پاؤں بالکل سرد ہیں خدا کرے کوئی گاؤں ملے تو وہاں ہم اور آپ اتر پڑیں۔ لاحول ولا قوت اس چٹیل میدان میں بخار کا آنا کیا ستم کی بات ہے اب اگر اگر پڑیے تو ٹکیے کہاں؟ اور نہ اتریے تو گھوڑی پر سوار ہو کر منزل بمنزل جانا بھی غضب کا سامنا ہے مگر خیر جس طرح جلد ممکن ہو جھٹ پٹ چلیے ہی چلیے ورنہ بڑی دقت ہو گی انتہا کی پریشانی ہے۔

آزاد: چکر آنے لگے (گھوڑی روک کر) میں تو اب اترا پڑتا ہوں حضرت اف دل کی عجب ہی کیفیت ہے کہاں جاؤں؟ کس سے کہوں

خوجی: ذرا صبر کیجئے اب اس وقت سوائے اس کے کیا چارہ ہے کہ کہیں چل کر آرام کیجئے اور کچھ دوا دارو ہو یہاں میدان میں تو کچھ خاک نہیں ہو سکتا۔

آزاد: کسی سے پوچھے کہ گاؤں کتنی دور ہے خدا کرے پاس ہو ورنہ میں یہاں گر پڑوں گا اور قبر بھی یہاں ہی بنے گی

خوجی: ہائیں بھئی ذرا تو استقلال لازم ہے آدمی اتنا کوئی گھبراتا ہے اور آپ تو اچھے خاصے سمجھدار ہیں قبر کیسی اور تربت کے کیا معنی؟ (ایک مسافر سے) کیوں میاں مسافر یہاں سے بستی کتنی دور ہے۔کوئی گاؤں بھی رستے میں پڑتا ہے یا نہیں

مسافر: یہاں سے؟ یہاں سے کوئی دیکھیے وہ کوئی ڈیڑھ کوس، کوس بھر پر ایک گاؤں ہے، کمولا وہ سامنے باغ سوجھتا ہے! ان درختوں کی آڑ میں سامنے سیدھ میں

خوجی: لو بھئی مار لیا ہے کوس بھر پر بستی ہے بس کچا کوس ایک ذرا دل کو ڈھارس دیجئے اور آپ گھبراتے کیوں ہیں

آزاد: اور سنیے کہنے لگے گھبراتے کیوں ہیں میرا تو برا حال ہے یہ پوچھتے ہیں کہ گھبراتے کیوں ہیں گھبرائیں نہ تو کریں کیا دل بے قرار ہے ہم تو لاکھ چاہتے ہیں صبر کریں مگر دل بھی مانے طبیعت کا تو کچھ عجب حال ہے اف واللہ پھنکا جاتا ہوں اور بدن سے شعلے نکل رہے ہیں یا خدا کس مصیبت میں پڑ گیا کہ جی ٹھکانے نہیں مگر جس طرح ہو چلنا ضرور چاہیے وہاں تک پہنچ جاؤں کسی طرح سے بس پھر سمجھا جائے گا ذرا کمر تو سیدھی کروں

خوجی: چلو خدا کا نام لے کر اب سامنے ہی ہے اور جو کہتا مانو تو ذرا گھوڑی کو تیز

کر دو دم کے دم میں داخل نہ ہو جاؤ تو ہی بس پھر مزے سے لیٹنا

آزاد نے گھوڑ کو ذرا تیز کیا تو وہ اڑ گئی یہ جا وہ جا میاں خوجی نے بھی کوڑے پر کوڑا جمانا شروع کیا شڑاپ شڑاپ ٹخ ٹخ ٹخ ٹخ ٹٹو ی بھی بے دم ہو کر چلی مگر پھر لدو ٹٹو ی ہی تو تھی کہاں تک جاتی۔ وہ گھوڑی کوئی چار سو روپیہ کی اور پھر جوان یہ بڑھیا لاکھ دوڑی لیکن وہ ہوا ہی ہوگئی۔ میاں خوجی نے جھلا کر جو ایک ایڑی دی تو ٹٹو ی بگڑ کھڑی ہوئی۔ اور جھپٹی تو میاں خوجی سنبھل نہ سکے۔ ران کا جمنا مشکل ہو گیا اور دھڑ سے زمین پر آ رہے۔ بڑے ہی خفا کہ ہات تیری ٹٹو ی کی دم میں رسا نہ ہوئی قرولی اس وقت میرے پاس ورنہ اتنی بھونکتا کہ بلبلا نے لگتی اتنے میں ٹٹو ی نے چاہا کہ سپاٹو کی ہوا کھائے تو حضرت نے للکارا کہ:

''اوگیدی اوگیدی سنبھل میں آ پہنچا'' سوچے کہ اگر آج بھی سڑک پر لیٹا رہا تو آزاد واپس آنے سے رہے اٹھ کھڑے ہوئے اور اٹھتے ہی ٹٹو ی کو پکڑا اور لد کر چلے تو پیچھے دو چار دل لگی باز آدمیوں نے تالیاں بجائیں اور کہنا شروع کیا کہ

''لینا لینا، جانے نہ پائے''

خوجی بد دماغ ہو گئے اور للکار کر کہنے لگے کہ ''اوگیدی ابھی قرولی ہاتھ میں ہوتی تو پرے کے پرے صاف کر دیے ہوتے گستاخ نا معقول بے ادب''

ان لوگوں نے قہقہہ لگایا اور کہا

''میاں بگڑتے کیوں ہو کہو تو تم اور تمہاری ٹٹو ی دونوں کو اٹھا کر پہنچا دیں۔''

خوجی کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا۔ کبوتر کے خون کی سی سرخ ہو گئیں کہنے لگے کہ

''ٹٹو ی کیسی ،عراقی نہیں کہتے ہٹو سامنے سے نہیں تو ہنٹر جماتا ہوں واہ مجھے بھی کوئی ایسا ویسا سمجھے ہو نہیں جانتے ہیں میں سپاہی آدمی ہوں۔شاہی میں دو دو ولاتیاں کمر سے لگی رہتی تھیں اب لاکھ کمزور ہو گیا ہوں تو کیا لیکن اب بھی تم سے پچاس سے اچھا ہوں۔''

لوگوں نے خوب قہقہے اڑائے ، جی ہاں پیرو مرشد! سچ ہے آپ ایسے ہی جوانمرد ہیں ایسے آدمی ہوتے کہاں ہیں واہ پہلوان اور آپ کے ڈنڈیل کہے دیتے ہیں کہ آپ سپاہی اور پہلوان ہیں لاحول ولاقوۃ

لاحول کا کہنا تھا کہ میاں خوجی اور بھی بگڑے

''لاحول! یہ لاحول کیا؟ آخر یہ لاحول کے معنی کیا اب میں اتروں پھر آؤں''

انہوں نے کہا:''نا صاحب ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا کہیں مار ڈالیے آن کر تو اور بھی قتم ہو جائے۔آپ ٹھہرے پہلوان اور اس طرہ یہ کہ سپاہی آدمی''

غرض میاں خوجی گرتے پڑتے پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میاں آزاد گھوڑی پر کھڑے ہیں اور سامنے سرا کا دروازہ ہے لیکن چہرے پر کمزوری پائی جاتی ہے اور انتہا کی وحشت برستی ہے ٹٹوی پر سے اتر کر میاں خوجی نے پوچھا کہ

خوجی: آیئے سرا میں تشریف لے چلئے

آزاد: بھائی تم جا کر کوٹھری ووٹھری تو ٹھہراؤ میں ابھی آیا کچھ دیر تھوڑا ہی لگے گی لیکن کوٹھری صاف ہو اور بھٹیاری جس میں کام اچھا کرے۔میں اب بہت کمزور ہو گیا ہوں۔

خوجی سرا میں جا کر کوٹھریاں دیکھنے لگے سرا بھر کے چکر لگائے لیکن کوئی کوٹھری

پسند نہیں آئی ۔بھٹیاریاں پکار رہی ہیں کہ "میاں ادھر آؤ ادھر دیکھو خاصی صاف ستھری کوٹھری ہے ٹٹو باندھنے کی جگہ الگ"

اتنا کہنا تھا کہ میاں خوجی آگ ہو گئے ٹٹوی پھیر کر کہا کہ "کیا؟ پھر تو کہنا ٹٹوی ہشت"

اور جب ان سب نے مل کر خوب بنایا تو چھری قرولی کی تلاش ہوئی اس پھر سرا بھر کی بھٹیاریاں تالیاں بجا کر بنانے لگیں تب تو میاں خوجی چکرائے کہ تو بہ ہی بھلی اتنے دق ہوئے کہ سرا کے باہر نکل آئے باہر جو آئے تو آزاد نے پوچھا کہ کہو جگہ ہوئی تو آپ فرماتے کیا ہیں کہ

"نہ بھئی چلو آگے کے گاؤں میں رہیں گے یہاں سب کے سب شریر ہیں ۔"

آزاد: ارے کم بخت وہ شریر ہوں یا نیک اس سے کیا واسطہ یہاں جان پر بن آئی ہے آپ کو دل لگی ہاتھ آئی ہے واسطے خدا کے کوئی کوٹھری تجویز کرو یا میں خود جاتا ہوں

یہ کہہ کر میاں آزاد نے گھوڑی کو تیز کیا اور بات کرتے سرا میں داخل ہوئے ادھر ادھر گھوم کر ایک کوٹھری تجویز کی اور اتر پڑے ۔میاں خوجی نے بھی ٹٹوی پر سے زین پوش اتارا اور بستر جمایا اب سنئے کہ سائیس پیچھے رہ گئے تھے میاں خوجی کو اپنے ہی ہاتھ سے سب کچھ کرنا پڑا ۔لید بھی اٹھائی اور گوڑیاں بھی باندھیں اور گھانس بھی خرید لائے ۔سرا والے سمجھے کہ یہ سائیس ہے۔

بھٹیارا: او سائیس بھیا ذرا گھوڑی کو ادھر باندھو

خوجی: (گردھن پھیر کر) کس سے کہتا ہے بے ابے سائیس کون ہے؟

بھٹیارا: پھر اور ہو کون؟

بھٹیاری: اے تو ٹنکتے کیوں ہو میاں سائیس نہیں تو جیب کترے سہی

آزاد: یہ کیا بے ہودہ تقریر ہے یہ ہمارے دوست ہیں یا سائیس؟

بھٹیاری: سچ دوست ہیں؟ صورت بھلے مانسوں کی سی نہیں

خوجی: آزاد! یار اب ذرا آئینہ تو نکال دینا نہیں واللہ کئی آدمی کہہ چکے ہیں مجھے کئی بار اپنے شریف ہونے کا خود شک ہو گیا آج میں ضرور دیکھوں گا بالضرور دیکھوں گا آخر یہ وجہ کیا ہے کہ جو دیکھتا ہے یہی کہتا ہے

آزاد: چلو واہیات نہ بکواف میرا تو برا حال ہے بھئی بھٹیاری نے چارپائی بچھا دی اور میاں آزاد لیٹے تو بخار کی وہ شدت کہ توبہ آنکھیں جل رہی ہیں اور بے چینی اور بے قراری بڑھتی جاتی ہے۔

خوجی: اب طبیعت کیسی ہے؟

آزاد: مر رہا ہوں

خوجی: الحمدللہ

آزاد: خدا کی مار تجھ پر دل لگی کا بھی کیا بھونڈا وقت ہاتھ آیا ہے جی چاہتا ہے اس وقت زہر کھا لوں۔

خوجی: ضرور کھایئے اور اس میں تھوڑی سی سنکھیاں بھی ملا لیجئے گا

آزاد: مرکم بخت

☆☆☆☆☆

خوجی علاج کرتے ہیں

بھٹیاری: میاں کیسے ہو؟

آزاد: کیا بتائیں بی کیسے ہیں مر رہے ہیں

بھٹیاری: ایک حکیم یہاں رہتے ہیں کہو تو لپک کر بلا لاؤں

آزاد: جاؤ احسان ہوگا اس وقت میں مارے بخار کے پھک رہا ہوں

بی بھٹیاری جا کر حکیم صاحب کو بلا لائیں

میاں آزاد دیکھتے ہیں تو عجیب قطع کا آدمی ہے چہرے سے وحشت برس رہی ہے آدمیت چھو کر ہی نہیں گئی۔ اچھے حکیم ہیں ایسے طبیب دیکھے نہ سنے

آزاد: حکیم صاحب آداب

حکیم: نا ہیں دبواؤ نا ہیں بخار میں داب لے نکسان (نقصان) ہے

آزاد: (اپنے دل میں) لیجئے لیاقت ظاہر ہے ہم کہتے ہیں آداب وہ کہتے ہیں دبواؤ نہیں۔۔۔۔ آپ کا اسم شریف؟

حکیم: ہمارا اسم سریپ (شریف) وانگلو

آزاد: (ہنس کر) وانگلو یا جانگلو؟

حکیم: نسکھا (نسخہ) لکھوں؟

آزاد: آپ نسخہ رہنے ہی دیں بس یہاں سے تشریف لے جائیں خوجی نے جھلا کر ان کو اٹھا دیا اور خود ہی یہ نسخہ لکھا

ہوالشافی

آلو بخارا　　تمر ہندی　　عرق گاؤزبان

2 دانہ　　4 ماشہ　2 تولہ

رات کو بھگو دیں صبح مل چھان کر پی لیں۔

اس نسخے کو میاں خوجی نے پنساری کی دکان پر بھیجا دوائیں بندھ کر آ گئیں اور خوجی نے ان کو بھگو دیا۔ آزاد نے کہا ذرا ہم بھی نسخہ تو دیکھیں دیکھا تو بد دماغ ہو گئے۔

آزاد: رات کو بھگو دیں صبح مل چھان کر پی لیں میاں رات بھر میں تو اپنا کام تمام ہو جائے گا صبح تک جیے گا کون؟ اجی اس وقت پلاؤ اسی دم جب جانیں کہ ہاں آرام ہوا کل تک زندہ رہنا محال یہاں جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں آپ فرماتے ہیں کہ صبح مل چھان کر پی لیں۔

خوجی: پھر اس وقت تو بندہ کچھ نہ دینے کا ہرگز نہ دوں گا واللہ ہاں ایک بات ہے آلو بخارے کا پانی پیجیے پانچ دانے بھگوئے دیتا ہوں جب مانگو اس کا پانی دوں گا بس کافی ہے

آزاد: خیر یوں ہی سہی مگر یار اف پھونک دیا۔ پھونک دیا آخر یہ ہوا کیا، کچھ سمجھ میں آتا ہی نہیں اور بھوک کے مارے اور بھی جان عذاب میں ہے۔

خوجی: کھانا تو اس وقت نہیں ملے گا

آزاد: واہ کھانا نہیں ملے گا تو بندہ آپ تک کو چٹ کر جائے، اس بھروسے بھی رہیے گا۔

خوجی: واللہ ایک دانہ بھی آپ کے پیٹ میں گیا اور آپ برس بھر تک یوں ہی

پڑے رہے۔ کھانا اس وقت زہر کا اثر دے گا

لاحول ولاقوت کھانا؟ ۔۔۔۔۔۔۔ اف نام نہ لو

آزاد: خیر آلو بخارے کا پانی تو لائیے

خوجی: لو گھونٹ گھونٹ پینا یہ نہیں کہ پیالے کو منہ سے لگایا اور غٹ غٹ پی گئے ایسا نہ کرنا۔

آزاد: (پی کر) اف ذرا تسکین ہوئی اور پیوں گا

خوجی: ابھی نہیں، ذرا تھم کر ذرا دم تو لو بخار میں زیادہ پینے سے تلی کے بڑھنے کا خوف ہوتا ہے۔

آزاد: مگر دل کی حرارت کیونکر دور ہوگی؟

خوجی: ہم بتائیں صندل اور کیوڑے کی پتی دل پر رکھیے ابھی فرق نہ پڑے تو کہنا

آزاد: پیاس کی شدت ہے

خوجی: آلو بخارا منہ میں رکھیے

آزاد: گرمی انتہا سے زیادہ ہے

خوجی: پالک کے پتے چارپائی پر بچھا دیجئے اور ان پر آرام کیجئے

آزاد: ماتھا دھمک رہا ہے

خوجی: کھیرا کاٹ کر ماتھے پر رکھیے اور اغل بغل بھی ایک ایک کھیرا رکھ لیجئے اور پیاس معلوم ہو تو کھیرے کے بیج چوس کر پھینک دیجئے

آزاد: جی گھبراتا ہے

خوجی: بخار میں یہ تو قاعدہ ہی ہے جی ضرور گھبرائے گا مگر ذرا استقلال بھی رکھیے آپ کے مزاج میں تحمل چھو نہیں گیا ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔۔۔۔سائیس! سائیس! اوپر آ ؤ ذری سا نمک باریک پیس کر پاؤں میں ملو اور تلوے سہلاؤ ذرا پاؤں گرمائیں تو تسکین ہو۔ دو تین جلابوں کے بغیر آرام نہ ہو گا۔ مگر یہاں تو حکیم ہی کوئی نہیں ہے خیر ہم خود ہی علاج کریں گے

آزاد: علاج تک تو چلو کوئی حرج نہیں مگر مار نہ ڈالنا بھائی ہاں ذرا اتنا احسان کرنا

خوجی: واہ ہم برسوں مرزا محمد علی مبرور کے یہاں مطب کیا کیے ہیں میاں آزاد رات بھر بے چین رہے۔ طبیعت بگڑتی ہی گئی۔ بخار کی وہ شدت کہ توبہ ماتھا جل رہا تھا دل کی دھڑکن تھی میاں خوجی گو طبیب نہ تھے مگر طبیبوں کی آنکھیں ضرور دیکھی تھیں دل کی بے قراری کے لیے انہوں نے صندل اور کیوڑے کا پھاہا دل پر رکھا اور بار بار اس کو بدلا خشک نہ ہونے دیا اور ماتھے پر کھیرا تراش کر اس کی قاش رکھی۔ اور اغل بغل سالم کھیرے رکھ دیے اور پالک کی پتیاں بستر پر بچھا دیں۔ جب میاں آزاد کو پیاس کا غلبہ ہوا تو اسپغول اور زرشک کی پوٹلی جو پانی میں بھیگتی تھی۔ ہونٹوں پر پھیری اور تھوڑا تھوڑا پانی بھی وقتاً فوقتاً پلوایا میاں آزاد نے جب بار بار پانی مانگا تو انہوں نے کہا پانی حاضر ہے مگر تلی بڑھ جائے گی لہٰذا ذرا آپ بھی ضبط کیجئے میاں آزاد نے کہا کہ بھائی جی متلاتا ہے خوجی نے برابر لگاتار آلو بخارے کا پانی پلوایا۔ اس سے بے چینی میں کسی قدر کمی ہوئی اور میاں آزاد کی آنکھ لگ گئی۔

میاں آزاد کو خوجی نے ٹھنڈائی پلائی تو تھوڑی دیر میں ذرا ان کی آنکھ کھلی جان میں جان آئی اور بھوک معلوم ہوئی میاں خوجی نے بھٹیاری سے کھچڑی پکوائی اور میاں آزاد کو کھلوائی لیکن تھوڑے ہی عرصے میں کھچڑی نے تکلیف دی پیاس لگی پانی لاؤ پانی لاؤ خوجی سمجھ گئے کہ کھچڑی نے پیاس لگائی آلو بخارے کا پانی دیا پھر کبھی برف کا ٹکڑا منہ میں رکھا بارے خدا خدا کر کے ذرا میاں آزاد کی آنکھ لگی تو خوجی چلے، مٹر گشت کو چلتے چلتے ایک محلے میں پہنچے اور وہاں گھوڑوں کے لیے گھانس خریدنے لگے۔

خوجی: (گھسیاری سے) اس گٹھے کا کیا لوگی؟

گھسیاری: دو آنے

خوجی: ہشت

گھسیاری: دھست

خوجی: نہ ہوئی قرولی ورنہ پیٹ چاک کر ڈالتا

اس پر گھسیاری نے گٹھا ان پر پھینکا اور یہ بچارے اس گٹھے کے بوجھ سے دم سے زمین پر آرہے اور بالکل دب ہی گئے نکلنا مشکل ہو گیا اور لگے غل مچانے۔

"او گیدی! نہ ہوا قرابیچہ نہیں تو بتا دیتا۔ قلعی کھل جاتی اچھے سے اچھے ڈاکو میرا ہاتھ لوہا مانتے ہیں ایک ڈاکو نہیں، پچاسوں کو ہم نے نیچا دکھایا ہے لو! گھسیارن اور ہم سے لڑے؟ اب اٹھاتی ہے گٹھا یا نہیں آن کر قرولی بھونک دوں"

لوگوں نے گٹھا اٹھایا اور میاں خوجی نیچے سے نکلے ڈاڑھی مونچھ خاک لت پت بالکل بات تیرے کی گھسیارن تک سے نہ جیت سکے۔

میاں آزاد کی آنکھیں ابھی تک جل رہی ہیں۔ ہونٹ کانٹا سا، بالکل خشک، چہرے پر زردی چھائی ہوئی۔ ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں۔ اٹھے اور تیورا کر دھم سے گرے۔ گرے اور غش آ گیا ہاتھ کسی قدر گرم تھے مگر پاؤں بالکل سرد میاں خوجی نے پھر سائیسوں کو حکم دیا کہ پاؤں میں نمک ملو اور تلوے سہلاؤ کھیرا برابر سنگھاتے جاؤ اور آلو بخارے کا پانی شام تک پلاتے جاؤ۔

جب تک آرام نہ ہوا بلکہ پیاس کی شدت اور بخار کی حدت نے میاں آزاد کو اور بھی بے چین کر دیا تو میاں خوجی گھبرا گئے۔ سوچے کہ اب حکیم کی مدد کے بغیر مشکل ہے مرض طول کھینچتا جاتا ہے بی بھٹیاری سے پوچھا کہ:

''خدا کے لیے سچ سچ بتاؤ کہ کوئی اچھا طبیب بھی ہے یہاں؟''

اس نے کہا: ''یہاں حکیم نہ طبیب مگر ہاں ایک بوڑھے حکیم ہیں جنھوں نے دکن میں طب کی تعلیم پائی اب وہ مطب تو نہیں کرتے لیکن کبھی ادھر ادھر علاج کرتے ہیں کہیے تو ان کو بلا لاؤں لیکن اتنا سوچ رکھیے کہ ان کے احترام میں کوئی کسر نہ رہ جائے وہ بڑے تیکھے آدمی ہیں''

خوجی نے کہا: ''ہم اس قدر خوشامد کریں گے کہ وہ بھی خوش ہو جائیں گے''

بی بھٹیاری نے جا کر حکیم صاحب سے عرض کیا کہ سرا میں ایک مسلمان آئے ہیں میاں مسافر ہیں بچارے پردیس کا واسطہ، جان نہ پہچان کسی سے اور تین دن سے بخار میں تڑپ رہے ہیں۔ ذرا چین نہیں آتا اگر آپ چلے چلیں تو وہ بچ جائیں نہیں تو خیر نہیں آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

حکیم صاحب: ہم اب سوائے خدا کی یاد کے اور کچھ نہیں کرتے لیکن اگر کسی

اللہ کے بندے کی جان ہمارے سبب سے بچے تو ہمیں دریغ نہیں ان کے ساتھ بھی کوئی ہے یا بالکل تنہا آئے ہیں۔

بھٹیاری: کوئی بھی ساتھ نہیں ہے ایک موا فیمی ہے۔اس نے اور بھی الم غلم دے کر مارڈالا۔اب وہ بالکل ہلکان ہو گئے ہیں بدن میں سکت نہیں

حکیم صاحب جا کر میاں آزاد کے پلنگ کے قریب ایک مونڈھے پر بیٹھے۔

آزاد: آداب بجالاتا ہوں

حکیم: بندگی

خوجی: انتہا کی کمزوری ہے حکیم صاحب بات کرنے کی طاقت نہیں

حکیم: یہ آپ کے کیا ہیں؟

خوجی: جی حضور یہ ہمارا بیٹا ہے

(آزاد دانت پیس کر خاموش ہو رہے)

خوجی: کل شام کو انہوں نے کچالو مانگے تھے۔ان کے معالج نے تھوڑے سے دے دیئے۔

حکیم صاحب: کیا؟ کچالو! استغفر اللہ مار ہی ڈالا تھا معالج کون گدھا ہے

سائیس: یہی علاج کرت رہیں (یہی علاج کرتے رہے ہیں)

خوجی: (جھلا کر) او گیدی نابکار میرا نام ایسے موقع پر کیوں لیا مردود نہ ہوئی قرولی پاس ورنہ مزہ چکھاتا وہ تو پوچھتے ہیں کہ معالج کون گدھا تھا اور تو نے چٹ سے میرا نام لے دیا اتنا نہ سمجھا کہ گدھا کون بنے گا

حکیم صاحب: ایسا غضب نہ کیجئے ورنہ ایک روز دھوکا کھایئے گا غضب خدا کا

بخار اور کچا لو! خیر اور فرمائیے جو جو حماقتیں آپ سے سرزد ہوئی ہیں۔

خوجی: بس حماقت عمر بھی میں یہی سرزد ہوئی کہ آپ کو بلوایا

آزاد: ہائیں ہائیں۔۔۔۔۔۔سائیس! جا کر ان کو یہاں سے کھڑے کھڑے نکال دو۔ جناب حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں گستاخی کرتا ہے۔

خوجی: کیا مجال مگر حکیم صاحب آپ نے اپنی بواسیر کا علاج نہ کیا

حکیم صاحب: (آزاد سے) حضرت آپ اپنے والد صاحب کو سمجھا دیجئے یہ اس وقت نشے کا استعمال کر کے آئے ہیں

آزاد: جناب یہ مردود ایک مسخرہ ہے بے حیا بے شرم نہ اس کو مار کا خوف نہ جوتیاں کھانے کا ڈر آپ اس کے کہنے سننے کا خیال نہ کیجئے یہ معلون پٹے گا آج

خوجی: ارے، ہائیں! باپ کے حق میں یہ کلمہ کفر

حکیم صاحب: (مسکرا کر) بڑے مسخرے ہیں خیر دو گھڑی کی دل لگی ہی سہی لیکن اب آپ قلم دوات کاغذ منگوائیں تو میں نسخہ لکھ دوں

کاغذ قلم دوات آیا اور میاں خوجی کو حکیم صاحب نے نسخہ لکھ دیا اور کہا اسی وقت اس کا استعمال کیجئے اور روپے کر رخصت ہوئے چلتے وقت میاں آزاد نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں مسافر ہوں، اور یہ نذر (دو روپیہ) قبول کیجئے حکیم صاحب نے کہا یہ نہیں ہونے کا میں دوستانہ آیا ہوں، کچھ روپے کا لالچ نہ تھا۔ بلکہ اگر آپ کو کچھ ضرورت ہو تو بندہ حاضر ہے لے اب بندہ رخصت ہوتا ہے خدا حافظ

حکیم صاحب تو رخصت ہوئے اور میاں خوجی لڑھکتے پڑھکتے عطار کی دکان سے دوائیں لائے۔ اب سنیے کہ نسخے میں لکھا تھا ''روغن گل'' آپ پڑھتے ہیں''

روغن گل، یعنی مٹی کا تیل عطار سے پوچھا

"کیوں بھئی مٹی کا تیل کہاں ملے گا"

اس نے کہا: "مارواڑی کی دکان پر"

وہاں سے آپ مٹی کا تیل اٹھالائے خیر دوا بھگوئی اور پلائی تو مٹی کے تیل کی بد بو آئی آزاد نے کہا یہ بد بو کیسی ہے؟ اف دماغ خراب ہو گیا تو میاں خوجی نے خوب ہی للکارا

"واہ بڑے نازک مزاج ہیں آپ آپ کو سب میں بد بو ہی آتی ہے اب کوئی عطر پلائے آپ کو یا زعفران کا کھیت چرائے تو آپ خوش ہوں لاحول ولاقوۃ"

میاں آزاد کو جو انہوں نے ڈپٹا تو وہ خاموش ہو رہے کہ بھئی ہم بیمار اور یہ بیمار دار جو کہا وہی کریں گے لیکن تھوڑی دیر کے بعد طبیعت بے چین ہوئی اور تپ کی وہ شدت کہ تو بہ میاں خوجی حکیم صاحب کے پاس دوڑے گئے

حکیم صاحب: (ہنس کر) کہیے آپ کا صاجزادہ کیسا ہے؟

حوجی: یہ قبلہ! نہایت ہی بے چینی ہے اور کیوں نہ ہو آپ جانتے ہیں مٹی کا تیل بے قراری نہ کرے گا تو اور کیا کرے گا وہ نفیس مزاج آدمی ٹھہرا

حکیم صاحب: یہ مٹی کا تیل کیسا میں کچھ نہیں سمجھا

خوجی: جی ہاں آپ کا ہے کو سمجھنے لگے آپ تو نسخے ہیں "روغن گل" لکھ آئے اور اب الٹا مجھی کو ڈانٹتے ہیں خیر صاحب حکیم ہیں آپ

حکیم صاحب: لاحول ولاقوۃ کیا غضب کیا انتہا کے احمق ہو کیسے جانگلوؤں سے پالا پڑا تو بہ ہی بھلی اور سنیے ہم نے لکھا، روغن گل آپ مٹی کا تیل دے آئے

معلوم ہوا کہ یہ کوئی امیر زادہ ہے اور آپ کوئی اٹھائی گیرے ہیں آپ نے رات کو کچالو کھلا دیے۔ آج مٹی کا تیل پلا دیا اسی طرح کسی دن زہر دے دیجئے گا واللہ اگر اس وقت میرے مکان پر آپ نہ آئے ہوتے تو کھڑے کھڑے نکلوا دیتا۔

خوجی: آپ کے اپنے حواس ٹھکانے نہیں آپ سوچیے تو کہ آپ فرماتے کیا ہیں اگر میرے مکان پر نہ آئے ہوتے تو کھڑے کھڑے نکلوا دیتا اس کے معنی کیا ہوئے؟ آپ کے مکان پر نہ آیا ہوتا تو آپ نکلوا کہاں سے دیتے پہلے اپنا علاج کیجئے پھر معالج بنیے (پاؤں پر ٹوپی رکھ کر) معاف کیجئے آپ کی مہربانیوں نے مجھے گستاخ کر دیا ہے۔

حکیم صاحب: بھئی عجب رنگ کا آدمی ہے بہرو پیا تو اب یہ نسخہ لو اور پلوا دو جا کر

میاں خوجی نے نسخہ لیا اور عطار کی دکان پر سے دوائیں لے کر گئے اور آزاد کو پلائیں مگر تسکین نہ ہوئی تو شام کو آزاد ڈاکٹر کی تلاش کرنے لگے۔

خوجی: ڈاکٹروں کی دوا گرم ہوتی ہے بخار کا علاج ان لوگوں کو معلوم ہی نہیں

آزاد: یہ جاہلوں کی بات ہے کہ ڈاکٹر بخار کا علاج نہیں کر سکتے، تم ابھی جاؤ اور کسی ڈاکٹر کو بلا کر لاؤ۔

بھٹیاری: ڈاکٹر تو یہاں ہے مگر اس کے آنے سے حانسل (حاصل؟

آزاد: اجی حانسل وانسل ہم نہیں جانتے ڈاکٹر کو بلاؤ تو اچھا ہے ورنہ میں ابھی ابھی دم توڑ دوں گا۔

خوجی بچارے پتا پوچھتے ہوئے اسپتال چلے مگر بعض لوگوں نے بہکا دیا تو

حضرت تھانے کے راستے پر چل پڑے۔ آدھ کوس نکل گئے تو لوگوں کو زبانی معلوم ہوا کہ اہسپتال پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ بہکانے والوں کو گالیں دیتے ہوئے چلے آخر کار خدا خدا کر کے ہسپتال پہنچے

خوجی: (ڈاکٹر سے) کیوں میاں، ڈاکٹر کہاں ہیں اس وقت؟

ڈاکٹر: آپ اپنا مطلب کہیے

خوجی: اجی تو تم سے کیا واسطہ عجب قطع کے آدمی ہو تم بس اتنا بتا دو کہ ڈاکٹر کہاں ہیں

ڈاکٹر: لاحول ولاقوت

خوجی: لاحول ولاقوت

ڈاکٹر: کوئی ہے نشتر لاؤ ہم ان کی خبر لیں گے

خوجی: کوئی ہے؟ لٹھ لاؤ ہم ان کی خبر لیں گے

کمپوڈر: اجی کیا بک بک لگائی ہے یہی تو ڈاکٹر صاحب ہیں

خوجی: آداب عرض کرتا ہوں ذرا سر تک تشریف لے چلیے میرا لڑکا سخت بیمار ہے آپ کو تکلیف تو ہو گی، مگر احسان ہو گا۔

ڈاکٹر صاحب سرا میں پہنچے اور پہنچتے ہی میاں آزاد کو دیکھا اور کہا

ڈاکٹر: جبان دکھاؤ جبان

آزاد: (طنز سے) بہت کھوب (خوب) لیجیے جبان

ڈاکٹر: آنکھیں دکھاؤ

آزاد: الٰہی خیر۔۔۔۔۔ ابھی آنکھیں دکھائیں تو گھبرا کر بھاگو گے

ڈاکٹر: ویل آنکھ، بات پیچھے کرو۔

خیر ڈاکٹر نے نسخہ لکھا، دو روپے فیس کے لیے اور چمپت ہوئے میاں آزاد نے چار گھنٹے ڈاکٹر صاحب کی دوا کی مگر پیاس کا غلبہ ہوتا ہی گیا اس دوا نے وہ گرمی کی کہ توبہ۔۔۔۔پانی۔۔۔۔پانی خوجی پانی لا۔۔۔۔۔۔ارے کم بخت کیا دشت کربلا ہے ہائے ایک ایک قطرے کے لیے ترساتا ہے۔

خوجی بچارے بھی گھبرا گئے کہ خدا ہی خیر کرے اس قدر پیاس ہے کہ حد نہیں تھوڑا تھوڑا پانی دینا شروع کیا مگر میاں آزاد نے چپکے سے بھٹیاری کے ذریعے ڈھائی سیر برف منگوائی اور رات بھر استعمال میں لائے اس وقت تسلی ہوئی مگر پھر اتنی برف پینے سے جان عذات میں ہوگئی ہاتھ پاؤں سرد پیچش نے ناکوں دم کر دیا اور پیٹ میں سوجن ہونے لگی صبح ہوتے ہوتے خوجی ایک بید راج کو پکڑ لائے

خوجی: بید جی کوئی جڑی بوٹی لاؤ۔۔۔۔ہے یا نہیں ہے

بید: ہے سب کچھ ہے کیا نہیں پر کوئی قدر کرنے والا چاہیے غرض بید راج نے ایک گولی دی اور شہد کے ساتھ چٹا دی تھوڑی دیر میں پاخانے کی حاجت ہوئی اور آزاد آتے ہی پلنگ پر چت کر گئے۔

''میاں آزاد، میاں آزاد، بھائی آزاد اے آزاد میاں ہوت کوئی آواز نہیں۔''

میاں خوجی بہت ہی گھبرائے اور گھبرا کر چلے پھر بید کو بلانے کو راستے میں ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر ملے یہ انہیں کو گھیر گھار کر لائے انہوں نے دو قطرے دوا کے ایک چھوٹی سی شیشی سے پانی میں ڈال دیے۔اس کے پینے کے ایک آدھ گھنٹہ کے بعد طبیعت بے چین ہونے لگی۔تو اب جا کر حکیم صاحب کو بلا لائے۔انہوں نے

وہ نسخہ بدلا اور ایک اس کی جگہ پر لکھا اس طرح بدلتے چلے گئے۔

میاں آزاد نے چھ سات روز کے عرصے میں اتنے طبیب اور بید اور ڈاکٹر بدلے کہ اپنی مٹی ہی پلید کر دی اس قدر طاقت بھی باقی نہ رہی کہ چارپائی سے بغیر کسی کی مدد اٹھ سکیں۔ دو چار آدمیوں نے سہارا دے کر اٹھایا تو بیٹھنا محال بیٹھے تو تھوڑی دیر میں چکر آنے لگے۔

خوجی کی جان عذاب میں اور دونوں سائیسوں کا تو بھر کس ہی نکل گیا۔ بھٹیاری بڑی بھلی مانس تھی اس نے بڑا ساتھ دیا رات بھر میاں آزاد کے سرہانے بیٹھی رہی اور جس وقت جو کام اس کے لائق تجویز کیا گیا وہ کرلائی ذرا عذر نہ کیا میاں آزاد راتوں کو تڑپتے تھے اور دن بھر روتے جاتے تھے کہ یہاں موت ہم کو کھینچ لائی اور یہ کیا شامت آئی کہ ہم یہاں آئے۔

خوجی: یہاں آنے سے کیا ہوا؟ کیا سرا نے آپ کو بیمار کر دیا، یا چارپائی بیماری کا گھر ہے آخر کچھ معلوم تو ہو اس بیماری کا سبب کچھ اور ہی ہے کہیے تو بتا دوں اس کے دو خاص سبب ہیں۔ ایک یہ کہ ہم اور آپ دونوں تین دن تک خوب بھیگے لیکن فرق ہم میں اور آپ میں اس قدر تھا، ہم خالی چارپائی پر گرم کپڑے پہن کر سو رہتے تھے اور آپ بھیگے ہوئے بستر پر ننگے پڑے رہتے تھے۔ ذرا سی لنگی باندھ لی اور اوس میں سو رہے یا بچھونا بالکل تر ہے اور آپ اسی پر چار چار پہر تک سویا کیے۔ پھر آپ بیمار نہ ہوں تو کیا ہم ہوں روز کہتا تھا کہ اوس میں سونا برا گیلے بچھونے پر سونا صحت کے لیے اچھا نہیں مگر آپ سنتے کس کی ہیں اب بھگت رہے ہو اور تمہارے ساتھ ہم بھی اس مصیبت میں مبتلا ہیں تم کو تکلیف ہے یہاں سونا حرام

نیند برائے نام ہسائیسوں کا نام میں دم آ گیا۔ ذرا چین نہیں دن رات میں دو گھڑی سوئے بھی تو آپ نے للکارا کہ

"سالار بخش پاؤں دباؤ۔۔۔۔۔۔مداری پنکھا ہلاؤ۔۔۔۔۔۔میاں خوجی ادھر آؤ بی بھٹیاری کو ابھی ابھی بلاؤ" با خدا انتہا کی سب کو تکلیف ہے اور یہ صرف آپ کے اوس میں سونے سے بس اور کوئی وجہ نہیں مگر آپ کے مزاج میں تو اس قدر ضد ہے کہ توبہ ہاری جیتی کچھ مانتے ہی نہیں اور وجہ کیا؟۔۔۔۔۔وجہ یہ کہ اپنے کو تو جالینوس سمجھتے ہیں اور باقی سب کو تو گدھا۔ دنیا میں بس ایک آپ ہی بقراط ہیں اب واسطے خدا کے ایک تو پانی اس قدر نہ پیجیے دوسرے جو کہیں مان لیجیے تیسرے ڈاکٹر یا حکیم یا بید ایک کے سر ہو رہیے۔ یہ نہیں کہ صبح حکیم صاحب کی دوا کھائی ڈیڑھ دو سیر کا پیالہ بھر کر دوا پی اور شام بید راج کی گولی استعمال میں لائے آدھی رات کو ڈاکٹر کی رائے کے مطابق سیرپ لیمن پی لیا لاحول بھلا یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے اتنے بڑے لائق اور تعلیم یافتہ آدمی اور اس درجہ احمق خدا کی مار یار تحمل اور ضبط تمہارے مزاج میں چھو کر نہیں گیا۔

بھٹیاری: اے تو تم بھی عجیب آدمی ہو بھلا کوئی بیمار کو اور پھر ایسے بیمار کو للکارتا ہے۔۔۔۔جو کچھ ہوا سو ہوا اب ان باتوں کو چھوڑو جب اللہ کرے گا صحت پائیں گے تو خوب بیٹھ کر کہہ لینا اس وقت ان کو تسلی دو یہ نہیں کہ برا بھلا کہنے لگے۔

آزاد: اف۔۔۔۔اوہ۔۔۔۔۔۔بھئی انتہا کی تکلیف ہے کسی نئے طبیب کو بلاؤ کہنا مانو یا حسن بانو کے پاس خط بھیجو کہ ہم کو یہاں آ کر دیکھ جائیں اب یہاں چل چلاؤ لگ رہا ہے اب زندگی کی امید ختم ہو رہی ہے آج مرے کل دوسرا دن

خوجی: افسوس ہے کہ آپ ہذیان بھی بکنے لگے میں کہتا ہوں کہ کہیں سرسام نہ ہو جائے

بھٹیاری: اے چپ بھی رہو یہ کیا واہی تباہی بک بک لگا رکھی ہے آخر عقل بھی ہے تم میں سرسام کیا خاصے بھلے چنگے ہیں نہ سرسام ہے نہ ورسام ہاں میاں ذرا بال کتروا ڈالو

آزاد: یہ نہ ہونے کا میں اپنے بالوں کو بہت عزیز رکھتا ہوں

خوجی: چھیلا بہت دیکھے مگر آزاد کے سے رنگیلے کم مر رہے ہیں لیکن بال نہ کٹوائیں گے

بھٹیاری: مر رہے ہو تم کچھ سودائی سا معلوم ہوتا ہے اور سنو! ایک تو وہ بچارے حیران ہیں دوسرے یہ ان کو اور دق کرتا ہے کبھی کہتا ہے مر رہے ہو کبھی للکارتا ہے کبھی کچھ کہتا ہے اے واہ اچھے دوست ہو

سائیس: حکیم تو مریض کو لٹکا کے رہتے ہیں

خوجی: او گیدی چپ تو کون ہے بیچ میں بولنے والا تو گھانس چھیلنی جانے یا حکمت جانے آپ بھی بولے اے تیری قدرت

آزاد: سچ تو کہتا ہے مونگ کی کھچڑی دے دے کر مریض کو ادھ موا کر ڈالتے ہیں گر دو مہینے میں بھی چارپائی چھوڑی تو سمجھیے بڑا خوش نصیب تھا۔

خوجی: آپ کے حوالے تو ٹھکانے ہی نہیں کہ بات کیجئے آپ بحث کیا کرتے ہیں

آزاد: اجی چپ بھی رہو تم تو مغز کھا گئے تسلی دینا تو درکنار لگے اول جلول بکے

اب ہمیں سونے دو مگر اب ایک ہی کے سر ہو رہیں گے دس طبیب نہ بدلیں گے کان پکڑے جو حماقت ہوئی وہ ہوئی اب توبہ کی تم کو روکنا چاہیے تھا تم نے خیال ہی نہیں کیا۔

بھٹیاری: ہاں یہ سچ ہے مگر میاں تمہارے مزاج میں بھی ضد بہت ہے تم کسی کی مانتے ہی نہیں جو دھن سمائی وہ سمائی اب بھی یہ عادت چھوڑو نہیں مہینوں پڑے رہو گے۔

خوجی: تم کو ان باتوں سے کیا واسطہ اپنے کرائے سے مطلب ہے یا کچھ اور؟

بھٹیاری: واہ اللہ کرے یہ اچھے ہو جائیں کرایہ بہت مل جائے گا جی

☆☆☆☆☆

عجیب ملاقات

اتنے میں میاں آزاد کی آنکھ لگ گئی سائیس نے پنکھا جھلنا شروع کیا میاں خوجی ذرا اونگھنے لگے تھے کہ ایک شخص نے ان کو جگایا اور کہا کہ میں مسافر ہوں آپ سے کچھ کہنا ہے۔

میاں خوجی پہلے تو ڈرے کہ بھئی خدا ہی خیر کرے یہ کون شخص ہے مگر جب غور سے دیکھا تو ان کی خاصی جوڑ تھی وہ بھی پستہ قد دبلے پتلے آدمی، یہ بھی اور لطف یہ کہ وہ چانڈو باز، یہ بھی میاں خوجی نے اٹھ کر کہا

خوجی: کہیے کہیے فرمایئے میں نے آپ کو پہچانا نہیں

مسافر: ہونھ پہچانتا کیسا آپ نے ہمیں دیکھا کب تھا جو پہچانتے

خوجی: اچھا تو پلے کیوں پڑتے ہیں دور ہی سے کہیے جو کچھ کہنا ہو آپ کو ہم سے کام کیا ہے ہم اس وقت خود ہی مصیبت میں ہیں

مسافر: میاں آزاد کہاں ہیں؟

خوجی: کیوں؟ آپ اپنا مطلب کہیے یہاں تو آزاد وازاد کوئی بھی نہیں ہے آپ اپنا مطلب کہیے کیا کوئی آپ کا کچھ دینا ہے؟

مسافر: جی ہاں ایسا ہی بندہ دھنا سیٹھ ہے نا کہ سب کو قرض دیتا پھرے، اجی آزاد ہمارے بنوئی ہیں ہماری بہن نے بھیجا ہے کہ دیکھو کہاں ہیں سو ہم کو پتہ لگا

خوجی: بہنوئی؟۔۔۔۔ان کی شادی تو ہوئی نہیں بہنوئی کیونکر بن گئے۔

مسافر: آپ بھی عقل کے کتنے دشمن ہیں بھلا کوئی بے وجہ کسی کو بھی اپنا بہنوئی

بنائے گا اتنا نہیں سمجھتے لاحول ولاقوۃ

خوجی: (ہنس کر) بھلا میاں آزاد کی بیوی کہاں ہیں ہم کو دکھا دیجیے ہم سے کیا پردہ

مسافر: کہاں ہیں؟ اسی اسی سرا کے اس کونے میں چلو دکھا دیں تم سے کیا چوری ہے تم تو گھر کے آدمی وہ چلو پھر۔۔۔۔۔۔۔۔چلو نا

خوجی: اچھا ٹھہریئے، چلتا ہوں

یہ کہہ کر میاں خوجی کوٹھڑی کے اندر گئے۔ بالوں میں تیل ڈالا سفید کپڑے پہنے لال پھند نے والی ٹوپی پہنی میاں آزاد کا ایک خاکی کوٹ پہنا اور جب خوب بن ٹھن چکے تو آئینہ لے کر صورت دیکھنے لگے۔ بس غضب ہی ہو گیا۔ آئینہ دیکھتے ہی ان کی وہ حالت ہوئی جو مور کی ہوتی ہے کہ اپنے نقش ونگار دیکھتے ہی پھڑک گیا مگر پیروں پر نظر پڑی تو رو دیا۔ داڑھی کے بال اونچے نیچے موچھیں گری پڑی۔ آپ نے قینچی لے کر بال برابر کرنا شروع کیے تیز قینچی ایک ہی دفعہ ایک طرف کی مونچھ بالکل اڑگئی جل جلالہ، خیر قہر درویش بر جان درویش کہہ کر چلے۔

مسافر اور خوجی ساتھ ساتھ روانہ ہوئے مسافر نے تو خوجی کو پہلے ہی دیکھا تھا مگر اور ہی قطع میں اور اب دیکھا تو اور ہی وضع میں سمجھا کہ آدمی نیرے چونچ ہیں ایک مونچھ جو صاف کتری ہوئی نظر آئی اس کو بے اختیار ہنسی آئی مگر آدمی تھا چست چالاک ضبط کیے رہا اور میاں خوجی کو لے گیا۔

میاں خوجی دیکھتے کیا ہیں کہ ایک عورت نہایت ہی زرق برق کپڑے پہنے چارپائی پر سو رہی ہے۔ صورت تو انہوں نے دیکھی نہیں کیونکہ وہ کروٹ سے سو

رہی تھی۔ مسافر خود کسی کام کے لیے چلا گیا اتنے میں اس گلبدن نے کروٹ جو بدلی تو میاں خوجی کو للکارا

گلبدن: تم کون ہو۔۔۔۔۔یہاں کیا کام ہے؟

خوجی: (کانپ کر) آپ کے بھائی پکڑ لائے

گلبدن: قصور؟

خوجی: بے گناہ

گلبدن: بے وجہ بھی کوئی کسی کو گرفتار کرتا ہے؟

خوجی: میری خطا نہیں معاف کیجیے

گلبدن: اچھا ذرا پنکھا تو جھلو مگر آنکھ بند کر کے خبر دار مجھے نہ دیکھنا میں پردہ نشین ہوں

خوجی پنکھا لے کر جھلنے لگے اور اس گلبدن نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لی۔ اتنے میں اس گلبدن نے تڑ سے جو آنکھ جو کھولی تو میاں خوجی پنکھا تو قلی کی طرح جھل رہے ہیں مگر دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھے بھی جا رہے ہیں اس کا آنکھیں کھولنا تھا کہ میاں خوجی نے مارے ڈر کے آنکھیں خوب زور سے بند کر لیں کاٹو تو لہو نہیں بدن میں جان سن سے نکل گئی

گلبدن: کیوں جی گھورنا کیا معنی اب بتایئے کیا سزا دوں؟

خوجی: اتفاق سے آنکھ کھل گئی

گلبدن: واہ اچھا اتفاق ہے اور جو اتفاق سے ہمارا بھی ہاتھ اٹھ جائے تو پھر؟

خوجی: جو مرضی

گلبدن: میاں آزاد کہاں ہیں؟

خوجی: (ڈرتے ہوئے) بی انہوں نے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ جو کوئی میرا حال پوچھے تو صاف صاف پتہ نہ دینا کہ یہاں سرا میں ہیں

گلبدن: بھلا کہاں جانے کا قصد ہے؟

خوجی: انہوں نے حکم دیا ہے کہ اگر کوئی ہمارے عزم کا حال پوچھے تو اس سے یہ نہ کہنا کہ ترکی جانے والے ہیں

مسافر: ہم بھی آن پہنچے ان سے کچھ باتیں ہوئیں

خوجی: میں کس لائق ہیں

مسافر: واہ یہ کیسے آپ بڑے نالائق ہیں

گلبدن: یہ کہتے ہیں کہ میاں آزاد ترکی جانے والے ہیں اور یہاں سرا میں ٹھہرے ہوئے ہیں

مسافر: ہوں گے اس وقت انہیں کھانا وانا تو کھلاؤ

گلبدن: یہ آپ کی ایک مونچھ کیا دیمک چاٹ گئی

خوجی: بیٹھوں تو بتاؤں

مسافر: بیٹھئے نا! بسم اللہ تشریف رکھیے

میاں آزاد کی آنکھ جو کھلی تو خوجی ندارد ایک ایک سے پوچھتے ہیں کہ خوجی کدھر گئے بھئی آسمان کھا گیا یا زمین چٹ کر گئی آخر یہ چل کہاں دیے سوچے کہ آدمی ہیں افیونی افیم کی چاٹ میں دل اچاٹ ہوا ہوگا پہنچے کسی دکان پر۔۔۔۔

گھڑی بھر ہو گئی دو گھڑی گذری گھنٹوں ہو گئے مگر خوجی نہ آئے تب تو ان کا

ماتھا ٹھنکا کہ دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے سمجھے کہ بھلے آدمی ہیں اور کمزور اور کمزور مار کھانے کی نشانی اور اس پر لطف یہ کہ ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے جھگڑے ہوں گے اس نے گردن ناپی ہے اب جب تک ہم نہ جائیں گے وہ سڑک پر پڑے رہیں گے اس میں چاہے دو دن ہو جائیں وہ سڑک کو نہ چھوڑیں گے، نہ چھوڑیں گے۔ دھن کے پکے ہیں ہم جانے سے رہے یہاں اٹھنے بیٹھنے کی طاقت نہیں چار پائی پر بیٹھ کر کہاں شہر بھر میں تلاش کریں۔ ایک نے ہنس کر کہا کہ:

''ننھے سے آدمی ہیں کہیں بھیڑیا وبڑیا اٹھا لے گیا ہوگا''

دوسرا بولا: ''آج ہوا تیز چل رہی ہے معلوم ہوتا ہے کسی طرف اڑ گئے''

اتنے میں آزاد نے بھٹیاری سے پوچھا کہ: ''کیوں بی بھٹیاری تمہیں کچھ معلوم ہے خوجی کہاں چلے گئے؟''

اس نے کہا: ''میاں اب میں کیا بتاؤں کہ کہاں غائب غلہ ہو گئے بس اتنی جانتی ہوں کہ انہیں کا سا ایک آدمی آیا تھا۔ دبلا پتلا چہرے کی رنگت بالکل زرد ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور پستہ قد بھی اس سے ان کی کچھ باتیں ہوئیں وہ تم کو بار بار پوچھتا تھا مگر باتوں سے ایسا پایا جاتا تھا کہ جیسے خوجی اور اس کی ملاقات پہلے نہ تھی مگر تمہارا نام کئی بار لیا اور پوچھا کہ کہاں ہیں پھر کچھ کان میں کہا تو میاں خوجی کوٹھری میں گئے اور وہاں خوب بنے ٹھنے۔ لال ٹوپی پہنی اور تمہاری چھڑی ہاتھ میں لی، بال سنوارے اور بڑے ٹھسے سے اکڑتے ہوئے اس کے ساتھ ہو لیے مگر ہنستے ہوئے اف مارے ہنسی کے بات اس وقت نہیں کی جاتی تھی کوٹھری کے باہر

جب آئے تو میں نے دیکھا کہ ایک طرف کی مونچھ بالکل صاف داہنی طرف تو تھی مگر بائیں طرف بالکل صفاچٹ مجھے اتنی ہنسی آئی کہ لوٹنے لگی جی میں آئی کہ تم کو جگادوں، مگر اجنبی کا ساتھ تھا تو کہنا مناسب نہ سمجھا۔''

آزاد: (حیران ہو کر) کون تھا بھئی دبلا پتلا آدمی زرد۔۔۔۔۔۔ مجھے جانتا ہے مگر خوجی کو نہیں پہچانتا کون شخص تھا؟ ہاہاہا۔۔۔ تاڑ گیا ہو نہ ہو۔۔۔ مگر نہیں وہ یہاں کہاں پھر آخر یہ کون آدمی تھا (دل میں سوچ کر) اف اوہ ارے کہیں نواب نے کوئی آدمی دوڑا دیا غضب کا سامنا ہے اب دھر لیے گئے بھاگنے تک کی ہمت نہیں کروں تو کیا کروں یا حسن آرا نے آدمی بھیجا ہو کہ آزاد کی خبر لاؤ۔ خدا ہی خیر کرے دیکھیں کون آدمی آیا ہے جو آیا ہے کہیں جلد صورت دکھائے۔

میاں آزاد یہ خیالی پلاؤ پکا رہے تھے مگر یہ خبر ہی نہ تھی کہ نواب کا آدمی نہ حسن آرا کا قاصد ہے، وہ کوئی اور ہی ذات شریف ہے

بڑی دیر تک میاں آزاد نے بے چینی میں وقت کاٹا۔ طرح طرح کے خیال ان کے دل میں آتے تھے مگر ٹھیک پتا نہیں پاتے تھے کہ کون بزرگوار تشریف لائے تھے کس سے کہنے آئے تھے خوجی کو کیوں پکڑ لے گئے اور اب تک خوجی غائب کہاں رہے۔

کھٹ ہوئی اور انہوں نے پکارا: خوجی دھم ہوا اور پوچھا آئے ذرا کسی کی آہٹ پائی اور چونک اٹھے میاں خوجی مگر خوجی تو کہیں اور ہی ہیں اتنے میں شام ہوگئی اور خوجی کا کہیں پتہ نہیں۔ تب تو میاں آزاد بے حد بے قرار ہوئے کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے بھٹیاری سے کہا کہ چاہے جو ہو خوجی کو لاؤ۔ کسی سے پوچھا پاچھو آخر

گئے کہاں ذرا جلدی آنا اس نے کہا اب جاتی ہوں پوری کوشش کروں گی پھر اب آئیں نہ آئیں یہ ان کو اختیار ہے جانا میرا کام ہے آنا نہ آنا ان کے ہاتھ ملنا نہ ملنا اتفاق کی بات ہے۔

خیر وہ تو چلیں میاں خوجی کی تلاش میں اور ادھر خوجی صاحب وہ عورت اور وہ مسافر دستر خوان پر جا بیٹھے۔خوجی کئی دن کے بھوکے تو تھے ہی کھاتے جاتے اور تعریفیں کرتے جاتے تھے۔واہ واہ واہ کیا لذیذ کھانا ہے تعریفوں کے پل باندھ دیے ایک لقمہ کھایا اور کئی منٹ تک تعریف کی۔یہ تو تعریف ہی کرتے رہے۔ادھر میاں مسافر نے دستر خوان صاف کر دیا، وارے کرکے رہ گئے دل میں پچھتائے کہ یہ ہم سے کیا حماقت ہوئی پہلے خوب پیٹ بھر کے کھا لیتے پھر دن بھر رات تعریف ہی کیا کرتے اس عورت نے پوچھا:

''کچھ اور لاؤں شرمایئے گا نہیں یہ آپ کا اپنا گھر ہے''

میاں خوجی کہنے ہی کو تھے کہ ''جی ہاں منگوایئے'' کہ اتنے میں مسافر جو خوب کھا چکا تھا کہا کہ ''نہیں اب کیا ہیضہ کراؤ گی خوب کھانا کھایا اب ہضم نہ ہوگا۔''

خوجی یہ گرما گرم فقرہ سنتے ہی جل بھن کر خاک ہو گئے مگر کہیں تو کیا کہیں بولے کہ

''اچھا لایئے''

اس پر مسافر نے جو انتہا کا شریر تھا رکابیاں اٹھائیں اور دستر خوان ہٹا دیا اور خوجی بیچارے منہ ہی دیکھتے رہ گئے۔جی میں تو آیا کہ مسافر پر برس پڑیں مگر خیر گذری کہ قرولی پاس نہ تھی ورنہ اس گیدی سے سمجھ لیتے شکر ہے کہ قرولی کبھی پاس

ہی نہ ہوتی تھی ورنہ خدا جانے کتنے آدمیوں کو شہید کر چکے ہوتے۔

خیر کھانا وانا کھا کر بیٹھے تو مسافر نے کہا

"ارے لاحول ولا پان وان میں تو دو ہی پان ہیں، ایک اس گلبدن کو دی دوسری اپنے منہ میں رکھ لی خوجی پھر منہ دیکھ کر رہ گئے تب تو آپ بہت ہی جھلائے ادھر ادھر دیکھا مگر خیر سے قرولی نہ پائی ورنہ گیدی کا خون ہی پی لیتے۔اس کے بعد مسافر نے ایک اور حرکت کی ان سے کہا۔"

"میاں ہوت، میاں ہوت! ارے بھائی تم سے کہتے ہیں تم سے ادھر ادھر"

خوجی جلے بھنے بیٹھے ہی تھے انہوں نے گھور کر دیکھا اور کہا کہ:

"کس سے کہتے ہو جی؟"

"اور سنیئے گا کس سے کی ایک ہی کہی کہنے لگے کس سے کہتا ہے تجھ سے کہتے ہیں، تجھ سے اور کس سے کہتے ہیں ذرا پلنگ سے اتر کر بیٹھو۔کیا مزے سے برابر جا کرڈٹ گئے۔اتر نیچے، اترا کہ میں پہنچوں اور دیکھیے گا آپ پلنگ پر چڑھ کر بیٹھے ہیں اپنی حیثیت کو نہیں دیکھتا۔"

خوجی: چپ گیدی نہ ہوئی قرولی ہائے نہ ہوئی قرولی

گلبدن: قرولی پر دھ ڈھونڈیے گا پہلے یہاں سے کھسک کر نیچے بیٹھے تم سے کس نے کہا تھا کہ یہاں آن کر ہمارے پاس بیٹھو

خوجی: (پلنگ سے اتر کر) بہت اچھا اب بیٹھوں تو توپ سے اڑا دینا۔

مسافر: میں کہتا ہوں کہ تم بیٹھے بیٹھے کیا بناؤ گے اٹھ جا ڑو دے

خوجی: اس گیدی نے تو ناک میں دم کر دیا۔شکر ہے کہ یہاں کوئی قرولی نہیں

ورنہ کھیت کے کھیت صاف کر دیتا۔میدان کے میدان چوپٹ ہو جاتے۔

گلبدن: کیا گھاس چھیلتے گھسیارے ہو آخر کھیت کے کھیت کا ہے کے صاف کر دیتے۔

مسافر: لے چلو اٹھو یہ جھاڑو ہے ابھی جھاڑو دے ڈالو

خوجی: جھاڑو تم دو ہم کو بھی کوئی بھڑ بھونجا مقرر کیا ہے یا کوئی پاجی سمجھے ہو ہم ایک عالی خاندان آدمی گھر کے رئیس ہیں رئیسوں سے اس طرح باتیں کرتے ہیں گیدی

گلبدن: حضور کی ریاست کہاں ہے ذری ہم بھی تو سنیں آخر کچھ معلوم تو ہو

مسافر: ہمیں تو نانبائی سا معلوم ہوتا ہے یا شاید نائی ہو۔دستر خوان پر جو بیٹھے تو لذیذ لذیذ کھانا سب چٹ کر گئے۔کھا گئے، سن دس بارہ اور کام کرنے میں ننھا بیچارہ چلیے اٹھیے، جھاڑو دیجئے دل لگی نہیں کچھ بڑے رئیس زادے بن کر بیٹھے ہیں۔رئیس کی کی ایسی ہی صورت ہوا کرتی ہے؟

خوجی: (جھلا کر) خدا جانے میری صورت میں کیا عیب ہے۔جس سے ملتا ہوں سب یہی بے تکی اڑاتے ہیں کہ بھلے مانس کی ایسی صورت ہی نہیں ہوتی۔یہ تا پاجیوں کی سی صورت ہے۔آئینے میں دیکھتا ہوں تو مجھے خود شک سا ہوتا ہے اور اب تو جس کا جی چاہے جو کچھ کہے۔ایک طرف کی مونچھ بھی اڑ گئی ہے بھلے مانس کہاں سے رہ گئے بھلا کچھ نہیں اب ہم پہلے منہ بنوائیں گے پھر کسی سے بات کریں گے یہ کہہ کر میاں خوجی نے کہا

''بندہ رخصت''

مسافر: (دامن پکڑ کر) واہ کیا دل لگی ہے رخصت کی ایک ہی کہی بیٹھے چلم بھر کے جایئے گا۔ اور آپ یہ ثابت کر دیجئے، کہ آپ شریف زادے ہیں اور یا کشتی لڑ لیجئے

میاں خوجی تو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ ایسے جھلائے کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ چمٹ ہی تو گئے اب دونوں میں خوب لپاڈگی ہونے لگی اور دل لگی یہ کہ دونوں کا قد کوئی چھ چھ بالشت کا دونوں چانڈو باز یہ آہستہ سے ان کو چپت لگاتے ہیں۔ وہ ہلکے سے ان پر دھپ جمائے ہیں۔ انہوں نے ان کے کان پکڑے انہوں نے ان کی ناک پکڑی۔ انہوں نے ان کو کاٹ کھایا۔ انہوں نے ان کو کاٹا اور پھر یہ کہ دونوں رو رہے ہیں مگر میاں خوجی قرولی کی دھن باندھے ہوئے ہیں کہ نہ ہوئی قرولی ہائے نہ ہوئی قرولی مسافر نے ان کے بال پکڑے اور انہوں نے ان کے کان کھینچے۔ وہ جیتے نہ یہ جیتے۔ سکت دونوں کے بدن میں نہیں۔ ہانپ گئے میاں خوجی تو قرولی درولی سب بھول گئے۔ چکرا کر گرے، تو چاروں شانے چت اور اس گلبدن نے اوپر سے دو تین دھولیں بھی چکھا دیں۔ ادھر ان کا تو یہ حال ہوا۔ ادھر مسافر کی یہ کیفیت ہوئی کہ چکر کھایا اور دھم سے زمین پر۔

اتنے میں گلبدن نے دونوں کو اٹھایا اور کہا "اب گلے مل جاؤ لڑائی ہو چکی اب کیا کٹ ہی مرو گے چلو بیٹھو اب نہ بولنا"

خوجی: بولنا وولنا میں نہیں جانتا قرولی نہ ہوئی ورنہ بھونک ہی دیتا بات تیرے کی

مسافر: وہ تو میں ہانپ گیا نہیں تو دکھا دیتا آپ کی دل لگی بچہ جی! مجھے بھی آپ

کوئی ایسا ویسا سمجھے ہیں سینکڑوں ہی پیچ یاد ہیں۔

گلبدن: اب اگر دونوں میں سے ایک بھی بولا تو ہم درست کر دیں گے اس کے معنی کیا جب منع کیا تو پھر جھگڑا کیسا؟ اب زبان نہ کھلے خبردار چلو اب چلیں میاں آزاد کے پاس ان کی بھی تو خبر لیں خوجی اٹھے اور مسافر نے بھی کپڑے پہنے اور چلے۔

شام تو ہو ہی گئی تھی۔ میاں خوجی ایک طرف اور مسافر دوسری طرف ہاتھ پکڑے آزاد کے پاس اس گلبدن کو لے گئے۔ وہ پہنچی تو کیا دیکھتی ہے کہ بھٹیاری ان کے سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ "میں چوطرفہ تلاش کر آئی کسی کا پتہ نہ چلا" اتنے میں یہ سب جا کھڑے ہوئے۔

اس گلبدن نے کندھا ہلایا تو میاں آزاد کی آنکھ کھل گئی اور آنکھ کا کھلنا تھا کہ اس نے دیکھا کہ بی اللہ رکھی بیٹھی ہیں اور میاں چانڈو باز سامنے کھڑے پاؤں دبا رہے ہیں ۔۔۔ دیکھتے ہی آزاد کی تو گویا جان نکل گئی ہاتھ پاؤں کانپ اٹھے۔ اب ان کے دل میں خدائی بھر کے خیالات آئے الٰہی! یہ یہاں کیوں آئیں پتہ کس نے بتایا اب ان کا منشا کیا ہے خدا ہی خیر کرے۔

خوجی: اجی ابھی ہم اور آپ کے سالے میں بڑی ٹھائیں ٹھائیں ہو گئی۔ وہ تو کہیے قرولی نہ تھی ورنہ سالار جنگ کا حلیہ بگاڑ دیتے بس شکر کرو یار تم بچ گئے

آزاد: چپ نامعقول سالار کس کا اور سسرا کیسا چانڈو کے نشے میں لگا بے تکی ہانکنے۔ بڑا قرولی باز بنا ہے چلو باہر ٹھیرو

جب تنہائی ہوئی آزاد نے اللہ رکھی سے پوچھا کہ کہیے کس طرح تشریف لائی

ہیں آپ

اللہ رکھی وہ بھٹیاری ہیں جن سے مذاق مذاق میں آزاد نے شادی کا وعدہ کرلیا تھا اور پھر ان کے انکار پر اس نے مقدمہ کر دیا تھا وہ آزاد کو تلاش کرتے کرتے یہاں تک آن پہنچی تھی۔ بڑی مشکل سے آزاد نے اس کو سمجھایا بجھایا اور اس سے اپنی جان چھڑائی۔ اللہ رکھی کو بھی عقل آ گئی اور وہ واپس جانے پر تیار ہوگئی دوسرے روز آزاد بھی آگے سفر پر روانہ ہو گئے۔ کیونکہ اب ان کی طبیعت ٹھیک ہو چکی تھی سفر کرتے کرتے دونوں لکھنؤ پہنچ گئے۔

☆☆☆☆☆☆

فری میسن

لکھنو میں میاں آزاد گھومتے گھامتے اور خوجی افیون کے نشے میں جھومتے جھامتے ایک نواب کے دولت خانے پر پہنچے کوٹھی سجی سجائی بیشمار کمرے سب سجے ہوئے، دلہن بنے ہوئے مسہریاں کوچ قرینے سے آراستہ وہ سامان کہ جس نے دیکھا دنگ رہ گیا خوجی اپنے نواب کے ٹھاٹھ باٹھ بھی بھول گئے۔ خیر دونوں جا کر ادب سے بیٹھے۔ خوجی تو نواب زادوں کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے ہی دیکھتے ہی کوٹھی کی اس قدر تعریف کی کہ پل باندھ دیے۔

خوجی: حضور خدا اور خدا کا رسول جانتا ہے کہ کیا سجی سجائی کوٹھی ہے دلہن ہے دلہن قسم ہے حسین کی جو آج تک ایسی عمارت اور اس سج دھج کی تعمیر نظر سے گذری ہو۔ ہم نے تو اچھے اچھے رئیسوں کی مصاحبت کی ہے مگر واللہ ہے جو کبھی یہ ٹھاٹھ کہیں دیکھے ہوں۔ خدا ایسے رئیسوں کو سلامت رکھے۔ حق تعالی ہمیشہ بامراد رکھے۔ ان کی بدولت ہزاروں غریبوں شریفوں کا بھلا ہوتا ہے۔ بہت دنوں بعد ایسے امیر دیکھنے میں آئے۔ اس وقت جی خوش ہو گیا۔

مصاحب: اجی آپ نے دیکھا کیا ہے یہاں دن عید رات شب برات ہوتی ہے پرستان کی دم میں نمدا بہشت بھی اس کے آگے مات ہے ہر وقت زمزمے، چہچہے اور قہقہے تمام کوٹھیاں اور بارہ دریاں اور عمارتیں آپ نے ابھی دیکھیں کہاں اور مصاحب لوگ تو اب آتے چلے ہیں۔ شام تک سب آ جائیں گے ایک میلہ کا میلہ روز جمتا ہے۔

نواب: کیوں صاحب یہ فری میسن بھی جادوگر ہیں شاید آخر جادو نہیں تو اور کیا ہے

رفیق: بجا ارشاد ہوا پیرومرشد جادو ہی ہے جادو برحق کرنے والا کافر یہ سب جادوگر ہیں

مصاحب: خداوند ایک فری میسن کی مجھ سے ملاقات ہوئی تو میں آپ جانیے کتنا کائیاں حضور میں نے اس کے ساتھ خوب یارانہ پیدا کیا بڑی گہری دوستی ہوئی۔

ایک دن میں نے پوچھا کہ "کیوں یار سچ کہنا یہ فری میسن کیا شے ہے؟ آخر اس کا راز تو بتاؤ بھئی ہم تو جانتے ہیں جادو ہے"

وہ بہت ہی جھلائے اور کہا

"آپ کی ایسی تیسی جادو کیسا جادو کے تو آج تک یہاں قائل ہی نہ ہوئے۔ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ باقی فری میسن تو وہ مذہب ہے جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مذہب ہی نہیں۔"

ہم نے کہا "یار! بے جانے تو ہم خیر تم سے کیا اتفاق کرلیں"

تو انہوں نے کہا "تو پھر فری میسن ہی کیوں نہیں ہو جاتے کہ کسی سے پوچھنے کی حاجت ہی نہ رہے۔"

میرے بھی دل پر آ گئی ایک دن ان کے ساتھ فری میسن ہوئے وہاں حضور کروڑوں لاشیں تھیں اور سب کی سب مجھ سے گلے ملیں اور ہنسیں میں بہت ہی ڈرا مگر ان لوگوں نے دلاسا دیا کہ پاگل ہے جو ان سے خوف کرتا ہے لیکن خبردار

کسی کہنا نہیں ورنہ یہ کچا ہی کھا جائیں گی۔ اتنے میں آگ برسنے لگی اور میں جل بھن کر خاک ہو گیا۔ اس کے بعد ایک شخص نے کچھ پڑھ کر پھونکا تو بندہ درگاہ ہٹے کٹے ٹیاں سے موجود تب تو بندہ کفن پھاڑ کر چیخ اٹھا اور بھاگنے لگا مگر سب کے سب چمٹ گئے۔ اور گھسیٹ لے گئے لیکن حضور سچ تو یہ ہے کہ کوئی دوسرا ہوتا تو رو دیتا میں مستقل رہا لیکن یہ کہتا تھا کہ میں فری میسن نہ ہوں گا نہ ہوں گا تب تو ایک موٹے تازے آدمی نے مجھے ایک حوض میں دھکیل دیا اور وہاں میں دو دن دو رات رہا۔ بالکل مردہ افسردہ آخر نکالا گیا اور سب کی صلاح ہوئی کہ کھوٹا آدمی ہے اس کو یہاں سے نکال دو ہم نکالے گئے خدا خدا کر کے بچے ورنہ جان ہی پر بن آئی تھی اور عزت ہی گنوائی تھی۔

میاں آزاد نے جو یہ جھوٹی داستانی سنی تو آگ بھبھوکا ہو گئے سوچے کہ اللہ اکبر! ان نوابوں کے مصاحب بھی کیا بے پر کی اڑاتے ہیں اور رئیسوں کو کیسے جلد دم میں لاتے ہیں اور وہ بھی کس سادگی سے ان کی ہر بات مانتے چلے جاتے ہیں توبہ توبہ اس گپ کو دیکھیے کہ دو دن دو رات آپ حوض میں مردہ افسردہ پڑے رہے۔ سبحان اللہ کیا خوب تحقیقات فری میسن کی ہے کہنے لگے کروڑوں لاشیں تھیں اور سب کی سب بول رہی تھیں اس جھوٹ پر شیطان کی پھٹکار لاحول ولاقوت واللہ ان رئیسوں کو دم میں لانا کوئی بات ہی نہیں یار لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔

رفیق: حضور! اس جادو کو بھی خدا نے کیا زور بخشا ہے جادو برحق ہے ہاں جادوگر کافر ہے

خاشامدی: پیرو مرشد! کل رات کو حضور تو یہاں پڑے آرام فرماتے تھے میں دو بجے کے قریب قرآن شریف پڑھ کر ٹہلنے لگا تو حضور کے سرہانے پر اوپر آسمان سے روشنی سی ہوئی میرے تو ہوش اڑ گئے

رفیق: ہوش اڑ جانے کی تو بات ہی ہے

خوشامدی: جی اس میں کیا شک ہے بس خداوند میں رات بھر جاگتا رہا اور حضور کے پلنگ کے اردگرد پہرا دیتا رہا ایک ہانڈی سی تھی اس میں کوئی شے ایسی جلتی تھی جیسے گیس کی روشنی ہوتی ہے۔

نواب: (کانپتے ہوئے) تمہیں قرآن کی قسم

خوشامدی: پیرو مرشد! حضور کے طفیل میں میرے بال بچے پرورش پاتے ہیں۔ بھلا آپ سے اور جھوٹ بولوں نمک کی قسم سچ عرض کرتا ہوں رونگٹا رونگٹا بدن کا کھڑا ہو گیا گھنٹوں سہارہا اگر میرا باپ بھی سوتا ہوتا پہرا نہ دیتا مگر حضور کا نمک جوش کرتا تھا۔

رفیق: حضور ان باتوں کو جانے دیجئے اب یہ فرمائیے کہ گھوڑیوں کی ایک جوڑی بکاؤ ہے حضور خریدیں تو دکھاویں کہ کیا جوڑی ہے کہ اوہو ہو ڈیڑھ ہزار سے کم نہ دے گا حضور ہی کی سواری کے قابل ہے۔

نواب: کوئی ہے؟

مصاحب: ارے وئی ہے ارے کوئی ہے (سب چلا اٹھتے ہیں)

خدمتگار: دو ہزار روپیہ روشن علی کو ابھی دو اور دو سائیس ان کے ساتھ بھجواؤ اور ایک سپاہی ابھی جائے ابھی

نواب کے حکم کی دیر تھی کہ ان لالہ نے مہاجن کے گھر کی راہ لی روشن علی ساتھ دو سائیس اور ایک سپاہی پیچھے پیچھے

لالہ: لالہ جواہر مل! سرکار نے بھیجا ہے اس وقت دو ہزار کی ضرورت ہے جلد لایئے میرا بھائی دیر نہ لگانا ورنہ میں نکال دیا جاؤں گا!

جواہر مل: تو جلدی کاہے کی ہے ذرا دم لو حقہ پیو آخر یہ روپیہ کیا ہوگا؟

لالہ: ایک جوڑی لی جاوے گی روشن کی معرفت

روشن علی: (لالہ کے کان میں) استاد دیکھو ہم کو بدنام نہ کرو یار بھئی چار سو کی جوڑی ہے باقی رہ ہے سولہ سو اس میں سے اٹھ سو اور یار لوگوں کو جائیں گے کسی کو سو کسی کو پچاس باقی رہے آٹھ سو چھ سو ہمارے دو سو تمہارے بھئی معاملے کی بات ہے

لالہ: تم تو لو چھ سو اور ہم لیں دو سو اچھا معاملہ ہے میاں بھائی ہو نہ ارے یار تین سو ہم کو دے پانچ سو تو اڑا یہ البتہ معاملے کی بات ہے

روشن علی: یار تم لوگ تو وہ زیر کی گانٹھ ہو کہ تمہارے کاٹے کا منتر ہی نہیں لاکھوں روپیہ کھا جاؤ مگر لنگوٹی باندھے ہوئے اور پھٹی ٹوپی سر پر رکھے ہوئے اچھا بھئی تین سو تمہارے پانچ سو، ہمارے

غرض لالہ جواہر مل نے دو ہزار روپیہ گن دیا اور لالہ نے روشن علی کو تین سو کم دو ہزار یعنی سترہ سو روپے دیے میاں روشن علی نے سوا چار سو کی جوڑی خریدی اور اسی وقت لے جا کر نواب صاحب کو دکھائی اور کہا کہ کوڑیوں کے مول خریدی ہے

مصاحب: اہو ہو ہو گھوڑی کیا پرستان کی پری ہے ایسی ہم رنگ جوڑی دیکھی

نہ سنی

رفیق: کیا ذرا سی تھوتھنی ہے کیا چوڑی پیشانی ہے

خوشامدی: واللہ کنوتیاں تو دیکھیے ہائے پیار کر لینے کو جی چاہتا ہے

زمانہ ساز: حضور ایسے جانور قسمتوں سے ملتے ہیں واللہ جناب باری کی قسم شہر بھر میں اس ساتھ کی دوسری جوڑی نہیں ملے گی

مطلبی: اس میں کیا شک ہے مگر بھئی بڑے سستے داموں آئی واللہ دو ہزار کی ایک ایک گھوڑی ہے کیا خوبصورت ہاتھ پاؤں ہیں واللہ اور لطف یہ کہ کوئی عیب نہیں

نواب: بھئی اس کو حفاظت سے بندھواؤ کل شام کو فٹن میں جوتنا دیکھیں کیسی جاتی ہے۔

زمانہ ساز: اے خداوند سبحان اللہ آندھی کے موافق جائے بگولا بن جائے کیا دل لگی ہے کچھ۔

☆☆☆☆☆

لکھنو کا ریلوے سٹیشن

میاں آزاد لکھنو کے سٹیشن پر پہنچے تو وہ چہل پہل وہ بھیڑ بھڑ کا ور دھم پیل کہ شانہ سے شانہ چھلتا تھا آزاد اپنے دل میں سوچے کہ اللہ اللہ ریل کا سٹیشن کیا خاصہ میلہ ہے یہ رونق بھئی واہ رے لکھنو واللہ ایسا سٹیشن بھی نہیں دیکھا میاں آزاد ٹہلتے ہوئے سٹیشن کے اندر گئے ہوٹل دیکھا تو باچھیں کھل گئیں اوہو ہو کیا صاف شفاف ہے ہر شے قرینے سے چنی ہے درو دیوار سے صفائی ہو رہی ہے۔ ہر سمت نور کا عالم ہے اس سرے سے اس سرے تک میز اور اس کے گرد اگرد کرسیاں گلاس چنے ہوئے لیمپ اور کنول ہر طرف روشن ہیں یہاں آزاد بھی کرسی پر جا کر ڈٹ گئے۔

"کھانا لاؤ مگر شراب کا لگاؤ نہ ہو اور سور کا گوشت قریب نہ آنے پائے"

ایک چپراسی صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے چوبداروں کی سی پگڑی باندھے ہوئے سامنے آن کھڑا ہوا

"حضور شراب تو نہ ہوگی مگر اور کیا آپ نے حکم دیا"

"میاں آزاد نے کہا سور کا گوشت نہ ہو"

"نہ حضور کیا مجال ہے"

یہ کہہ کر چپراسی نہایت ہی قیمتی بیش بہا پلیٹوں میں طرح طرح کا انگریزی کھانا لایا میاں آزاد نے چھری کانٹے سے خوب مزے سے کھایا اور سوڈا واٹر اور لیمو بنڈ پیا اور باہر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میاں خوجی بھی بستر جمائے ہوئے پراٹھے کباب کلیجے کھا رہے ہیں۔

آزاد: واہ استاد! تم تو خوب مزے سے کباب اڑا رہے ہو

خوجی: پھر؟۔۔۔۔۔کوئی شراب اڑائے کوئی کباب کھائے

آزاد: ایں! شراب؟ لاحول ولاقوۃ ارے میاں شراب کس نے منہ سے لگائی یہ کس کی شامت آئی

خوجی: اور آگے بھی تو کہیے

آزاد: قسم قرآن کی کس نے شراب کا ایک قطرہ بھی چھوا ہو شراب پی ہو تو سور ہی کا گوشت کھایا ہو۔

خوجی: (مسکرا کر) تسلیم یک نہ شد دو شد آپ نے سور کا گوشت کب چھوڑا ہو گا واللہ مانتا ہوں کہنے لگے شراب پی ہو تو سور کا گوشت کھایا ہو یہ تو آپ تب کہیں جب اس کو حرام یا مکروہ بھی سمجھیں آپ تو دونوں کو حلال اور ان کے استعمال کو اچھا سمجھتے ہیں یار آج تو تم نے غضب ہی کر دیا۔

آزاد: ارے بھئی آخر کیا کہو کہو گے بھی سبحان اللہ قسم لے لو جو ہم نے شراب کو ہاتھ بھی لگایا ہو یا سور کے گوشت کی صورت بھی دیکھی ہو۔

خوجی: یہ آپ نے خوب کہی کہ سور کے گوشت کی صورت نہیں دیکھی ہو گی مگر یار مزہ تو خوب چکھا ہو گا۔ اور شراب کو ہاتھ آپ کیوں لگانے لگے لگائی تو ہو گی گلے اور آپ کی قسم کا کس مردود کو اعتبار ہے قسم کو تو آپ مانتے ہی نہیں مجھے آج تک یہی نہیں معلوم ہوا کہ آپ کا دین ایمان کیا ہو تمہارا تو بابا آدم ہی نرالا ہے خیر جی اپنی اپنی سب بھگت لیں گے ہم کو اس سے کیا واسطہ

آزاد: نہ ہاری مانتے ہو نہ جیتی

خوجی: مانیں کیا خاک مانیں کیا ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چھری کانٹا کھٹا کھٹ چل رہا ہے۔

آزاد: تو بھئی چھری کانٹے سے کوئی شراب پیتا ہے

خوجی: ہم کیا چاہیں ہماری جانے جوتی کہ شراب کیونکر پیتے ہیں یہ تو کسی اپنے ایس نوش سے تحقیقات کیجئے واللہ بس تم گئے گزرے

آزاد: آپ ایک کام کیجئے ہوٹل میں جا کر۔۔۔۔۔

خوجی: اے لاحول اے لاحول خدا ایسی جگہ کسی سچے اور پکے مسلمان کو نہ لے جائے توبہ توبہ (اپنے کان پکڑ کر) خداوند بچائیو گنہگار بندہ ہوں ارے توبہ ہوٹل میں اور ہم جائیں لاحول ولاقوت بس آپ کو مبارک رہے۔

میاں آزاد ٹہلنے لگے اور خوجی نے کباب کلیجے خوب اڑائے جب صفاچٹ کر چکے تو حلوائی کی دکان سے برفی لائے

اتنے میں ایک بزرگ نے میاں آزاد کو مخاطب کر کے کہا

''کیوں حضرت آپ کا اسم مبارک''

یہ بولے ''میاں آزاد''

وہ مسکرائے اور کہا: ہاں واللہ آپ کے قد وقامت اور وضع قطع پر یہ نام موزوں ہے اور آپ کی ملت کیا ہے؟

آزاد: حضرت بندہ مسلمان ہے آپ کا اسم شریف مولوی صاحب

مولوی صاحب: اسم شریف تو چھپر پر رکھیے اس وقت مجھے افسوس کرنے دیجئے

آزاد: بسم اللہ آپ افسوس کر لیجئے بلکہ رو دیجیے مگر سنیئے تو ابھی محرم کے دن قریب ہیں خوب پیٹ بھر کے رو لیجئے گا ایسی بے تابی کیا ہے۔

مولوی صاحب: آپ مسلمان اپنے آپ کو بتاتے ہیں اور ہوٹل میں جا کر شراب خانہ خراب استعمال میں لاتے ہیں اللہ کے بندے کچھ انجام کی بھی فکر ہے یا دنیا کے کتے ہی بنے رہو گے۔

آزاد: قبلہ بس اب کیا کہوں کوئی کلمہ زبان پر آنے نہیں پاتا لاحول ولاقوۃ

مولوی صاحب: بے ادبی معاف لاحول تو آپ اپنے ہی اوپر پڑھتے ہیں آپ سے ایسی ہی شیطانی حرکت سرزد ہوئی ہے۔

آزاد: مولانا خدا کی قسم میں نے ہوٹل میں صرف کھانا کھایا ہے مگر وہ چیزیں جو حرام نہیں ہیں اب انصاف کی نظر سے دیکھیے کہ اس میں برائی بھی کیا ہے۔

مولوی صاحب: مجھ سے سنیئے میں عرض کروں ہوٹل میں جانا مسلمانوں کے لیے اچھا نہیں ہے جو کھانا آپ نے ہوٹل میں کھایا ہے اگر باہر منگوا کر اور فرش بچھوا کر کھاتے تو کوئی حرج نہ تھا، گو یہ بھی معیوب تھا مگر اس درجہ نہیں پھر اب لاکھ قسمیں کھایئے قرآن اٹھایئے یقین کس ملعون کو آئے گا کہ آپ نے شراب نہیں پی یا سور کا گوشت نہیں کھایا کاجل کی کوٹھری میں جو جائے گا وہ منہ کالا کر کے آئے گا۔ کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے ہی ہوتے ہیں۔ آخر باہر بھی تو کباب، کلچے، شیرمال، پراٹھے، باقر خوانی، روغنی روٹی، بسکٹ سب ہی کچھ بکتا ہے۔ پھر وہاں کھانے میں کون سی بہتری تھی مفت میں اپنے آپ کو نکو بنانا اور ہنسوانا کون سی دانائی ہے۔

آزاد: حضرت وہاں اول تو کھانا عمدہ اور لذیذ ہے دوسرے جگہ صاف شفاف جس لطف سے ہم نے وہاں کھانا کھایا وہ یہاں کہاں قلی کھڑا پنکھا جھل رہا ہے صاف ستھرا پنکھا جھل رہا ہے پلیٹیں صاف، میز شفاف، چار چار چپراسی خدمت کے لیے کھڑے ہیں یہاں یہ باتیں کہاں لاحول ولاقوۃ۔

مولوی صاحب: کھانا عمدہ تو آپ سمجھتے ہوں گے باقی رہا پنکھا تو ایک پیسہ دیجیے گھنٹہ بھر پنکھا جھلوا لیجیے اور صفائی کو مسافرت سے کیا کام حالانکہ یہاں بھی کوئی گندی شے نہیں یوں وحشت کی بات ہی اور ہے خیر حضرت آپ جانیں آپ کا کام جانے مانو یا نہ مانو اس سے یہاں غرض نہیں ماننا نہ ماننا آپ کے ہاتھ ہے ہم نے کہہ دیا۔

میاں آزاد نے اپنے دل میں سوچا کہ آج سے ایسی حماقت نہ کریں گے کہ ڈنکے کی چوٹ ہوٹل میں جائیں اور مفت میں اپنے آپ کو ہنسوائیں یوں تو ہمیں اختیار ہے کہ چاہے ہوٹل میں جائیں یا جو چاہے کھائیں مگر خاموشی کے ساتھ یہ نہیں کہ اسٹیشن بھر میں گھومتے پھریں۔

خوجی: کیوں جی ایک ہمیں کو آپ الو بناتے تھے اب تو ایک مولوی صاحب نے آپ کو قائل کر دیا۔ بات ترے کی اور ہوٹل میں کھاؤ اور ایک ان پر کیا فرض ہے۔



نواب صاحب کا مینڈھا

میاں آزاد اور خوجی دوسرے دن پھر نواب صاحب کی کوٹھی میں پہنچ گئے شام ہو رہی تھی اتنے میں موذن نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا ایک بولا:

"روزہ افطار کرنے کا وقت آ گیا"

دوسرے نے کہا: "جی ہاں آ گیا چنیا بیگم (افیم) کہاں ہیں" اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

نواب: قسم قرآن کی ہمیں آج تک معلوم ہی نہ ہوا کہ روزہ رکھنے سے فائدہ کیا ہوتا ہے مفت میں اپنے آپ کو ہلاک کرنا کونسا ثواب ہے واللہ جو آج تک ہماری سمجھ آیا ہو۔

آزاد: آفرین کیا خوب بات کہی ہے بالکل درست ہے پیر و مرشد

مصاحب: خداوند! میں پوچھتا ہوں کہ آخر اس فاقے سے فائدہ ہی کیا ہوتا ہے

نواب: (مسکرا کر) کیا خوب یہ تو کسی روزہ دار سے پوچھو مجھ سے اس کی تحقیقات فضول ہے۔ یہاں جب سے پیدا ہوئے قسم لے لیجئے جو کبھی ایک دن بھی فاقہ کیا ہو۔ ارے میاں اول تو روزہ رکھنا اپنے آپ کو ہلاک کرنا ہے۔ پھر بھوک میں نماز اور عبادت کی کس کو سوجھتی ہے۔ توبہ توبہ کیجئے دوسرے یہ کہ جب دن بھر کڑاکے کا فاقہ کیا ہو تو رات کو شل ہو کر سو رہے اور یار لوگ تو سحری الگ اڑاتے ہیں اور شام کو الگ دو تین سیر ستیاناس کرتے ہیں مگر ہاں دو چار مولوی بڑا

ریاض کرتے ہیں کھاتے بھی کم ہیں اور سوتے بھی نہیں اور دن رات عبادت ہی کیا کرتے ہیں مگر ایسے اتنے ہیں کہ مجھ سے کہیے تو انگلیوں پر گن لوں۔

رفیق: بجا ارشاد ہوا پیرومرشد اور یہ دیکھیے آپ ہی کے نمک کی قسم ہے کہ دن رات کھانے میں فکر رہتی ہے۔چار بجے اور لونڈی پر پڑنے لگیں بے بھاؤ کی اٹھتے جوتی اور بیٹھے لات۔لہسن لا، پیاز بگھار، کباب پکیں، میٹھے ٹکڑے پکیں، الٰہی توبہ۔

ہندو مصاحب: جی ہاں ہمارے یہاں بھی برت (روزہ) رکھتے ہیں لوگ مگر ہم نے تو ہر برت کے دن گوشت کھایا۔

رفیق: شاباش ہے لالہ شاباش واللہ کیا پکا مذہب ہے تمہارا

نواب: تربیت یافتہ ہیں نا بھئی کچھ گنوار جاہل تو ہیں نہیں

لیموں نچوڑ: واہ حضور کیا خوبصورت بات پیدا کی ہے

خوجی: قسم حسین کی کیا خیالات ہیں حضور کے، واہ وہ بات پیدا کی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔

مصاحبین: (قہقہہ لگا کر) واہ حضرت کیا تعریف کی ہے کہنے لگے توبہ ہی بھلی واہ ری تیری توبہ ہی بھلی یہ توبہ ہی بھلی کی ہی کہی یار خدا کے لیے ذری سمجھ بوجھ کر بولا کرو۔

رفقا: اے حضرت بولیں کیا بس اب بولنے کے دن گئے

خوجی: (دوزانو ہو کر) میاں ایک ایک آ دیا کھو چو مکھی لڑیں۔ہم اس میں بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے میاں سنو! یہاں عمر بھر رئیسوں، امیروں، نوابوں ہی کی صحبت میں رہے۔تم لوگ ابھی کچھ دن سیکھو ابھی بچے ہو جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش ابھی

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو دودھ کے دانت بھی نہ ٹوٹے ہوں گے۔ آپ اور ہمارے منہ آئیں واللہ ایک بار ہمارے نواب صاحب کے یہاں ایک ذات شریف تشریف لائے۔ بڑے طرح دار اور زبان آور میاں آزاد ان کا نام تھا آتے ہی فقرے بازی کرنے لگے بس قبلہ جو آڑے ہاتھوں لیا تو جھینپ کر نوک دم بھاگے۔ واللہ ہے وہ آڑے ہاتھوں لیا کہ ان کی نانی ہی مر گئی۔ آزاد، آزاد بڑے آزاد بنے تھے۔ ایسے جھینپے کہ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں نواب کے یہاں جو آیا اس نے منہ کی کھائی دم دبا کر بھاگا۔ میرے مقابلے میں کوئی ٹھہرے تو بھلا لے بس آپ ایک بلا یئے دو، دو چونچیں ہوں دم دبا کر نہ بھاگیں تو مونچھیں منڈوا دوں۔

مصاحب: (آگے بڑھ کر) آیئے بس آیئے دو دو نہیں چار چار چونچیں آہی آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ بندے کی زبان بھی وہ زبان ہے کہ کترنی کو مات کرے زبان آگے جاتی ہے تلفظ پیچھے رہتے جاتے ہیں۔

خوجی: زبان کیا چرخا ہے رانڈ کا واہ ری زبان خدا جھوٹ نہ بلوائے تو رے اور زے اور ڑے اور ٹے زبان سے نہ نکلتا ہوگا ''روٹی'' کو تو حضور ''لوتی'' کہتے ہوں گے۔

مصاحب: ''خدا جھوٹ نہ بلوائے'' کی بھی اچھی کہی آپ اور جھوٹ نہ بولیں جب سے ہوش سنبھالا کبھی سچ بولے ہی نہیں عمر بھر میں ایک بار دھوکے سے سچ زبان سے نکل گیا تھا جس کا آج تک افسوس ہے۔

خوجی: اور وہ واقعہ میں بتاؤں جب آپ ایک دفعہ سچ بولے تھے ایک شخص

نے ان کے باپ کا نام پوچھا۔ انہوں نے جلدی سے صاف صاف بتا دیا اس کا آج تک رنج ہے۔

اس پر سب کے سب ہنس پڑے اور خوجی موچھوں پر تاؤ دینے لگے۔

خوجی: کیوں حضرت کچھ فرمایئے تو آپ تو خاموش ہی ہو رہے

مصاحب: اجی تم جیسے گدھوں سے کیا بحث کریں

خوجی: گالیاں دیجیے گالیاں پالی پی کر کوسے پنجے جھاڑ کر لڑنے لگے لاحول ولاقوۃ

دوسرے دن پھر میاں آزاد اور میاں خوجی نواب صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔

خوجی: حق تعالے ایسے رئیس کو ہمیشہ سلامت رکھے

مصاحبین: (بلند آواز سے) آمین ثم آمین

خوجی: کیوں پیرو مرشد آج کچھ چہل پہل نہیں ہے۔

مصاحب: چہل پہل ہی کی آپ کو سوجھتی ہے چہل پہل کیا خاک ہو ایک بہت بڑا واقعہ ہو گیا ہے۔

خوجی: الٰہی خیر الٰہی خیر بھئی بڑی بری سنائی خداوندا انجام بخیر کرنا پاؤں تلے سے زمین نکل گئی (آہستہ سے) کچھ حال تو کہیے خیریت تو ہے۔

آزاد: خدا خیر کرے حضرت کچھ تو فرمایئے

نواب: (سرد آہ کھینچ کر خاموش ہو رہے)

مصاحب: (غمگین صورت بنائے ہوئے گردن جھکائے ہوئے)

رفیق: (رفیق سر پکڑ کر چپ چاپ بیٹھے ہوئے افسوس کر رہے ہیں)

اتنے میں ایک صاحب بول اٹھے

''حضرت کیا عرض کیا بس کچھ نہ پوچھیے نواب صاحب کا ایک مینڈھا مر گیا کیسا تیار تھا کہ میں کیا کہوں گینڈا بنا ہوا تھا۔''

مصاحب: واہ کیا بھونڈی تعریف کی ہے کہنے لگے گینڈا بنا ہوا تھا۔ اے یوں کیوں نہیں کہتے کہ گینڈے کو ٹکر مار دیتا تو تیں کر کے بھاگتا پٹا تو ڑ کر۔

ایک دفعہ میں اپنے ساتھ اسے عیش باغ لے گیا۔ وہاں دو چار آدمی مینڈھے لیے کھڑے تھے۔ ہفتے کا دن ساون کا مہینہ میلہ جما ہوا اتنے میں ایک راجہ صاحب ہاتھی پر سوار بڑے ٹھاٹھ سے آرہے تھے۔ ہم مینڈھے کو لیے ہوئے عین سڑک پر ڈٹے کھڑے تھے۔ اتنے میں ایک نے للکارا کہ ''ہٹا بکری کو سامنے سے'' بھائی اتنا کہنا تھا کہ میرا چہرا مارے غصے کے تمتمانے لگا آگ ہی تو ہو گیا میں نے پوچھا:

''کیا کہا بھائی پھر تو کہنا''

وہ آنکھیں نیلی پیلی کر کے کہتا کیا ہے

''ہٹا بکری کو سامنے سے سواری آتی ہے''

تب تو میں نے مینڈھے کو للکارا ایک ہی دفعہ بلا کی طرح جھپٹ کر ہاتھی کی مستک پر ایک ٹکر لگائی ''کھٹاک'' وہ آواز آئی کہ جیسے کوئی تناور درخت زمین پر آ رہا۔ بندر تو آپ جانیے عیش باغ میں ڈال ڈال چیخنے لگے۔ بندریائیں بچوں کو چھاتی سے لگائے دبک رہیں۔ بندروں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ہوا دراصل یہ کہ ان کو مینڈھے پر بھیڑیے کا دھوکا ہوا۔

خوجی: حضرت وہ آپ کے مینڈ ھے کو بھیڑیا سمجھے مگر واللہ آپ کو بے دم کا لنگور سمجھے ہوں گے جب ہی آنکھیں بند کر کے چپ چاپ بیٹھے رہے۔

ساری محفل یہ لطیفہ سن کر لوٹنے لگی مصاحب نے بھی تعریف کی کہ بھئی خوب کہی اور پھر داستان یوں شروع کی

''بس حضرت سلامت ایک ٹکر لگا کر پیچھے ہٹا اور ہٹتے ہی ڈپٹا اور بدن کو تول کر ایک دفعہ ہی جو طرارہ بھرتا ہے تو پھر مستک پر ایک اور ایک دو ٹکریں لگائیں اور پھر پھراتو اچک کر فیل بان کے ماتھے پر ایک ٹکر لگائی مگر آہستہ سے۔۔۔۔اس تمیز کو دیکھیے گا سمجھ گیا کہ اس میں ہاتھی کا سا زور کہاں یہ انسان ہے لہٰذا آہستہ سے ٹکر لگائی کہ کورے نہ بچیں۔مگر راجہ کا ادب کیا اب میں لاکھ لاکھ زور کرتا ہوں وہ سنتا کس کی ہے غصہ آیا سو آیا جیسے بھوت سر پر سوار ہو گیا چھڑا کے پھر لپکا اور ایک دو تین چار بس خدا جانے کتنی ٹکریں لگائیں کہ ہاتھی چنگھاڑ کر بھاگا۔یہ جا وہ جا آدمی پر آدمی گرتا ہے آپ جانیے ہاتھی کا بگڑنا کچھ ہنسی ٹھٹھا تو ہے نہیں۔''

تو قبلہ!۔۔۔۔۔۔وہ مینڈھا آج چل بسا

مصاحبین: انا للہ وانا الیہ راجعون

مصاحبین نے راجعون کی ''عین'' کو قرأت کے ساتھ ادا کیا مگر خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ایک کو بھی انا للہ وانا الیہ راجعون کے معنی نہیں معلوم تھے لیکن پڑھیں گے اس طرح گویا بڑے عربی دان ہیں۔

آزاد: کمال افسوس ہوا

خوجی: افسوس عمر کیا ہو گی اس کی

نواب: اے ابھی بچہ تھا جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش

مصاحب: حضور وہ آپ کا دشمن تھا، دوست نہ تھا

نواب: ارے بھائی کس کا دوست، کس کا دشمن۔۔۔۔وہ خود تو چلا گیا مگر ہم سب کو جیتے جی مار گیا۔

آزاد: پیرو مرشد نوجوان کی موت کا سخت رنج اور اس کے انتقال کا بڑا ملال ہوا

مصاحب: اور پھر جوان بھی کیسا کہ ہونہار ہاتھ مل کے رہ گئے یار کیا کریں کچھ بس چلتا ہے

آزاد: مگر تکلیف کیا تھی؟

رفیق: اجی تکلیف کیا بتائیں، بس قسمت ہی پھوٹ گئی

اتنے میں ایک نوکرانی آئی اور نواب صاحب کے کان میں جھک کر کہا

"بیگم صاحب ذری حضور کو بلاتی ہیں کہا کہ ابھی ابھی آیئے کچھ ضروری بات آپ سے کہنی ہے۔"

نواب: اللہ اللہ یہ نادری حکم اچھا صاحب چلیے

نواب صاحب محل میں داخل ہوئے تو بیگم صاحب نے خوب ہی آڑے ہاتھوں میں لیا اور بھگو بھگو کر لگائیں۔ ادھر انہوں نے دہلیز میں قدم رکھا اور وہ پل پڑیں۔ حتیٰ کہ باہر تک آواز آئی۔

بیگم صاحب: اے میں کہتی ہوں ایسی کیا مصیبت پڑ گئی کہ تم ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہو۔ مینڈھے نگوڑے مرا ہی کرتے ہیں۔ آج مرا کل دوسرا دن ایسی عقل پر ٹپکی پڑ جائے کہ لومڑے جانور کی جان کو رو رہے ہیں واہ رے دن پہ دن آپ کی

عقل کو دیمک چاٹے جاتی ہے اور ان مخت (مفت) خوروں نے اور بھی آپ کو چنگ پر چڑھایا۔ اللہ سوں (قسم) اگر آپ نے رنج وغم کیا تو ہم زمین آسمان ایک کردیں گے۔

نواب بھیگی بلی بنے غڑ غڑ سنا کیے اور جب بیوی خوب آڑے ہاتھوں لے چکیں تو ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا

"تمہارے سر کی قسم اب ہم اس کا ذکر بھی نہ کریں گے حالانکہ جب آپ کی بلی مرگئی تھی تو آپ نے کیوں دن بھر کھانا نہیں کھایا تھا اور پھر ہم نے آپ کو منایا تھا اور قسمیں دے دے کر کھانا کھلوایا تھا اور بڑے تکلف سے آپ نے لقمہ اٹھایا تھا اب ہماری باری آپ غراتی ہیں۔"

☆☆☆☆☆

داروغہ جی کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں

ادھر صبح ہوئی ادھر نواب صاحب زنان خانے سے برآمد ہوئے مصاحب اور رفیق تو پہلے ہی سے ڈٹے ہوئے تھے۔ سب نے سروقد تعظیم کی اور فرشی سلام کر کے قرینے سے بیٹھے نوکر نہایت عمدہ چائے کی صاف ستھری پیالیاں، کچھ چاندی کی کٹوریاں اور بیش بہا چمچے لے کر آئے۔ نواب صاحب نے ایک ایک پیالی اپنے دست مبارک سے سب مصاحبوں کو دی اور سب نے گرما گرم دودھ میٹھی چائے اڑانی شروع کی ایک ایک گھونٹ پیتے جاتے ہیں اور گپ بھی اڑاتے جاتے ہیں۔

مصاحب: حضور یہ چائے کشمیری خوب تیار کرتے ہیں

دوسرا مصاحب: واہ کہنے لگے کشمیری خوب تیار کرتے ہیں ہماری سرکار میں جو چائے تیار ہوتی ہے ساری خدائی میں تو ویسی بنتی نہ ہوگی ذرا رنگ تو دیکھیے

تیسرا مصاحب: قربان جاؤں حضور ایسی چائے تو بادشاہ کے یہاں بھی نہیں بنتی تھی خدا جاتے یہ میاں رحم اللہ کہاں سے نسخہ پا گئے واہ مگر ذرا تلخی باقی رہ جاتی ہے۔

رحم اللہ: سبحان اللہ آپ تو بادشاہوں کے یہاں چائے پی چکے ہیں اور اتنا بھی نہیں جانتے کہ چائے میں تلخی نہ ہو تو چائے ہی نہیں۔

رفیق: حضرت بعض آدمیوں کو نمکین چائے پیتے دیکھا ہے بھلا چائے کو نمک، مرچ، سونٹھ، ہلدی گرم مصالحہ سے کیا واسطہ اور سچ تو یوں ہے کہ اس افیون کی محفل

میں نمکین چائے بالکل پھیکی معلوم ہوتی ہے یہاں تو چوہا چوہا اینچی ہے پھر جب تک مصری یا قند چائے میں نہ ہو مزا کیسے آئے۔ اے توبہ چھونے کو جی تو چاہے نہیں

خدمتگار: خداوند شیودین حلوائی حاضر ہے

نواب: داروغہ جی اس حلوائی کا حساب کر دو اور اس کو سمجھا دو کہ اگر خراب یا سڑی ہوئی باسی مٹھائی بھیجی تو اس سرکار سے نکال دیا جائے گا پرسوں برفی خراب بھیجی تھی گھر میں شکایت کرتی تھیں۔

داروغہ: سنتے ہو شیودین! دیکھو سرکار کیا فرماتے ہیں خبردار سڑی گلی مٹھائی بھیجی تو تم جانو گے اب تم نے نمک حرامی کی کمر باندھی ہے۔ کھڑے کھڑے نکال دیے جاؤ گے ہاں بس کہہ دیا ہے تم سے تمہارے بھائی بند سینکڑوں در چوم کے مٹھائی دیں گے مگر تم راندے ہی جاؤ گے۔

حلوائی: نہیں کھداوند (خداوند) گلام (غلام) کی کیا مجال اول مال دوں، اول مال، چاشنی جرا (ذرا) بہت آ گئی تو دانہ کم پڑا اور ملائم نہ رہی سخت ہو گئی۔ نہیں تو یہ ہی دکان کی برفی تو شہر بھر میں ماشور (مشہور؟) ہے وہ لجت (لذت) ہوتی ہے کہ ہونٹھ بندھتے ہیں۔

داروغہ: چلو تمہارا حساب کر دیں لے بتاؤ کتنے دن سے خرچ نہیں پایا اور تمہارا کیا آتا ہے؟

حلوائی: جو حساب سے ہو

داروغہ: لاحول ولاقوۃ اور ہم پوچھتے کیا ہیں یہی تو پوچھتے ہیں کہ حساب کیا ہوا

حلوائی: اگلے مہینے میں پچیس روپیہ کچھ آنے کی آئی تھی اور اب کی دس تاریخ

انگریجی (انگریزی) تک کوئی ستر یا اسی روپے کی

داروغہ: اجی تم تو گدے بازیاں کرتے ہو ستر یا اسی یا سو یا پانسو اس مہینے میں اتنی، اس مہینے میں اتنی یہ بکھیڑا تم سے پوچھتا کون ہے اس جھنجھٹ سے ہمیں واسطہ کیا بھلا ہمیں تو بس اتنا بتا دو کہ اتنا ہوا

حلوائی: اچھا حساب تو کر لوں (تھوڑی دیر کے بعد) بس ایک سو بیالیس روپیہ اور دس آنے دیجئے چاہے حساب کر لیجئے بولتا جاؤں

داروغہ: اجی تم کوئی نئے تو ہو نہیں اب بتاؤ اس میں یاروں کا کتنا ہے سچ بولنا لالہ (پیٹھ ٹھونک) آؤ وارے نیارے ہوں کیوں؟ ہے نا!

حلوائی: بس سو ہم کا (کو) دے دیو بیالیس تم لے لو سیدھا سیدھا حساب میں تو یہ جانتا ہوں

داروغہ: اچھا منظور مگر بیالیس کے باون کر دو ایک سو تم لے لو باون ہمارے۔۔۔۔سچ کہنا کوئی چالیس کی مٹھائی اس مہینے اور اس مہینے ملا کر آئی ہو گی یا کم

حلوائی: اے ہجور (حضور) اب اس بھید سے آپ کو کیا واسطہ آپ کو آم کھانے سے گرج (غرض) ہے یا پیڑ گننے سے اور سچ تو یہ ہے کہ سب ملا کر کوئی اڑتیس روپے کی آئی ہو گی لیکن وزن میں کم کرا دیتا ہوں سیر بھر لڈو مانگ بھیجے تو ہم نے پاؤ سیر کم کر دیے۔

داروغہ: اس کی نہ کہیے میاں اندھیر نگری چوپٹ راج ہے یہ دماغ کسے کہ تولنے بیٹھے میاں لکھ لٹ بیوی ان سے بڑھ کر چین کرو دس کے پچاس لو اور سیر کی تین پاؤ بھیجو مزے ہیں اچھا یہ سو روپیہ گن لو اور ایک سو باون کی رسید ہمیں لکھ دو۔

حلوائی: یہ مول تول ہے سو اور پانچ ہم لیں اور باکی (باقی) ہجور (حضور) کو ممارک (مبارک) رہیں مالمے (معاملے) کی بات ہے

غرض داروغہ جی نے حلوائی کو راضی کرلیا۔ اس داروغگی کے صدقے! اڑتیس روپیہ کے ایک سو باون دلوائے اور بیالیس سے زیادہ ہی زیادہ خود ہضم کیے۔ اے پھٹکار! نمک حرام ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔

اب سنیے کہ میاں خوجی نے وہ ساری گفتگو سن لی جو داروغہ اور حلوائی میں ہوئی جب داروغہ صاحب نے شیودین حلوائی کو ہنسی خوشی رخصت کیا تو خوجی نے بڑھ کر یوں کہا

''اجی حضرت! آداب عرض ہے کہیے اس میں کچھ یاروں کا بھی حصہ ہے یا باون کے باون خود ہی ہضم کروگے اور ڈکار تک نہ لوگے اب ہمارا تمہارا ساجھا نہ ہوگا تو بُری ٹھہرے گی''

داروغہ: کیا؟۔۔۔۔۔کس سے کہتے ہیں آپ؟ یہ ساجھا کیسا آخر ہم بھی تو سنیں بھنگ تو نہیں پی گئے ہو کہیں یہ کیا واہی تباہی بک رہے ہو ذرا سمجھ کر بات زبان سے نکالا کیجئے یہاں بیہودہ بکنے والوں کی زبان نکال لی جاتی ہے۔

خوجی: (کمر کس کر) او گیدی قسم خدا کی اتنی قرولیاں بھونکی ہوں کہ یاد کرے مجھے بھی کوئی ایسا ویسا سمجھے ہو میں آدمی کو دم کے دم میں سیدھا بنا دیتا ہوں ذری کسی اور بھروسے نہ بھولیے گا کیا خوب اڑتیس کے ڈیڑھ سو دلوائے اور پچاس خود اڑائے اوپر سے غراتا ہے۔ بہت داروغگی کے بھروسے نہ بھولیے گا۔ میں ابھی نواب صاحب سے سارا کچا چٹھا جڑ تا ہوں کھڑے کھڑے نہ نکال دیے جاؤ تو سہی۔ ہم تمام عمر رئیسوں ہی کی صحبت میں رہے۔ گھانس نہیں چھیلا کیے ہیں بائیں ہاتھ سے

بیس روپے ادھر کو دیجئے بس اسی میں خیر ہے ورنہ الٹی آنتیں گلے پڑیں گی۔۔۔۔۔اب سوچتے کیا ہو ذرا چیں چپڑ کرو تو ابھی قلعی کھول دوں یہ اکڑنا وکڑنا سب بھول جایئے اور یوں تو بیس پر معاملہ ہوتا ہے بولو اب کیا رائے ہے بیس روپے سے غم کھاؤ گے یا ذلت اٹھاؤ گے پہلے تو بڑے گرم ہوئے تھے معلوم ہوتا تھا کہ کھا ہی جائیں گے مگر اب موم ہو گئے بس اب لایئے لایئے ورنہ خیر نہیں نظر آتی۔ابھی تو کوئی کانوں کان نہ سنے گا بعد میں البتہ ٹیڑھی کھیر ہے۔

داروغہ:واہ ری پھوٹی قسمت آج صبح صبح بوہنی تو اچھی ہوئی تھی اچھے کا منہ دیکھ کر اٹھے تھے مگر حضرت نے اپنی منحوس صورت دکھائی خدا جانے یہ ذات شریف کہاں سے سن رہے تھے لاحول ولاقوۃ واہ رے ہم اور واہ رے ہماری قسمت کیسے اب باون میں سے آپ کو بیس نکال دیں ہمارے پاس کیا خاک رہے اور ہاں خوب یاد آیا باون کس مردود کو ملے کل سینتالیس ہی تو ہمارے ہتھے چڑھے۔دس تم بھی لے لو(ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کر) مان جاؤ استاد ہمیں ضرورت تھی اس لیے اس سے کہا ورنہ کیا بات تھی اور پھر ہم تو زندہ ہیں تو سینکڑوں لوٹیں گے میاں یہ دونوں ہاتھ لوٹنے ہی کے لیے ہیں یا کچھ اور؟

خوجی:دس میں تو ہمارا پیٹ نہ بھرے گا اچھا بھئی پندرہ دو

غرض داروغہ نے مجبور ہو کر پندرہ روپے میاں خوجی کی نذر کیے اور دونوں آدمی جا کر شریک محفل ہوئے تو وہاں نواب کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ یہاں کیا وارے نیارے ہوئے۔

اختتام۔۔۔۔۔۔۔۔۔حصہ اول۔

فسانہ آزاد

حصہ دوئم

فسانہ آزاد حصہ اول تو آپ نے پڑھ لیا۔اب حصہ دوئم کی باری ہے۔میاں خوجی اور آزاد کے کارناموں سے یقینا لطف اندوز ہوں گے۔حصہ سوم اور حصہ چہارم بھی چھپ گیا ہے۔انھیں پڑھنے کے بعد ہی آپ فسانہ آزاد سے پوری طرح لطف اندوز ہوسکیں گے۔

پانچوں انگلیاں گھی میں سر کڑاہی میں

نواب صاحب کے ہاں حسب معمول محفل جمی ہوئی تھی۔گپ بازی ہو رہی ہے۔ اتنے میں ایک بزاز نے آن کر کہا کہ:۔

"خداوند! چھاونی کا بزاز آیا ہے جو ولایتی کپڑا بیچتا ہے۔کل بھی حاضر ہوا تھا۔مگر اس وقت موقع نہ تھا میں نے عرض نہ کیا۔"

نواب:۔داروغہ سے کہو مجھ سے کیا گھڑی گھڑی آ کر کہتے ہو(داروغہ سے)جاؤ بھئی ان کو بھی لگے ہاتھوں بھگتا ہی دو۔جھنجھٹ کیوں باقی رہ جائے۔

(بزاز سے) کچھ اور کپڑا آیا ہے ولایت سے۔آیا ہو تو دکھاؤ۔مگر بابا قیمت ٹھیک ہو۔

بزاز:۔دو روز تک سب کپڑا آ جائے گا اور ہجور(حضور)ایسی بات کہتے ہیں۔بھلا اس ڈیوڑھی پر ہم نے کبھی بھی مول تول کی بات کی ہے۔آج تک اور یوں تو آپ امیر ہیں جو چاہئیں کہیں۔مالک ہیں آپ ہمارے۔

داروغہ:۔چلو بھئی حساب ہو جائے۔

داروغہ اور بزاز چلے۔دونوں جا کر بیٹھے تو خوجی بھی رینگتے ہوئے چلے اور دن سے موجود۔داروغہ نے جوان کو دیکھا تو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔مردنی سی چہرے پر چھا گئی۔چپ ہوائیاں اڑی ہوئیں۔سمجھے کہ یہ خوجا ایک ہی کائیاں ہے۔دنیا بھر کا عیار۔اس سے خدا پناہ میں رکھے۔صبح مردود نے بیٹھے ہی پر ٹوک دیا اور پندرہ روپے ہتھیا لیے۔اب جو دیکھا کہ بزاز آیا ہے تو پھر موجود۔آج رات کو اس کی

ٹانگ نہ توڑی ہو تو سہی۔ٹھہر تو جا تو۔چچا ہی کو بنا کر چھوڑوں گا۔مگر پھر سوچا کہ

ع۔

گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دوں

پھر سمجھا جائے گا۔

خوجی:۔داروغہ صاحب سلام۔

داروغہ:۔آؤ بھائی جان ادھر مونڈھے پر بیٹھو اچھی طرح۔بھئی حقہ لاؤ آپ کے لئے۔

بزاز:۔صدر بازار کا رہنے والا۔ایک ہی استاد تاڑ گیا کہ اس بیٹھنے سے میرا اور داروغہ کا مطلب پورا نہ ہوگا۔کسی تدبیر سے اس کو یہاں سے نکالنا چاہیئے۔پہلے تو کچھ دیر داروغہ جی سے اشاروں ہی اشاروں میں کچھ بات ہوا کی۔اور پھر تھوڑی دیر بعد بزاز نے کہا:

"میاں صاحب آپ کو یہاں کچھ کام ہے کیا؟۔

خوجی:۔تم اپنی کہو لالہ جی ہم سے کیا واسطہ؟۔

بزاز:تم یہاں سے اٹھ جاؤ۔چلو اٹھتے ہو کہ میں دوں ایک لات اوپر سے۔

خوجی:۔او گیدی زبان سنبھال نہیں تو اتنی قرولیاں بھوکوں گا کہ خون خرابہ ہو جائے گا۔

بزاز:اٹھوں پھر میں؟۔

خوجی:۔اٹھ کے تماشا بھی دیکھ لے۔

بزاز:احمق ہے کیا؟۔

خوجی:۔واللہ جو بے تے کیا تو اتی قرولیاں ۔۔۔۔۔

قرولیاں کہہ کر خوجی کچھ کہنے ہی کو تھے کہ بزاز نے بیٹھے بیٹھے منہ دبا دیا۔اور ایک چپت جمائی۔چلیے دونوں گتھ گئے۔اب داروغہ جی کی سنیے کہ بیچ بچاؤ کس مزے سے کرتے ہیں کہ خوجی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور کمر دبائے ہوئے ہیں اور بزاز اوپر سے ان کو ٹھونک رہا ہے۔داروغہ صاحب گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے جاتے ہیں:۔ میاں کیوں لڑتے مرتے ہو۔بھئی دھول دھپا اچھا نہیں۔زبانی ہی زبانی ٹھیک ہے۔

خوجی اپنے دل میں جھلا رہے ہیں کہ اچھے میر فیصلہ بنے ہیں۔اتنے میں کسی نے نواب صاحب سے جا کر کہہ دیا کہ میاں خوجی۔بزاز اور داروغہ صاحب تینوں گھتے پڑے ہیں۔تو ایک مصاحب بولے بھئی واہ اچھی تگڈم ہے''

اتنے میں بزاز دوڑتا ہوا آیا اور نواب صاحب سے فریاد کی کہ:۔

ہجور(حضور) ہم آپ کے یہاں تو سستا مال دیتے ہیں۔مگر یہ کھوجی (خوجی) حساب کتاب کے وقت نہ ٹلے۔لاکھ لاکھ کہا کیے کہ بھئی ہم اپنے مال کا بھاؤ تمہارے سامنے نہ بتائیں گے۔لیکن انھوں نے ہار مانی نہ جیتی اور الٹے پنجے جھاڑ کر جھٹ پٹ کی ٹھہرائی مجور(کمزور) مار کھانے کی نشانی۔میں نے وہ گدا دیا کہ چھٹی کا دودھ یاد کرتے ہوں گے۔

داروغہ جی بھی روتے پیٹتے آئے کہ چارپائی کی پٹی توڑ ڈالی خاصدان توڑ ڈالا اور سینکڑوں کی صلواتیں سنا ڈالیں۔

میاں خوجی ایسے دھپیائے گئے اور اتنی بے بھاؤ کی پڑیں کہ بس کچھ نہ

پوچھیئے۔ داروغہ نے تو حضرت کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور بزاز نے تان تان کر لپڑ لگانے شروع کیے۔ خوجی نے دونوں کو گیدی بنایا اور بہت ڈانٹ ڈپٹ کی کہ لانا میری قرولی مگر ایک نے بھی نہ سنی۔ ادھر نواب کو جو خادموں نے خبر کی تو بزاز دوڑا دوڑا آیا اور فوراً یہ فقرہ چست کیا کہ:۔

''حضور میں تو حساب کرنے آیا تھا۔ مگر جس قیمت پر اس سرکار میں کپڑا افروخت کرتا ہوں اس قیمت پر کسی اور کے ہاتھ تھوڑا ہی بیچتا ہوں۔ خوجی وہاں داروغہ جی کے پاس ڈٹے بیٹھے تھے۔ میں نے سوچا سب قسم کے کپڑوں کی قیمت سے واقف ہو جائیں گے اور صورت سے آدمی کھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے ڈرنا چاہیے ۔ میں نے کہا کہ:۔

خوجی صاحب: آپ اس وقت ذرا باغ میں ٹہلیے تو ہم حساب کر لیں۔ بس اس پر آنکھیں نیلی پیلی کر کے بکنے لگے۔

نواب صاحب کے دل میں یہ بات کھب گئی۔ خوجی۔ داروغہ اور بزاز تینوں کو بلوایا اور بیان لینے شروع کیے۔

نواب: داروغہ صاحب یہ کیا جھگڑا تھا بھئی تم تو بیٹھے بیٹھے مینڈھے لڑا دیتے ہو۔

داروغہ:۔ حضور یہ خوجی صاحب تو بڑے تیکھے آدمی ہیں۔ بات بات پر قرولی بھونکتے ہیں اور گیدی تو تکیہ کلام ہے حضرت کا۔ اس وقت لالہ بلدیو ہی سے بھڑ پڑے۔ اب میں لاکھ ہاں ہاں کرتا ہوں سمجھاتا ہوں ۔ وہ ہاری مانتے ہیں نہ جیتی۔ وہ تو یہ کہیئے میں نے بیچ بچاؤ کرا دیا ورنہ ایک آدھ کا سر ہی پھوٹ جاتا۔

بزاز:۔ بڑے جھلے آدمی ہیں وہ تو دروگا جی و(داروغہ بیچارہ) نہ آجائیں تو کپڑے

و پڑے پھاڑ ڈالیں۔

خوجی: تو اب روتے کاہے کو ہو۔ جو ہوا سو ہوا۔ آئی گئی بات ہو گئی۔ اب یہ دکھڑا لے کے کیا بیٹھے ہو؟۔

نواب: ۔لپاڈکی تو نہیں ہوئی؟۔

خوجی: ۔نہیں حضور شریفوں میں بھی کہیں ہاتھا پائی ہوتی ہے بھلا۔ ہم نے ان کو للکارا۔ انہوں نے ہمیں ڈانٹا۔ مگر کندے تول تول کر دونوں رہ گئے۔ بھلے مانس پر ہاتھ اٹھانا کچھ دل لگی ہے کیا؟۔ اور پھر شریف کہیں پٹ کے آتے ہیں۔

واہ میاں خوجی۔ کیوں نہ ہو۔ اتنی بے بھاؤ کی پڑیں کہ چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہوگا۔ مگر نواب صاحب کے سامنے جا کر کیا شیخیاں جتاتے ہیں کہ شریفوں میں کہیں لپاڈکی کی نوبت آتی ہے۔ یہ نہ کہا کہ دونوں کے دونوں چمٹ گئے اور مارتے مارتے کچومر نکال دیا۔

خیر ادھر تو میاں خوجی نواب کی محفل میں جا کر بیٹھے اور ادھر لالہ بلدیو اور داروغہ صاحب گئے کہ حساب کرلیں۔

داروغہ: ۔ہاں بھئی لالہ بتاؤ۔

لالہ: جی بتائیں کیا۔ جو چاہو دلوا دو۔

داروغہ: ۔پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا آتا کیا ہے؟ سو دو سو۔ دس بیس۔ پچاس۔ جو ہو کہہ دو۔

لالہ: ۔داروغہ جی آج کل کپڑا بہت مہنگا ہے۔

داروغہ: ۔ لالہ تم تو نرے گاؤدی ہی رہے۔ اجی ہم کو مہنگے اور سستے سے کیا

واسطہ۔ہم کو اپنے حق سے مطلب ہے۔تم تو اس طرح کہتے ہو جیسے ہماری گرہ سے جاتا ہے۔

لالہ:۔پھر اب کی سات سوتر یپن روپے نکالیے۔

داروغہ:۔سات سوتر یپن بس۔ارے میاں اب کی بس اتنے دنوں ساڑھے سات سو ہی کی نوبت آئی۔

لالہ:جی ہاں آپ سے کیا پردہ دوسواور چھپن روپے کا کپڑا آیا ہے۔اندر باہر سب ملا کے۔مگر پرسوں نواب صاحب کہنے لگے کہ اب کی تو تمہارا کوئی پانچ چھ سو کا مال آیا ہوگا۔میں نے کہا ایسے موکے(موقع) پر چوکنا گدھاپن ہے۔وہ تو پانچ چھ سو بتاتے ہیں۔میرے منہ سے نکل گیا کہ حساب کیے سے معلوم ہوگا لیکن خیال ہے کہ سات آٹھ سو کا آیا ہوگا۔تو اب سات سوتر یپن ہی رکھیے۔اس میں ہمارا آپ کا سمجھوتا ہو جائے گا۔

داروغہ:اجی سمجھوتہ کیا۔ہم تم دو تو کچھ ہیں نہیں اور ہمارے تمہارے تو باپ دادا کے وقت کے مراسم ہیں۔تم تو اپنے عزیزوں کی طرح ہو۔لے بولو کتنے پر فیصلہ ہوتا ہے۔

لالہ:بس دوسوچھبیس تو ہم کو ایک دیجیئے اور تین سو اور دلوا دیجیے۔اس کے بعد جو بڑھے وہ آپ کا۔

داروغہ:ٹھہرو تو میں حساب لگالوں۔دواور تین پانچ ہوئے تو پانچ سو چھتیس تو تم لو اور وہاں بچا کیا سات سوتر یپن میں سے۔پانچ سو چھبیس گئے تو کتنے بچے؟۔

لالہ:دوسوستائیس۔

داروغہ: (قہقہہ لگا کر) اچھا بھئی منظور ہاتھ پر ہاتھ مارو۔

لالہ: پھر دلوایئے تو چلیں۔

داروغہ: ابھی لو گھبراتے کیوں ہو؟

داروغہ نے پانچ سو چھبیس روپے بزاز کے حوالے کیے اور دو سو ستائیس خود اڑائے۔ بزاز جانے لگا تھا کہ داروغہ نے پھر پکارا:۔

داروغہ:۔ بھئی سنتے ہو۔ سات سو ترپن روپے چھ آنے لکھ لوتا کہ معلوم ہو کہ آنے پائی سے حساب لیس ہے۔

لالہ؛ بڑے کائیاں ہو درگا (داروغہ) جی۔ اجی دو سو ستائیس روپے چھ آنے کل آپ کا۔

آواز: بلکہ آپ کے باپ کا۔

جیسے ہی داروغہ اور لالہ میں گفتگو ہو چکی ویسے ہی ایک موکھے سے یہ آواز آئی۔ تب تو دونوں چوکنا ہوئے کہ بھئی یہ کون بولا۔ ادھر ادھر دیکھتے ہیں کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ سخت حیران ہیں کہ یاالٰہی یہ کون بولا تھا۔ داروغہ کے حواس غائب بزاز کے بدن میں خون کا نام نہیں۔ کہ اتنے میں پھر آواز آئی۔

آواز: کہو کچھ یاروں کا بھی حصہ ہے؟

تب تو دونوں کے رہے سہے ہوش اڑ گئے کہ یہ اسرار کیا ہے؟

اب سنیئے کہ جب خوجی نواب صاحب کے پاس جا کر بیٹھے تو داروغہ اور بزاز دونوں کو ڈھارس ہوئی کہ اب بلا ٹلی۔ اور پھر وہ سوچے کہ پٹ پٹا کر اب کس منہ سے میاں خوجی یہاں آئیں گے۔ لیکن خوجی ایک ہی بے حیا۔ انہیں یہی خیال تھا

کہ وہ لوگ مطمئن ہو کر وارے نیارے کر رہے ہوں گے۔ تو چپکے سے کسی بہانے اٹھے اور اٹھ کر پچھواڑے کے ایک موکھے کی راہ سے سب باتیں سنا کیے۔ جب کل کاروائی ختم ہوگئی تو فرمایا کہ: بلکہ آپ کے باپ کا:

خیر داروغہ اور لالہ بلدیو نے آپ کو ڈھونڈ نکالا اور للو پتھو کرنے لگے۔

بزاز: ہمارا کسور ما پھ (قصور معاف) کیجئے۔

داروغہ: اجی یہ ایسے آدمی نہیں ہیں یہ بیچارے کسی سے لڑنے بھڑنے والے نہیں۔ اپنے کام سے کام ہے۔ باقی لڑائی جھگڑا تو ہوا ہی کرتا ہے۔ دل میں کدورت آئی اور صاف ہوگئی۔

خوجی: اجی یہ باتیں تو عمر بھر ہوا کریں گی۔ مطلب کی بات فرمائیے۔

داروغہ: جو ارشاد ہو۔

خوجی: لاؤ پھر کچھ ادھر بھی۔

داروغہ: جو کہو۔

خوجی: سو دلوائیے پورے۔ ایک سو لیے بغیر نہ ٹلوں گا۔ آج تو تم دونوں نے مل کر ہماری خوب مرمت کی ہے۔ اور ہمارے پاس اتفاق سے قرولی نہ تھی۔

داروغہ: یہ تیس روپیہ تو ایک لیجیے اور یہ دس کا نوٹ بس۔ اور جو ادھر ادھر کیجیے تو اس سے بھی ہاتھ دھوئیے۔

خوجی: اجی لائیے۔ چالیس کیا کم ہیں۔

بزاز: کھاسی رکم کی رکم ہے (خاصی رقم کی رقم ہے۔)

خوجی: تمہاری بھی پانچوں گھی میں ہیں اور سر کڑاہی میں۔

داروغہ: اپنے دل میں اچھے ملے ہیں۔ہم سمجھے تھے کہ بس ہم ہی ہم ہیں۔مگر یہ ہمارے بھی گرو پیدا ہوئے۔

خیر میاں خوجی اور داروغہ صاحب ہاتھ میں ہاتھ دیئے جا کر محفل میں بیٹھے۔گویا دونوں لنگوٹیے یار تھے۔مگر داروغہ کا بس چلتا تو خوجی کو کالے پانی ہی بھیج دیتے۔یا زندہ چنوا دیتے۔وہاں جو گئے تو نواب صاحب کے فرشتہ خاں کو بھی خبر نہیں کہ ہوا کیا۔اور کیسے کیسے وارے نیارے یار لوگوں نے کیے۔وہاں لطیفے ہو رہے ہیں۔

ندرت: حضور آج ایک شخص نے ہم سے پوچھا کہ اگر دریا میں نہائیں تو رخ کس طرف رکھیں۔ہم نے کہا بھئی اگر دانش مند ہو تو اپنے کپڑوں کی طرف رخ رکھو۔ورنہ چور اٹھا کر لے جائے گا۔اور آپ غوطہ ہی کھاتے رہ جائیں گے۔

حافظ: پرانا لطیفہ ہے۔

اتنے میں عطر والا آیا اور آداب بجالایا۔

نواب: داروغہ جی۔

داروغہ: خداوند۔

نواب؛ بھئی ان کا بھی فیصلہ کر دو۔

داروغہ: چلیے آپ کو بھی لگے ہاتھوں بھگتا آئیں۔

داروغہ: کتنا عطر آیا؟۔

عطر والا: دیکھیے آپ کے یہاں تو لکھا ہوگا۔

داروغہ: ہاں لکھا تو ہے مگر خدا جانے وہ کاغذ کہاں پڑا ہے۔تم اپنی یاد سے جو جی میں آئے بتا دو۔

عطر والا: ابھی کل ہی تین تولہ حنا۔ دو تولہ موتیا۔ پانچ تولہ عطر عروس اور ڈیڑھ تولہ کیوڑا دے گیا ہوں۔ کوئی پینتیس روپے کا ہوا۔

داروغہ: اچھا پینتیس یہ ہوئے اور پچھلا حساب۔

عطر والا: اسی ادھر کے بھی ہیں۔ اور بیگم صاحبہ نے اب کی عطر کی بھر مار کردی۔ عطر۔ عطر۔ مہری کھڑی ہے کہ عطر لاؤ۔ عطر لاؤ۔ قرابے کے قرابے خالی کرا دیئے۔

داروغہ: اچھا بھئی پھر اس میں کسی کے باپ کا اجارہ ہے۔ شوقین ہیں۔ مخیّر ہیں۔ رئیس زادی ہیں۔ امیر ہیں۔ نفیس مزاج ہیں۔ باسلیقہ ہیں۔ عطر انہیں کے لئے ہے یا ہمارے آپ کے لئے۔ اچھا تو اسی اور پینتیس کتنے ہوئے۔ ایک سو پندرہ ہوئے نا!۔

عطر والا: بس ڈیڑھ سو دلوایئے۔

داروغہ: اچھا تم بھی کیا یاد کرو گے۔ لو سو یہ ہیں اور تیس کے تین نوٹ گن کر (دس۔ دس۔ دس کے)۔

عطر والا: اچھا لیجیے یہ عطر کی شیشی آپ کے لئے لایا ہوں۔

داروغہ: کس چیز کا ہے؟۔

عطر والا: سونگھیے تو معلوم ہو۔ خدا جانتا ہے دس۔ دس روپے تولہ خریدا ہے لوگوں نے۔ اور جھڑا جھڑ رامپور اور حیدر آباد اور ٹونک اور مرشد آباد اور خیرپور سے فرمائشیں آرہی ہیں۔

میاں عطر والا تو ادھر روانہ ہوا۔ ادھر داروغہ خوش خوش نواب صاحب کے پاس جانے لگے تو آواز آئی:

"استاد اس شیشی میں یاروں کا بھی حصہ ہے"

پیچھے پھر کے دیکھتے ہیں کہ میاں خوجی سوا بالشت کا قد شریف جھومتے ہوئے چلے آتے ہیں۔

داروغہ: یار تم نے بے طور پیچھا کیا۔

خوجی:۔ اب کی تم کو بیس ہی روپے ملے اس میں سے کچھ نہ لیں گے۔ وہ رقم ہی کیا۔ مگر اس دس روپے تولہ والے عطر میں سے آدھی شیشی ملے۔

داروغہ: خیر دیں گے اور ضرور دیں گے۔

داروغہ اور خوجی نواب صاحب کی محفل میں پھر شریک ہوئے تو دیکھا وہاں شعر خوانی ہو رہی ہے۔

اتنے میں لالہ جواہر مل آئے۔ آیئے جناب آیئے۔

نواب: آج تو عرصے کے بعد ملاقات ہوئی۔ کہاں رہتے ہو بھئی؟۔ ہوا تو نہیں لگی کہیں۔ نہیں بھئی ہے تو کچھ ایسا ہی۔ یار کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔

مہاجن:۔ جی نہیں ہوا تو رئیسوں کو لگتی ہے۔ یا بعض بگڑے ہوئے امیروں کو۔ ہم پرانی چال کے لوگ ہیں۔ میں ان دنوں پراگ میں تھا۔

حافظ: اے سبحان اللہ پراگ کے لئے گیا۔ خوب موزوں لفظ ہے۔ لالہ جواہر مل صاحب بڑے جگت باز آدمی ہیں۔

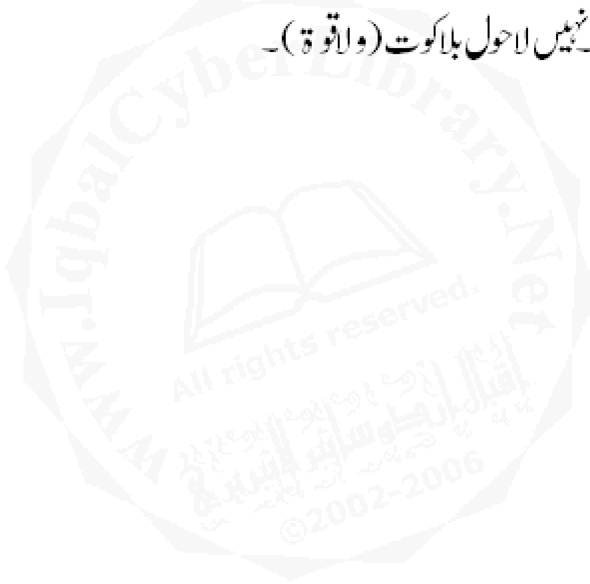
مہاجن: نواب صاحب حساب کرنے آئے تھے۔

نواب تو گھبرائے کیوں جاتے ہو۔ کچھ ہمارا ہی فالتو نکلے گا۔ بھئی تمہارا ہماری طرف ایک کچا نہ نکلے گا۔

مہاجن: ۔نہیں گھبرانے کی بات چیت کیا ہے۔ بھلا جو حکم ہو منجور (منظور) آج نہیں کل۔ کل نہیں پرسوں۔

داروغہ: ارے بھئی کچھ چوروں سے بہوار تھوڑا ہی ہے۔

مہاجن: ۔نہیں لاحول بلاکوت (ولاقوۃ)۔



خوجی کی شامت

ایک دن پچھلے پہر کھٹملوں نے میاں خوجی کا ناک میں دم کر دیا۔بدن بھر کا خون جونک کی طرح پی لیا۔اب وہ ادھر سے کروٹ لیتے ہیں۔تو انہوں نے ادھر کا جسم چھلنی کر دیا۔اور اس طرف پھرے تو اس طرف خون کے فوارے بہنے لگے۔حضرت بہت ہی جھلائے۔افیمی آدمی۔چار پہر آنکھوں میں رات کٹی۔پچھلے پہر ذرا آنکھ لگنے کو ہی تھی کہ کھٹملوں کا خدا بھلا کرے انہوں نے لہو لہان کر دیا۔ایک دفعہ پینک میں آئے تو ان حضرات نے پنڈلیوں کو بھٹر کی طرح بھنبھوڑ کھایا۔اور خوجی نے نشے سے چونکتے ہی غل مچایا کہ:۔

لانا میر اقرا بیچہ۔"

یہ ہانک جو انہوں نے لگائی تو آس پاس والوں کی نیند حرام ہوگئی۔سب سمجھے کہ چور آ گیا۔

لینا۔لینا۔جانے نہ پائے۔چور۔چور۔چور۔

ارے میاں کہاں۔کدھر۔کس رخ۔

"لینا پکڑ لیا ہے"

"دیکھو پکڑے رہنا"

"بھئی مسافرو ہشیار۔اپنے اپنے مال کی حفاظت کرو۔اب سرائے بھر میں بلڑ مچا ہوا ہے۔ہڑ بونگ کا عالم ہے۔کوئی آنکھیں ملتا ہوا اندھیرے میں ٹٹولتا ہے۔کوئی دیدے پھاڑ پھاڑ کے اپنی گٹھڑی کو دیکھتا ہے۔کوئی مارے ڈر کے آنکھیں بند کیے

ہوئے دبکا پڑا ہے۔

میاں خوجی نے جو لینا۔لینا۔جانے نہ پائے۔چور چور کی آواز سنی تو خود بھی غل مچانا شروع کیا کہ:

''ہائیں ہائیں خبردار۔جانے نہ پائے۔لانا میری قرولی۔اوچور! او گیدی! ٹھہرا رہنا کہ میں ابھی قرولی لے کر آن پہنچا۔یہ خبر ہی نہیں میاں کو کہ یہ شگوفہ حضرت ہی نے چھوڑا ہے۔فرماتے ہیں کہ ٹھہرا رہنا میں بھی قرولی لے کر آن پہنچا۔دیکھیے دیکھیے آپ اپنی داڑھی کی طرف دیکھیے۔غصے کو تھوک دیجیے۔قد تو حضور کا ماشا اللہ پون انچ کا ہے۔اورخم دم یہ کہ قرولی لیے آن پہنچے۔خدا جھوٹ نہ بلوائے تو قرولی کی حضرت نے عمر بھر صورت نہ دیکھی ہوگی۔مگر بات بات پر قرولی اور قرابینچے کی فکر رہتی ہے۔کوئی اس مسخرے سے اتنا پوچھے کہ اب قرابینچے کا فیشن کہاں؟۔ قرولی کس کی کمر میں آپ کو نظر آئی؟۔مگر ان کو تو بک دینے سے مطلب ہے۔

خیر میاں خوجی جو گرمائے تو چھپر کھٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور لپک پڑے۔اب آؤ دیکھتے ہیں نہ تاؤ۔گلا پھاڑ پھاڑ کے چلا رہے ہیں۔کہ''لینا''لینا'' اب جو لپکے تو بھٹیاری کو ڈپٹ لیا اور فرمایا کہ تو ہی چور ہے۔

بھٹیاری نے کہا:۔

میاں کچھ خیر ہے۔ہوش کی بات کرو۔

اتنے میں آپ نے دوڑنا شروع کیا۔نشے میں آپ کو سوجھ گئی کہ چور آگے آگے بھاگا جاتا ہے۔بھاگتے بھاگتے ٹھوکر جو کھاتے ہیں تو اڑا۔اڑادھوں۔میاں خوجی اپنی شامت اعمال سے گرے بھی تو کہاں جہاں کمہار کے برتن رکھے تھے۔گرنا تھا

کہ کئی برتن چکنا چور ہو گئے۔ کمہار نے للکارا کہ چور چور"

یہ اٹھنے کو تھے کہ اس نے آن کر دبوچ لیا اور پکارنا شروع کیا:۔ ارے دوڑیو۔ چور پکڑ لو۔

مسافر اور بھٹیارے اور بھٹیاریاں اور سب کے سب دوڑ پڑے۔ کوئی ڈنڈا لیے ہے۔ کوئی لٹھ باندھے ہے۔ کوئی بید گھماتا ہے۔ کوئی لکڑی ہلاتا ہے۔ مگر افسوس کہ میاں خوجی کے پاس نہ قرولی نہ قرابینچہ۔ اندھیری رات۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چوطرفہ چھایا ہوا۔ کسی کو کیا معلوم کہ یہ چور ہے یا میاں خوجی۔ بگڑے دل آدمیوں کو شکار ہاتھ آیا۔ خوب بے بھاؤ کی حضرت پر پڑنے لگیں۔ یار لوگوں نے تاک تاک کر زناٹے کے ہاتھ لگائے۔ جب خوجی پٹ پٹا چکے تو ایک مسافر نے کہا کہ بھئی ذرا ٹھہرو تو یہ تو خوجی ہیں۔ جو اس کوٹھری میں پانچ سات روز سے ٹکے ہوئے ہیں۔ چراغ جلایا گیا تو معلوم ہوا کہ تیرھویں صدی کے بالشتیے میاں خوجی ہی ہیں۔ کمہار کو لوگوں نے للکارا کہ ابے چھوڑ دے یہ چور نہیں ہیں چھوڑ دے۔ برتنوں کے دام ہم دیں گے۔

الغرض میاں خوجی کی جان تو بچی مگر کب جب انجر پنجر الگ ہو گئے۔ اب میاں خوجی پٹ پٹا کے چلے۔ میاں آزاد سے بھی کسی نے کہہ دیا کہ تمہارے ساتھی خوجی چوری میں پھنسے ہیں۔

کسی مسافر کی ٹوپی چرائی تھی۔ سو اس نے پکڑ لیا۔ دوسرے نے آن کر کہا یہ نہیں ہوا۔ کسی کمہار کی ہنڈیا چرانے لگے تھے کہ وہ جاگ اٹھا۔

بھئی واہ جتنے منہ اتنی ہی زبانیں اور اتنی ہی باتیں اسی دم کی بات اور مختلف روایتیں

مشہور ہو گئیں۔

میاں آزاد کو برا ہی برا معلوم ہوا کہ ہمارا ساتھی اور چوری کرتا ہوا پکڑا جائے۔ مگر یہ بات ان کو جچی نہیں کہ خوجی ایسے آدمی ہیں نہیں۔ وہ چوری چکاری کیا جانیں۔ وہ تو بس فقرہ بازی ہی جانتے ہیں۔ اور بھلا چوری چکاری بھی کرتے تو ہنڈیوں کی۔ خیر انہوں نے دل میں ٹھانی کہ چلیں اور خوجی کو بچا لائیں ورنہ آزاد نہیں۔ چارپائی سے اترے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ خوجی صاحب جھومتے چلے آرہے ہیں اور بڑبڑاتے جاتے ہیں

''ہات تیرے کی بڑا آزاد بنا پھرتا ہے۔ ایسے آزاد بہت دیکھے۔ مردود چارپائی پر پڑا خرخر کیا کیا اور ہماری خبر ہی نہیں۔

اب بڑبڑاتے ہوئے میاں آزاد کی گلی تک چلے آئے۔ مگر آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ۔ اتنا بھی نہ سوجھا کہ آزاد کھڑے ہیں۔ جب قریب پہنچے تو آزاد نے یوں کہا:

آزاد: خیر ہم کو تو بعد میں گالیاں دینا پہلے اب یہ بتاؤ کہ ہاتھ پاؤں تو نہیں ٹوٹے۔

خوجی: ہاتھ پاؤں ہونہہ۔ یہ لوہے کی سلاخیں ہیں۔ آپ اس وقت ہوتے تو دیکھتے کہ بندے نے کیا کیا جوہر دکھائے۔ پچاس آدمی گھیرے ہوئے تھے۔ پورے پچاس۔ ایک کم نہ ایک زیادہ۔

راوی: ۔ درست۔ اس وقت آپ کو اتنا ہی تو ہوش تھا کہ آدمی گننے بیٹھتے۔ پہلے یہ تو فرمایئے کہ پڑیں کتنی۔ مارے چپتوں کے ہوش نہ رہا۔ مگر بے حیا کی بلا دور۔ جھاڑ پونچھ کر پھر موجود۔

خوجی:۔واللہ میں اس وقت پھل جڑی بنا ہوا تھا۔

راوی:۔اے بیوقوف۔واللہ آدمی کیا دمڑی کے پٹے باز ہیں۔زبان البتہ پھل جڑی کو بھی مات کرتی ہے۔

خوجی:۔بس یہی کیفیت تھی۔دس آدمی اس شانے کو اور دس ہی اس شانے کو پکڑے ہوئے تھے۔اور میں جو پھرا تو کسی کو اَنٹی دی۔دھم سے زمین پر گرا۔کسی کو کولھے پر لاد کر مارا۔کھٹ سے چھپر کٹ کی پٹی پر۔دو چار میرے رعب میں آ کر تھرتھرا کر گر ہی تو پڑے۔دس پانچ کی ہڈی پسلی چکنا چور کر دی۔ہم نے یہ ڈھکیلی کھائی ادھر ہو رہا ہے ادھر نکلا۔ ادھر ابھرا۔ دس پانچ کی ہڈی پسلی چکنا چور کر دی۔جو سامنے آیا نیچا دکھایا۔جو منہ چڑھا منہ کی کھائی۔

راوی:۔اور ایک صاحب آپ کے رعب میں آ کر کمہار کے برتنوں پر بھی تو گر پڑے تھے۔واہ رے بنوٹیے تیری بھی آج دھوم ہے۔

خوجی:۔خدائی بھر میں کوئی ایسا دلیر آدمی تو دکھایئے۔

راوی:۔حضرت خدائی بھر کا حال تو خدا ہی کو معلوم ہے۔مگر اتنی گواہی ہم بھی دیں گے کہ آپ جیسا بے حیا۔جوتیاں کھانے والا سرائے بھر میں اس سرے سے اس سرے تک کوئی ہمیں نظر نہیں آتا۔اس ڈینگ پر پھٹکار ارے خدا کی لعنت۔

خیر میاں آزاد اور خوجی دونوں اس وقت سو رہے اور دوسرے روز شام کو نواب صاحب کے ہاں پہنچے۔

آزاد: پیر و مرشد رخصت ہونے کو آیا ہوں۔زندگی ہے تو پھر ملیں گے۔ورنہ یہ آخری الوداع ہے۔

نواب :۔ کیا کوچ کی تیاریاں کر ہی دیں ۔ بھئی جب واپس آؤ گے تو ملاقات ضرور کرنا ۔ بھول نہ جانا ۔

آزاد : بھلا یہ آپ کے فرمانے کی بات ہے ۔

خوجی :۔ غلام بھی رخصت ہوتا ہے ۔

نواب :۔ آپ تو واللہ بڑے ہنسوڑ آدمی ہیں کہیے اب بشرط خیریت کبھی ملیے گا بھی ۔

خوجی :۔ خدا لائے گا تو آؤں گا حضور ۔

داروغہ :۔ میاں خدا کرے سب سے پہلے انہیں پر گولی پڑے ۔ بلکہ گولہ اور وہ بھی بم کا گولہ ۔ اب خدا اس منحوس کی صورت نہ دکھائے اور نہ اس کو یہاں لائے ۔

غرض آزاد اور خوجی نواب صاحب سے رخصت ہوئے ۔

نواب :۔ فی امان اللہ ۔ خدا خیریت سے پہنچائے اور واپس لائے ۔

خوجی :۔ داروغہ جی خدا حافظ ۔

داروغہ نے کہا ۔ آزاد کو امام ضامن اور خوجی کو شیطان کو سونپا ۔ آزاد اور خوجی رخصت ہوئے تو پھاٹک سے نکل کر میاں خوجی نے کہا :۔

بھئی ذرا ٹھہرے رہنا ۔ میں ابھی آیا ۔

خوجی کو جو وحشت نے گھیرا تو پہنچے زنانی ڈیوڑھی پر

خوجی :۔ دربان سے یار ذرا بوا زعفران کو نہیں بلا دیتے ۔

دربان تھا گنوار کا لٹھ ۔ اس نے ان کو تپائی دی کہ آپ بیٹھیے اب نشے میں ان سر یہ چلا ۔ وہ چلا ۔ اب کوئی دم کے دم میں زمین دوز ہوا ہی چاہتا ہے ۔ اتنے میں دربان

نے آواز دی کہ بوا زعفران۔ اجی بوا زعفران۔ اے بوا زعفران۔ بوا زعفران۔

بوا زعفران بولیں۔

اے ہے کچھ کہو گے یا بوا زعفران ہی پکارتے چلے جاؤ گے۔ دماغ کے کیڑے تک چاٹ گئے۔

دربان:۔ اجی آپ کے لڑکے۔ اوہ توبہ۔ تمہارے میاں آئے ہیں۔

دربان بے وقوف نے پہلے لڑکے کہہ کر میاں کا لفظ جو کہا تو گھر بھر کی عورتیں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ اور بیگم صاحب ہنستے ہنستے بولیں کہ:

اچھے گنوار کو ڈیوڑھی پر بٹھایا ہے۔"

اتنے میں اس نے پھر غل مچایا کہ:

"اجی بوا جی۔ آیئے دیکھیے تو ان کا حال کیا ہے؟۔

ابھی تو خاصے بھلے چنگے تھے۔ ابھی کچھ سے کچھ ہو گیا۔

بوا زعفران اور ان کے میاں میں کچھ جھگڑا تھا۔ وہ گھبرائی ہوئی اندر سے آئیں۔ تو ان کو دیکھا کہ تپائی پر بیٹھے نشے میں جھوم رہے ہیں۔

اب یہ لطیفہ بھی سننے کے قابل ہے کہ بوا زعفران کے میاں کی بھی کچھ ایسی ہی شکل وصورت تھی۔ خوجی سے بالکل ملتے جلتے۔ وہی سوا بالشت کا قد۔ وہی دبلے پتلے ہاتھ پاؤں۔ اور طرہ یہ کہ افیون بھی پیتے تھے۔ زعفران ان سے روز کہتی تھی کہ تم افیون کھانا چھوڑ دو۔ وہ کب چھوڑنے والے تھے بھلا۔ اسی سبب سے دونوں میں نہیں بنتی تھی۔ آخر ایک روز اس کے میاں نے کہا اچھا آج سے اگر ہم کو نشہ میں دیکھو تو گن کر پانچ سو جوتے لگاؤ اور جو بھول جاؤ تو پھر نئے سرے سے گنو۔

زعفران نے جو باہر آ کر دیکھا تو حضرت موجیں لے رہے ہیں۔ جل بھن کر خاک ہی تو ہو گئیں۔ جاتے ہی میاں خوجی کے پٹے پکڑ کر ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ چپتیں تڑتڑ لگا ہی تو دیں۔ خوجی کا نشہ ہرن ہو گیا۔ مار کے آگے بھوت ناچے چونک کر فرماتے کیا ہیں؟۔

خوجی:۔ لانا تو ولایتی قرولی۔ ارے ان سرائے والوں نے تو ہماری کھوپڑی پلپلی کر دی۔

راوی: واہ ابھی اپنے نزدیک آپ سرائے میں ہی ہیں۔ واہ ری۔ افیم۔ یہ جو نہ کرے تھوڑا ہی ہے۔

خوجی نے ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا۔ مگر وہ جشن دیوانی نواب کے یہاں رقمیں کھا کھا کر ہتھنی بنی پھرتی تھی۔ یہ بچارے سوا بالشت کے آدمی۔ اس نے ان کو چرمر کر ڈالا۔ مگر یہ قرولی مانگا ہی کیے۔ اتنے میں غل غپاڑے اور دھڑ پکڑ کر کی جو آوازیں بلند ہوئیں۔ تو سب عورتیں باہر نکل آئیں اور بیگم صاحب عصمت النساء بیگم اور گیتی آرا بیگم سب کے سب پردے کے پاس دوڑیں کہ دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔

بیگم صاحب: بوا زعفران آخر یہ ہے کیا۔ روئی کی طرح اس بے چارے کو تو م کر رکھ دیا۔ واہ۔

عصمت النساء بیگم: اوئی نوج ایسی بیوی کسی کی ہو؟۔ ہاتھ ہی ٹوٹیں مردار کے۔ ادھ مرا ہی کر ڈالا۔ وہ موا تو آپ ہی زندگی سے بیزار ہے۔ اس نے اوپر سے دو چار لاتیں اور لگا دیں۔

مغلانی:۔ حضور زعفران کا قصور نہیں یہ اس کا قصور ہے۔ جو بیوی کے ہاتھ بک گیا

ہے۔(خوجی کا کان پکڑ کر) نٹے منہ۔بیوی کے ہاتھ سے جوتیاں کھاتے ہو اور ذرا چوں نہیں کرتے۔

خوجی:۔بیوی۔ہائے افسوس۔اجی یہ بیوی کس مردود کی ہے؟۔خدا خدا کرو۔بھلا میں اس دیوکی بچی کالی کلوٹی ڈائن سے بیاہ کرتا۔یہ اس کو اس وقت سوجھی کیا کہ مار مار کے بھرکس نکال دیا۔اور دانت کٹکٹا کر بوٹیاں نوچ ڈالیں۔یہ ہے کون بلا۔ میرے تو حواس بجا نہیں۔

بوا زعفران نے جو یہ باتیں سنیں تو وہ آواز ہی نہیں۔وہ لب ولہجہ ہی نہیں۔غور کر کے دیکھتی ہے تو میاں وہاں کوئی نہیں یہ تو کوئی اور ہی ہے۔

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

چہرہ زرد ہو گیا۔اور دانتوں تلے انگلی دبا کر خاموش ہو رہیں۔

مغلانی: ارے ہاں یہ ہے کون۔چمپا کے ابا تو نہیں ہیں۔

عباسی (ہنس کر) اے واہ بوا زعفران اب تو راہ چلتوں کو بھی میاں بنانے لگیں۔ذرا پہچانو تو یہ ہے کون بے چارے۔

فرخندہ: اوئی یہ تو بے چارے نواب کے یہاں دن رات بنے رہتے تھے۔یہ یہاں کیسے۔اے زعفران تم کو سوجھی کیا۔ذری مشعال (مشعل) جلا کر دیکھو تو چمپا کے ابا یہی ہیں؟۔

بیگم صاحبہ نے بھی خوب لے دے کی۔دوسروں نے زعفران کو رلا کر ہی چھوڑا۔وہ اور بھی چور بن گئی کہ ناحق ایک بے چارے کی آبرو لی۔اور کھوپڑی کی کھوپڑی گنجی کر ڈالی۔اتنے میں نواب صاحب سے جا کر کسی نے ساری داستان کہہ ڈالی۔

محفل بھر میں حاضرین پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے کہ بھئی واللہ یہ نئی روایت ہے اس پر میاں ندرت بولے کہ بھئی ان کو یہاں لاؤ تو دیکھیں کون بزرگ ہیں۔خدمتگار پہنچے اور میاں خوجی کو لے آئے۔

حاضرین:۔ارے میاں یہ تو خوجی ہیں۔لاحول ولاقوۃ۔اس پر ہنسی کا ایک بار اور فوارہ ابلا۔اور کل حاضرین ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئے۔اب ادھر نواب صاحب اور ان کے مصاحب قہقہ لگاتے ہیں ادھر گھر سے قرقر کی صدائیں بلند ہیں اور خوجی اپنے دل میں شرمندہ ہیں کہ ایک تو پٹے۔دوسرے لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا۔نواب صاحب نے زعفران کو اندر سے بلوایا۔مگر خدمت گار نے کہا کہ حضور وہ تو نہیں آتیں۔پردہ کے پاس کھڑی رو رہی ہیں۔

خوجی:۔اس مکر کو دیکھے گا حضور۔رونا ہم کو چاہیئے۔الٹا وہ رو رہی ہیں۔

ندرت:۔بھئی تم کو میاں بنایا۔رونے سے بھی گئی گزری۔

نواب:۔زعفران کی سزا ہم نے یہ تجویز کی ہے کہ خوجی کو دے دی جائیں۔

خوجی:۔بس غلام کے حال پر رحم کیجیے۔معاف فرمایئے مجھے۔ بندہ باز آیا ایسی شادی سے۔غضب خدا کا۔اس دیو کی بچی سے اور میں شادی کروں۔خدا بچائے۔خدا ہر آفت سے محفوظ رکھے۔میاں کے دھوکے میں تو اس نے ہمارے ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دیے۔اور جو کچھ سچ مچ یہاں میاں ہی ہوتے تو چٹنی ہی کر ڈالتیں۔کیا کہیئے کچھ بس نہیں چلتا۔ورنہ نوابی ہوتی تو اتنی قرولیاں بھونکی ہوتیں کہ عمر بھر یاد ہی تو کرتیں۔یہاں کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں۔گھانس نہیں کھودا کیے۔کمیدانیاں۔رسالداریاں کیا کیے ہیں۔۔

راوی:۔اے صل علی ۔ بے شک حضور نے کمیدانیاں بھی کی ۔دگلے والی پلٹن کے رسال دار آپ ہی تھے۔مگر بوا زعفران نے رسال داری سب خاک میں ملا دی۔ایک نہ چلی ۔

نواب:۔اور وہ آپ کے ساتھی آزاد کہاں ہیں؟۔

خوجی:۔پھاٹک کے اس طرف پل پر بیٹھے تھے۔

ندرت:۔میاں دیکھو۔پھاٹک سے نکل کر۔پل پر میاں آزاد بیٹھے ہیں۔ان کو ذرا لپک کر بلالانا۔

میاں آزاد آئے تو روشن علی نے ان کو ساری داستان سنائی اور آزاد کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

آزاد:۔کیسے قرولی اس وقت یاد نہ آئی۔

دربان جی ہاں۔قرولی تو یاد آئی اور بڑا غل غپاڑا مچایا تھا۔اور سرائے والوں کا نام لیتے تھے۔کہ سرائے والوں نے کھوپڑی پلپلی کر ڈالی۔جب آنکھ کھلی اور بوا زعفران کو دیکھا تو نشہ ہرن ہوگیا۔اور اس نے اس دھوکے میں کہ اس کے میاں ہیں بڑی بری گت بنائی۔پھر محفل میں قہقہہ پڑا اور سب مارے ہنسی کے لوٹنے لگے۔

آزاد:آخر یہ وہاں کرنے کیا گئے تھے؟۔

داروغہ:دوڑتے ہوئے آئے کیا ہوا بھئی کیا ہوا! خیر تو ہوئی۔کس پر پڑیں تڑاتڑ۔

نواب:آپ کے دوست میاں خوجی پر۔

داروغہ اور میاں خوجی میں تو پہلے ہی لگتی تھی۔انہوں نے جو یہ خبر سنی بہت خوش

ہوئے اور بلند آواز سے کہہ اٹھے کہ یہ خوجا اسی لائق ہے۔ میں بھی بہت خوش ہوا۔

روشن علی:۔ اجی سنیئے تو لوٹنے لگے۔ حضرت ڈیوڑھی پر پہنچے تو اونگنے لگے۔ دربان سمجھے کہ بوا زعفران کے میاں ہیں۔ اس نے آواز دی کہ بوا زعفران تمہارے میاں آئے ہیں۔ اس نے باہر آکر دیکھا تو نشے میں۔ اور اس کو وتھی افیم سے نفرت۔ بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ چپے پکڑ کر خوب تڑاتڑ لگائیں آپ اس سے اتنا بھی نہیں کہتے کہ میں تمہارا میاں نہیں ہوں۔

داروغہ: بہت خوش ہو کر یہی سزا تھی اس گیدی کی (خوجی کے کان میں جھک کر) کیوں بچہ چپتیائے گئے نا! اور عطر مانگو۔

غرض بڑی دیر تک اندر اور باہر قہقہے پڑے اور آخر کار میاں آزاد اور خوجی پھر سے رخصت ہو کر چلے۔ راستے میں میاں آزاد مارے ہنسی کے بے تاب ہو ہو گئے۔

اور ایک بار خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ: میں نے بھی وہ چٹکیاں لی ہیں کہ زعفران بھی یاد ہی کرتی ہوں گی۔

راوی: ذرا ادھر تو چار آنکھیں کیجیے۔ اے پھٹکار سٹی تو بھولی ہوئی تھی مگر اکڑ نا نہ چھوڑا۔ واہ رے حیادار۔

آزاد:۔ میاں ڈوب مرو جا کر۔ ایک چلو پانی کافی ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ ایک عورت سے ہاتھاپائی میں جیت نہ پائے۔

خوجی:۔ اجی وہ عورت سو مرد کے برابر ہے۔ چمٹ پڑے تو آپ کے حواس بھی غائب ہو جائیں۔

جہاز پر سوار ہونے کی شرطیں

میاں آزاد اور خوجی سرائے میں پہنچ کر چلنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ گوشت اور روٹی۔ کباب اور باقر خوانی کی فکریں ہونے لگیں۔ غرض کہ لد پھند کر سٹیشن پہنچے۔

خوجی:۔ یا خدا بچائیو۔

آزاد: ایں خیر باشد۔ کیا شیطان نے انگلی دکھائی یا بوا زعفران یاد آئی؟۔

خوجی:۔ اجی حضرت یہ تو فرمایئے کہ آپ چلتے کہاں ہیں؟۔

اف میدان جنگ میں گولیوں اور چھروں کے منہ میں۔ خدا ہی خیر کرے۔ یار ایک چنے کے برابر گولی میں تو کام تمام ہو جائے گا۔ بھائی کہا مانو۔ حسن آرا کو چھوڑو۔

آزاد:۔ لے بس اب زیادہ بک بک نہ کیجیے۔

خوجی:۔ حضرت سنیئے۔ چلنے کو تو ہم چلتے ہیں۔ مگر ہماری شرطیں قبول کیجیے۔ تو بسم اللہ۔ ایک ایک شرط ماننی ہوگی۔ ورنہ آپ اپنی راہ لیں۔ میں اپنا راستہ لیتا ہوں۔

پہلی شرط:۔ قرولی ہم کو ضرور لے دیجیے اور ایک قرابینچہ بھی ہمارے پاس رہے۔ چلے تو ہیں آپ مورچے پر اور ایک چھڑی تک پاس نہیں۔

دوسری:۔ ایک سال کے لئے ہمیں افیم لے دیجیے۔ میں لادے لادے پھروں گا۔ ورنہ پھر جمائیوں پر جمائیاں آئیں گی۔ اور بے موت انٹا غفیل ہو جاؤں گا ۔ آپ تو عورتوں کی طرح نشے کے عادی نہیں مگر ہم تو بے افیم پیے ایک قدم نہ چلیں گے۔

تیسری:۔ اتنا بتا دیجیے کہ وہاں بوا زعفران جیسی ڈنڈ پیل پنجہ کش دیونیاں تو نظر نہیں

آئیں گی ہوں تو بندہ ابھی سے رخصت ہوتا ہے۔خدا حافظ۔اف فوہ۔واللہ کیا کس کس کے لاتیں لگائی ہیں۔کیا تان تان کے ملہ بازی کی ہے کہ پلیتھن ہی نکال ڈالا۔روح پر صدمہ ہے۔واللہ روح پر۔

چوتھی:۔سرا میں ہم اب عمر بھر نہ اتریں گے اور جو جہاز پر کمہار ہوئے تو بس ہم ڈوب ہی مریں گے۔اجی اتفاق ہے ہم ٹھہرے آدمی بھاری بھر کم۔کہیں پاؤں پھسل گیا اور ایک آدھ برتن ٹوٹ گیا تو کمہار انجر پنجر ہی الگ کردے گا۔

پانچویں: جس رئیس کی صحبت میں بزاز آتے ہونگے وہاں ہم نہ جائیں گے نہ جائیں گے۔اس میں لالہ نین سکھ ہو یا بلدیو۔اجی بزاز تو ٹھہرے زمین کے گز۔سب کہیں گھوما چلیں۔مگر ہم بہت دیکھ بھال کر جائیں گے۔

چھٹی:۔جہاں آپ چلتے ہیں وہاں کانجی ہاؤس تو نہیں ہے کہ گدھے کے دھوکے میں کوئی ہم کو کان سے پکڑ کر کانجی ہاؤس پہنچائے۔ذرا یہ دریافت کر لیجیے گا۔

ساتویں:ٹٹو پر ہم سوار نہ ہونگے۔چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔

آٹھویں:۔میٹھے پلاؤ روز پکیں۔

نویں:۔ہم کو میاں خوجی نہ کہنا۔جناب خواجہ صاحب قبلہ کہا کیجیے۔یہ خوجی کیا معنی؟۔

دسویں:مورچے پر ہم نہ جائیں گے۔بس باورچی خانے کا انتظام ہمارے سپرد ہے۔اور لوٹ ماریں جو کچھ ہاتھ آئے وہ ہمارے قبضے میں رکھا جائے۔

گیارویں:۔حسن آرا کے نام ایک خط ہر روز لکھنا اور ہر خط میں ہماری طرف سے بندگی بلکہ دعائے خیر لکھنا۔

بارھویں:۔ گولی کھانے کے تین گھنٹے پہلے اور مرنے کے دوگھڑی پیشتر ہمیں اطلاع کر دینا۔

تیرھویں:۔ جو ہم مر جائیں تو لاش کو ہندوستان پہنچانا اور جہاں والد صاحب کی لاش دفن ہے۔ وہیں دفنانا۔ لیکن ہمیں خود معلوم نہیں کہ والد بزرگوار مرے کب اور کہاں دفنائے گئے۔ اور تھے کون۔ آپ ذرا پتا لگوا لیجیے گا۔ اور قبر پہلو بہ پہلو بنوایئے گا۔ اگر ان کی قبر نہ ملے تو کسی قبرستان میں جا کر جو قبر سب سے بہتر بنی ہو اس کے قریب ہم کو بھی دفنانا اور یہ لکھ دینا کہ یہ ان کے والد صاحب کا مزار شریف ہے۔

چودھویں:۔ نشے کے وقت ہم کو ہرگز نہ چھیڑنا اس وقت یہاں اور ہی کیفیت ہوتی ہے۔ اتنی شرطیں اگر قبول ہوں تو ٹھیک ورنہ خوجی نہ میاں آزاد۔

آزاد۔ گیارھویں شرط بالکل قبول ہے۔

۲۔ بارھویں شرط کڑی ہے۔ مرنے کے دو گھنٹے پیشتر کہہ دیں گے کہ اب چل چلاؤ ہے مگر گولی کھانے کے دو گھنٹہ قبل بتا دینا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔

۳۔ اور بھائی سنو خواجہ صاحب تو ہم سے نہ کہا جائے گا۔ ہم تو خوجی ہی کہیں گے۔

۴۔ ہاں یہ شرطیں کیسے لیتے ہو کہ وہاں بوا زعفران ہوں گی۔ نہ بزاز۔ نہ کانجی ہاؤس۔ آپ مزے سے جہاں چاہے گھاس چریے۔ کوئی چوں تک تو کرے گا نہیں اور کمہار کا تو جہاز پر عکس نہ پڑنے پائے گا۔

۵۔ ایک قرولی ایک قرابنچہ۔ ایک پتھر کلا۔ ایک دھرتی دھمک توپ آپ کو خرید دیں گے۔ آپ مزے سے توپ کو کاندھے پر لادے یا ہاتھ میں لیے۔ جہاں چاہے

جایئے۔

۶۔افیم بمبئی میں آپ کی پیٹھ پر لاد دیں گے۔گھبرایئے نہیں۔کہیئے اب بھی چلیے گا یا اب بھی مچلیے گا۔

خوجی: بسم اللہ کمر کیسے۔

میاں آزاد: ع لاے اس بت کو التجا کر کے

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

خوجی: ایک بات اور باقی رہ گئی۔

آزاد: لگے ہاتھوں وہ بھی کہہ ہی ڈالیے گا۔

خوجی: میں اپنی دادی جان سے تو پوچھ لوں۔

آزاد: معاذ اللہ کیا ابھی وہ زندہ ہیں؟۔جیتی جاگتی قیامت کے بوریے سمیٹنے آئی ہیں۔خدا جھوٹ نہ بلوائے تو آپ کوئی پچاس کے پیٹے میں ہوں گے اور وہ نیک بخت اس حساب سے کم سے کم کیا ڈیڑھ سو برس کی بھی نہ ہوں گی؟۔

خوجی: میاں آپ کام کرو۔میں تو دل لگی کرتا تھا۔ان کی تو ہڈیوں تک کا پتا نہ ہو گا۔

غرض میاں آزاد اور خوجی صاحب نے سامان کسا اور اسٹیشن پر داخل ہوئے۔میاں خوجی کو روپے دیے کہ ٹکٹ لاؤ۔حضرت جا ڈٹے اور جس وقت گھنٹی ہوئی ٹھن ٹھن۔اور کانسٹیبل نے کہا کہ۔۔کان پور کے مسافرو چلو ٹکٹ بٹ رہا ہے۔خوجی بھی لپکے اور وہ ریلا آیا کہ خدا کی پناہ۔ایک ایک پر دس دس گرے پڑتے ہیں۔بیسواڑے کے دس بارہ جوانوں میں حضرت خوجی جو پھنسے تو کچلنے لگے۔وہ ڈنڈ پیل۔لحیم وشحیم۔کرارے جوان اور یہ بے چارے نیم جان۔قد ماشا

اللہ پون انچ کا۔ بہت ہی گھبرائے اور یار لوگ جو بھڑ بھڑا کر دھنس پڑے۔ تو ان کے ہاتھ گویا شکنجے میں کس گئے۔ جب کچلنے لگے تو غل مچایا کہ:

''لانا قرولی دو ایک تو یہاں ہی شہید کردوں''

اتنا سننا تھا کہ بھیڑ کائی کی طرح چھٹ گئی اور میاں خوجی دراتے ہوئے ٹکٹ کی کھڑکی کے پاس جا پہنچے۔

خوجی: بابو صاحب ٹکٹ دیجیے۔

بابو: گول (غل) مت کرو۔

خوجی: اجی غل تو سنتے ہو مگر اس غول بیابانی پر بھی نظر ہے؟۔

بابو: چپ۔

خوجی: چپ۔ یہ چپ کیسی: ٹکٹ دیتے ہو یا میں اسٹیشن ماسٹر سے رپٹ بولوں پھر۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ پھر ریلا آیا وہ ریل پیل کہ میاں خوجی کے ہوش ہی مارے گئے۔ رپٹ وپٹ سب بھولے اور کوئی بیس قدم پیچھے ہو گئے۔ خیر خدا خدا کر کے ٹکٹ ملے اور جا کر ریل پر بیٹھے۔

ریل چلی تو آزاد نے میاں خوجی کو جگایا کہ

اٹھیے جناب خواجہ صاحب کان پور آ گیا۔

خوجی: واللہ بھئی واہ ری ریل ایک مرتبہ کے نشے میں کان پور پہنچ گئے۔

اتنے میں ایک شخص نے میاں آزاد کے قریب آ کر کہا:

''حضور سید ہوں۔ غریب ہوں۔ تین دن سے اگر ایک دانہ بھی کھایا ہو تو سور کا

گوشت۔ بال بچے سب بھوکوں مر رہے ہیں۔ اگر ہو سکے تو ایک آدھ سیر آٹے کی فکر کر دیجیئے۔ ثواب ہوگا۔

آزاد: ماشااللہ۔ یہ ہاتھ پاؤں۔ یہ ڈنڈ بل اور بھیک مانگتے ہو شرم نہیں آتی۔ محنت مزدوری کیوں نہیں کرتے۔ لولے۔ اپاہج۔ لنگڑے۔ اندھے ہوتے تو خیر تمہاری مدد ہم پر فرض تھی مگر تم تو کاہل اور بدوضع معلوم ہوتے ہو۔ ورنہ بھیک نہ مانگتے۔

خوجی: حضرت ایک پیسے میں اس بے چارے کا کام نکل سکتا ہے۔ آپ نے اتنی باتیں کیں مگر چار دمڑی کا ایک پیسہ نہ دیا۔ نہ دیا۔

آزاد:۔ آپ تو ہیں پاگل۔ مجھے کتے نے نہیں کاٹا ہے۔

خوجی: آخر ان کا قصور؟۔

آزاد:۔ بدوضعی۔ کاہلی۔ چانڈو۔ بازی۔ چوری۔ ڈکیتی۔ یہ کسی میں بند تھوڑا ہی ہیں۔

فقیر:۔ نہیں حضور۔ اللہ ہی جانتا ہے جو کبھی چوری کی ہو۔ ہاتھ ہی ٹوٹیں۔ غریب اور مسافر ہوں۔ اتنے میں ایک لالہ نے کہا:

" تم غریب اور مسافر کہاں سے ہو گئے۔ تین پشتوں سے یہاں پر ہی رہتے ہو۔ مگر جہاں کسی پردیسی کو دیکھا اور مسافر بن گئے۔ (آزاد سے) اجی یہ ایک شخص کا لڑکا ہے۔ تین دفعہ قید ہو چکا ہے۔ ایک مرتبہ تو حضرت ایک مہاجن کے گھر جا گھسے۔ اس کے لڑکے کے ہاتھ سے سونے کا کڑا نکالا ہی تھا کہ آنکھ کھل گئی اور پکڑے گئے۔ ڈیڑھ برس کی سزا پائی۔

پھر ایک جولاہے کے چھپر میں آگ لگا دی۔ پکڑے گئے اور دو برس کو مجسٹریٹ

نے جیل بھیج دیا۔ پھر چھوٹے تو ایک مولوی صاحب کے ہاتھ دو چار کتابیں بیچیں۔ وہ چوری کی تھیں۔ غرض کہ ان کی ساری عمر چوری چکاری کرتے ہی گزری ہے۔

آزاد: خوجی: سے آداب عرض ہے۔ کیوں ہم کیا کہتے تھے۔ اجی ان لوگوں کی تو قبر سے ہم واقف ہیں۔

خوجی: فقیر سے اور تم تو سیدھے بنے تھے لاحول ولاقوۃ۔ بس سامنے سے دور رہو۔

تھوڑی دیر بعد غل غپاڑے کی آواز کان میں آئی ایک عورت چلائی:۔

دوڑو۔ دوڑو چور۔ چور۔

خوجی اور آزاد جو لپکے کہ دیکھیں کیا معاملہ ہے تو دیکھتے کیا ہیں کہ وہی حضرت پکڑے گئے ہیں۔ ایں خیر تو ہے۔ دو چار آدمیوں نے کہا کہ یہ شکل وصورت دیکھیے اور یہ افعال دیکھیے۔ اس عورت بے چاری کی گٹھڑی لے کر بھاگنے ہی کو تھے کہ لوگوں نے دیکھ لیا اور اس نے غل مچایا۔ وہ تو یہ کہیے کہ دیکھ لیا۔ ورنہ آنکھ چوکتی تو لے ہی اڑا تھا۔

آزاد:۔ کیوں جناب خواجہ صاحب ذرا ادھر تو آنکھیں چار کیجیے۔ کیوں ہم کیا کہتے تھے۔ آخر وہی بات نکلی نا" بھئی حق یوں ہے کہ ہندوستان میں خیرات کا طریقہ بے حد برا ہے۔ آنکھ بند کی اور روپیہ لٹانا شروع کیا۔ مستحق اور غیر مستحق میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ جس نے سوال کیا اسی کو دے دیا۔ اور سمجھا کہ ہم بڑے سخی ہیں۔ دے ایسے کو جو ہماری مدد کا محتاج ہو۔ نہ کہ ایسے بدمعاش۔ اوباش۔ عیاش کو جو پیسا یا ٹکہ پاتے ہی چانڈو خانے پہنچے یا جوئے

خانے میں داؤں پر رکھ دے۔ایسے حضرات ذات شریف کو دینا گویا بدمعاشی کو بڑھانا اور اس کی مدد کرنا ہے۔یہ جتنے فقیر نظر آتے ہیں۔ان میں نوے فیصدی ایسے ہی پائیے گا۔بھیک کو بھی ان حضرات نے ایک پیشہ مقرر کیا ہے۔اندھا مانگے دیکھو ہم کھٹ سے دے دیتے ہیں یا نہیں۔مگر ایسوں کو چاہیئے کہ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے ایک پائی نہ دوں گا۔

اس کے بعد پھر ریل پر سوار ہوئے اور چلے تو میاں آزاد اور خوجی کے کمرے میں ایک گنوار اور ایک وضع دار بھی بیٹھے تھے۔

اتنے میں ایک گنوار نے پاؤں بڑھایا اور بنچ پر دراز ہو کر پھر دوسرا پاؤں بڑھایا اور کھٹ سے میاں خوجی کے سر پر پڑا۔

خوجی: نشے سے چونک کر۔او گیدی۔بدتمیز۔نکالوں قرولی پھر آزاد سے) ارے قرولی لے دینا تو آپ بھول ہی گئے۔

گنوار: ۔ہم چمار نائیں ہیں ہجور (حضور) ہم سے گالی گپتا نہ بکو۔جیسے تم ہو کرایہ دیو۔ہم ہو دیا۔پھر تم ہم کا ڈپٹ کاہے کا ہو۔

خوجی: بہت کون دون کے بھروسے نہ رہنا۔میں کانوں میں سر کر دوں گا۔اب کے ریل سے اترتے ہی قرولی لے لیتا ہوں۔

وضع دار (گنوار سے) اب چپ نہیں رہتا۔بے کار ٹیں ٹیں لگائی ہے۔

آزاد: حضرت ان گنواروں کے ہاتھ سے خدا بچائے۔دیکھیے ایک آپ ہیں کہ کس تہذیب کے ساتھ ملتے ہیں۔اور ایک وہ حضرت ہیں کہ پھاڑے کھاتے ہیں۔اکڑے ہی جاتے ہیں۔خدا کی قسم جو شریف خوش فکر آدمیوں کا ریل پر ساتھ

ہوتو جی خوش ہو جاتا ہے اور جو گنوار لٹھ مارواڑیوں کا ساتھ ہوتو معاذ اللہ ناک میں دم آجا تا ہے ۔جان عذاب میں ہو جاتی ہے۔اول تو شکل ماشا اللہ قابل دید ہے۔اور گفت گوتو سننے ہی کے لائق ہے۔واللہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوہ ہمالیہ کی چوٹی پر چڑھ کر پتھر لڑھکا رہے ہوں۔ہم تو جب ریل پر جاتے ہیں۔بس یہی دعا مانگتے ہیں کہ یا خدا خوش اخلاق آدمیوں کا ساتھ ہو۔

وضعدار:حضرت پان ملاحظہ فرمائیے۔

آزاد۔تسلیم

خوجی: وضع دار ہے مگر یہ کہاں کی انسانیت ہے قبلہ کہ ایک کی تو تواضع کی اور دوسرے کو صفایا بتایا۔ایک گلوری ادھر بھی بڑھائیے۔

وضع دار:۔معاف کیجیے گا۔لیجیے بسم اللہ۔

خوجی: آداب۔حضرت تھوڑی دیر میں ایک گلوری اور دیجیے گا۔

بابا جی

ادھر صبح ہوئی ادھر جناب خواجہ صاحب مسخروں کے استاد ریل گاڑی سے اسٹیشن کے چبوترے پر اتر آئے۔آزاد اسٹیشن کے بیل بوٹوں کی طراوت دیکھ کر عش عش کرنے لگے۔اور میاں خوجی سے یوں مخاطب ہوئے۔

آزاد:۔جس طرح مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔اسی طرح ہمارا حال ہے۔سبزہ نظر آیا اور روح جھومنے لگتی ہے۔

خوجی: آپ کو گھانس پھونس کی پڑی ہے۔یہاں ڈبیا کو جو خالی دیکھا تو جمائیاں آنا شروع ہوئیں۔

آزاد: آپ تو مسخرے ہیں۔اور میری روح واللہ اس وقت جھوم رہی ہے۔پھولوں کو دیکھیے۔خوش رنگ وخوش نما بیلوں کو دیکھیے۔جس طرف نظر پڑتی ہے۔بہار ہی نظر آتی ہے۔اس سے رہنے والے کا سلیقہ ظاہر ہوتا ہے۔اور مکان کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔مگر ہندوستانیوں کو نہ تو مکان کی صفائی کا خیال ہے اور نہ پھول پودوں کے علم کی طرف ان کی طبیعت مائل ہے۔ہندوستانیوں کا اس قدر دماغ کہاں کہ وہ ان دل خوش کرنے والی باتوں کی طرف توجہ کریں اور انگریزوں میں کوئی بنگلہ کوئی کوٹھی ایسی پایئے گا ہی نہیں جہاں باغ۔گل اور سبزہ نہ ہو۔

خوجی: ان کو کھانے کو تو ملتا نہیں آپ کوٹھی۔باغ۔اور گل وبلبل لیے پھرتے ہیں ارے بھائی یہ سب بےفکری کی باتیں ہیں۔جب روپیہ پاس ہوتا ہے تو سب سوجھتی ہیں۔

آزاد: واہ جی شوق ہی نہیں۔ حوصلے پست۔ دل بجھے ہوئے اتنے میں اسٹیشن کے باہر پہنچے تو دیکھا کہ غل مچ رہا ہے۔ الٰہی خیر یہ جھگڑا کیسا ہے؟۔

آزاد:۔ جناب خواجہ صاحب ذرا دیکھیے تو یہ غل کیسا مچ رہا ہے۔

خوجی: اجی حضرت اب کہیں ٹکنے کا سہارا کیجیے۔ غل غپاڑا تو مچا ہی کرتا ہے۔

آزاد: نا بھئی۔ ذرا دریافت تو کرو۔ یا دھر بھر کا ہل ہو آزاد اور خوجی دونوں گئے اور بھیڑ کاٹ کر دونوں اس غول کے اندر داخل ہو گئے تو دیکھا کہ ایک شخص گیروے کپڑے پہنے کھڑا ہے اور ارد گرد میلا جمع ہے۔ حضرت کی قطع فقیروں کی سی ہے۔ داڑھی ایک مٹھی اور دو انگل بھر۔ بال کمر تک۔ مونچھیں منڈی ہوئیں۔ ادھیڑ ہیں۔ کوئی پچاس کے پیٹے میں۔ مگر چہرہ سرخ جیسے لال انگارہ اور آنکھیں آگ بھبھوکا۔ حیرت تھی کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ لوگوں سے پوچھا تو سب کے سب خاموش۔

آزاد:۔ ایک مسلمان سے) کیوں بھائی صاحب یہ بھیڑ کیسی ہے؟۔

مسلمان:۔ اجی حضرت یہ زمانے کی نیرنگی ہے۔

دوسرا: بات تیرے کی۔

ایک ہندو: نارائن۔ نارائن بری بات ہے۔

خوجی: کیا بری ہوئی ہم بھی تو سنیں۔

تماشائی:۔ یہ سننے کی باتیں نہیں ہیں۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ اگر سنے بھی تو کان بند کر لے۔ عبرت۔ عبرت۔ عبرت۔

آزاد:۔ایک کانسٹیبل سے) کیوں بھئی جوان یہ کوئی فقیر ہیں۔

کانسٹیبل:۔اجی حضور یہ فقیر نہیں چنڈال ہے۔اب آج اس کی مرمت ہو جائے گی۔

خوجی:لاحول ولا قوۃ۔ایسے نا معقول آدمیوں سے پالا پڑا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔اصل بات کوئی بتاتا ہی نہیں۔تو بہ تو بہ سب کر رہے ہیں۔جان عذاب میں ہے۔پوچھیں کس سے۔(آگے بڑھ کر) خود فقیر ہی سے پوچھتے ہیں۔کیوں بابا جی یہ کیا ہوا؟۔کچھ ہم بھی تو سنیں۔

ایک آدمی:یہ بابا جی ہیں آپ کے؟۔

دوسرا:۔بھئی خوب پہچانا۔قریب جا کر ذری دیکھیے۔

تیسرا(قہقہہ لگا کر) کیا کھو گئے تھے؟۔بہت دن بعد بچھڑے ہوئے ملے۔گلے تو مل لیجیے۔

خوجی:للکار کر۔چپ گیدی لاؤں قرولی۔

کانسٹیبل:۔کیا قرولی! اچھے آئے یہ قرولی کیوں آتی ہے۔کیوں صاحب؟۔

خوجی:اجی پوچھتے پوچھتے تھک گئے کوئی بتاتا ہی نہیں۔

کانسٹیبل:۔بس اتنے ہی کے لئے۔مجھ سے سنیے یہ فقیر کوئی چار مہینے ہوئے یہاں آیا تھا۔اور ایک شخص کو سبز باغ دکھا کر اپنا چیلا بنایا۔وہ ان کے اس درجہ معتقد ہوئے کہ کچھ نہ پوچھیے۔بس تو حضرت کی پوجا ہونے لگی۔اب کوئی تو کہتا ہے کہ بابا جی نے دس کلو مٹھائی دریا میں ڈال دی۔دوسرے دن جا کر کہا کہ ہماری امانت ہم کو واپس کر دو۔بس ایک دفعہ ہی دریا لہریں مارتا ہوا بابا جی کے قریب آیا اور دس

سیر گرما گرم تازہ بتازہ مٹھائی ان کے دامن میں کسی نے آپ ہی آپ ڈال دی۔کوئی اس درجہ ان کے کمال کا معتقد ہو گیا کہ قسمیں کھا کھا کر کہنے لگا کہ کئی مردے انہوں نے زندہ کر دیے۔ بلکہ دو چار لوگوں نے جو اختلاف رائے کیا تو لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔اس حماقت کو دیکھیے ایک صاحب نے یہاں تک مبالغہ کیا کہ ایک دن موسلا دھار مینہ برس رہا تھا۔اوران پر بوند نے اثر نہ کیا۔اورغیب سے ایک چھتری کوئی فرشتہ ان کو لگائے رہا۔ مینہ نے دم کے دم میں جل تھل کر دیا۔مگر باباجی کے جسم پر ایک بوند تک نہ گری۔اب یار لوگوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ قید خانے سے نکل جائیں گے۔مگر تین دن سے حوالات میں ہیں اوراب سٹی بٹی بھولی ہوئی ہے۔

آزاد:تو یہ کہیئے کہ اچھا رنگ جمالیا تھا۔بڑے رنگ باز آدمی ہیں حضرت۔

کانسٹیبل:اجی پرلے سرے کے۔ان کے تو کاٹے کا منتر ہی نہیں میں جو ادھر سے آؤں جاؤں تو روز دیکھوں کہ ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔مگرعورتیں زیادہ اور مرد کم۔اورحضرت بیٹھے لہرا لہرا کر گارہے ہیں۔مجذوب بنے ہوئے بڑبڑا رہے ہیں۔جو آتا ہے وہ سجدہ کرتا ہے۔ماتھا ٹیکتا ہے۔باباجی کے ہاں روز دربار لگنے لگا۔رفتہ رفتہ پچ کوسی آدمیوں نے آنا شروع کر دیا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ باباجی نے ٹاٹ بچھایا اورٹاٹ کے نیچے ادھرادھر دس پانچ رکھ دیے اور چپکے سے باہر نکل گئے۔جب اسی نوے آدمی جمع ہو گئے۔اور باباجی کا دربار آراستہ ہوا تو ایک شخص نے کہا باباجی ہم کو کچھ دکھایئے۔ہم آپ کے تب ہی معتقد ہونگے۔جب آپ ہم کو کچھ دکھائیں گے۔باباجی نے آنکھیں نیلی پیلی کیں

اور شیر کی طرح ڈکارے۔بس ضعیف الاعتقاد آدمیوں کے ہوش اڑ گئے کہ اب باباجی کو غصہ آ گیا ہے۔خدا ہی خیر کرے۔دو چار ڈرپوک آدمیوں نے تو مارے خوف کے آنکھیں ہی بند کرلیں۔اور باباجی کا چہرہ تمتمانے لگا۔ایک شخص نے کہا باباجی یہ انجان ہے۔اس پر رحم کیجئے"۔

دوسرا بولا کہ:

نادان ہے۔جانے دیجئے۔

تیسرے نے اس سے کہا کہ:

پاؤں پڑ اور ہاتھ جوڑ"

تو باباجی کیا کہتے ہیں؟۔

فقیر:نہیں اس سے پوچھو کہ کیا دیکھے گا؟۔

لوگ:کیا دیکھے گا بول؟

شخص:۔میں تو روپیہ کا بھوکا ہوں۔اور بس دھن دولت چاہتا ہوں۔جو باباجی میں قدرت ہو تو مجھے اس وقت اور کچھ نہیں تو دو چار روپے ہی دے دیں۔

فقیر:۔بچہ فقیروں کو دولت سے کیا کام: مگر اچھا دیکھو منگواتا ہوں۔چل۔چل۔چل۔چل۔ہن برسے ۔برسو۔برسو۔برسو۔کھن۔کھن۔۔کھن۔وہ برسے یہ برسے۔

اچھا بچہ جا فقیروں کی کٹیا میں دیکھ۔ٹاٹ کا کونا اٹھا۔سیدھا چلا جا مگر پیچھے مڑ کر دیکھا تو تو جائے گا۔اور جو وہاں کوئی ڈراونی صورت دکھائی دے تو ڈر مت جانا۔نہیں تو مر جائے گا۔

ہاں یہ کہنا تو بھول ہی گیا تھا کہ فقیر نے اس کوٹھری کے ایک کونے میں پردہ ڈال رکھا تھا۔اور اس پردے میں ایک آدمی کا منہ کالا کر کے اس کو بٹھا دیا منہ کالا کوئلہ سا اور ہونٹ لال انگارہ۔

اب ان میاں کے ہوش گم کہ خدا جانے کیسی بھیانک صورت نظر آئے گی۔ایسا نہ ہو کہیں ڈر جائیں اور جان ہی جاتی رہے۔تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔بابا جی ایک ایک کو کہتے ہیں کہ جس کو روپے لینا ہو چلے مگر کسی کو جرات نہیں ہوتی کہ جائے تب ایک نوجوان کھڑا ہوا۔

نوجوان:۔لیجیے میں جاتا ہوں۔

فقیر:۔بچہ جاتا تو ہے۔مگر سنبھل کے۔دیکھ ہم نے جتا دیا ہے بچہ۔

نوجوان:۔اجی بچہ کیسا۔ہم تمہارے بھی بابا ہیں۔آپ بھولے کس بھروسے ہیں؟۔مجھے بھی کوئی وہ مقرر کیا ہے۔میں ابھی جاتا ہوں۔مجھے وہ خوف ناک شکل دکھائیے۔

فقیر:۔تیری جوانی پہ ترس آتا ہے۔مت جا۔کہا مان۔۔کہا مان۔۔کہا مان۔

(نوجوان روکتے روکتے بھی کوٹھری میں گھس گیا)

ٹاٹ کو اٹھایا اور جتنے روپے رکھے تھے سب حضرت نے جیب میں رکھ لیے۔چلنے ہی کو تھے۔کہ وہ مردود یو نمارٹ سے نکل آیا۔اور ان کی طرف دانت کھول کر جھپٹا۔اور جب کوئی گز بھر کا فاصلہ رہا تو منہ کھول کر چاہا کہ ان کو کاٹ کھائے۔ادھر اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔جیسے ہی اس نے منہ کھولا۔بس ویسے ہی انہوں نے لکڑی منہ میں ٹھونس دی اور پہلے تو اتنی چوٹیں لگائیں۔اتنی چوٹیں لگائیں۔کہ بوکھلا دیا۔اور پھر

چمٹ کرا تنا مارا۔ اتنا مارا کہ یاد ہی تو کرتا ہوگا۔ اب انہوں نے چاہا کہ اس کو باہر لے جائیں۔ مگر وہ مردود یونہا بھی شہزور تھا۔

ہاتھ چھڑا کر دوسری طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ انہوں نے روپے ہضم کیےاور اکڑتے ہوئے باہر نکلے۔ تو سب دنگ کہ یہ تو خوش خوش باہر آئے ہیں۔ اور ہم سمجھے تھے کہ اب ان کی لاش ہی باہر آئے گی۔ اور یہ جیتے نہ پھریں گے مگر وہ تو اور بھی اکڑ رہے ہیں۔

نوجوان:۔ فقیر سے کہیے حضرت وہ شکل کیا ہوگئی۔

فقیر: تمہاری جوانی پر ہم نے رحم کیا۔

نوجوان:۔ رحم وحم تو نہیں پہلے جا کر پوچھے تو کہ کتنی ہلدی لگائی؟۔ اگر عقل والے وہاں بیٹھے ہوتے تو سمجھ جاتے کہ باباجی فقرہ باز ہیں۔ مگر وہاں جتنے بیٹھے تھے سب ضعیف الاعتقاد۔ باباجی کے معتقد۔ وہ سمجھے کہ باباجی نے بے شک اس جوان پر رحم کیا ہے۔ ورنہ زندہ نہ بچتا۔

اب باباجی نے خوب ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ ایک روز کسی مہاجن کے ہاں گئے۔ وہاں محلے بھر کے مرد۔ عورت ان کے درشن کے لئے جمع ہو گئے۔ رات کو جب سب چلے گئے تو انہوں نے مہاجن کے لڑکے سے کہا کہ ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ اب ہم تم کو کچھ دے جائیں گے۔ باباجی کا اتنا کہنا تھا کہ لڑکا ان کے قدموں میں گر پڑا۔ حضرت نے فرمایا کہ ایک کوری ہانڈی لاؤ۔ اور چولہا گرم کرو۔ پھر آپ نے فرمایا کہ پیتل یا لوہے کا ایک پترا لاؤ جو دو انگل سے زیادہ نہ ہو۔ وہ فوراً لوہے کا ایک پترا لایا۔ باباجی نے فرمایا کہ اس کو ہانڈی میں ڈال دو۔ اور پاؤ بھر پانی

میرے پاس لے آؤ۔ پانی لے کر آپ نے کچھ پڑھا اور ہانڈی میں اس کے سامنے پانی ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک پڑیا دی اور کہا کہ سفید سفید دوا اس میں ڈال دو۔ کوئی آدھ گھنٹے تک باباجی بیٹھے رہے۔ آدھ گھنٹے بعد مہاجن کا لڑکا مکان کے اندر گیا۔ اس موقع کو غنیمت جان کر باباجی نے لوہے کا پترا نکال لیا۔ اور اپنے پاس سے سونے کا پترا ہانڈی میں ڈال دیا۔ اور روانہ ہو گئے۔ مہاجن کا جو لڑکا باہر سے آیا تو دیکھا کہ باباجی غائب ہیں اور سونے کا ڈلا موجود۔ محلے بھر میں خبر ہو گئی پھر تو باباجی کی سب کو جستجو ہوئی اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک مالدار کی بیوی نے اپنا زیور دے دیا کہ اس کے سونے کو ایسا کھرا کر دو کہ پچاس روپے تولہ کی قیمت سے بکنے کے لائق ہو جائے۔ باباجی نے جو کوئی پانچ۔ چھ ہزار کی رقم پائی تو لے کر غائب ہو گئے۔ پولیس والوں نے بہت ڈھونڈا مگر نہ ملے۔ ایک برس کے بعد پرسوں پکڑے گئے۔ اب ہتھ کڑی پڑی۔ خدا نے چاہا تو چودہ برس کے لئے بھیجے جائیں گے۔ حضرت زمانہ بڑا نازک ہے۔

خوجی کی درگت

ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ مگر خوجی آپ ہی اپنی نظیر بنے رہیں گے۔ غصہ تو ان کی گھٹی میں تھا۔ بات ہوئی اور تنک گئے۔ اور قرولی تو بات بات پر نکلتی تھی۔ ایسی قرولی بھی کسی نے کم دیکھی ہوگی۔ جس پر غصہ آیا فوراً فرمایا:

اوگیدی! نہ ہوئی قرولی۔ ورنہ اتنی بھونکتا کہ لاش پھڑکنے لگتی۔

الغرض میاں آزاد اور خوجی بمبئی میں آن پہنچے۔ جب بمبئی میں داخل ہوئے تو شہر پناہ کے پاس دونوں میں دو دو چونچیں ہو گئیں۔

آزاد:۔ چلو کسی اچھی سرائے میں چل کر بسیرا لیں۔

خوجی۔ کہنے والے اور چلنے والے دونوں کی ایسی تیسی۔ کیوں بچہ جی ایسا ہی وعدہ کرتے اور پورا کرتے ہو۔ وہ قرولی تو خرید دیتے ہی رہے۔ اور افیم کے لئے بھی کبھی پورے سولہ گنڈے نہ دیے۔ اب یہ وعدہ خلافی کرتے ہو۔ اسی لیے تو ہم نے پہلے ہی قول لیا تھا کہ چاہے آسمان کی جگہ زمین اور زمین کے مقام پر آسمان آجائے۔ مگر ہم سرا میں قدم نہ رکھیں گے۔ سانپ کا کاٹا رسی سے ڈرتا ہے۔ اس دن کمہار نے اتنی بے بھاؤ کی لگائیں کہ بس ہمارا ہی سر جانتا ہے۔

آزاد:۔ اجی دنیا بھر کی سراؤں میں کمہار ہی تو کمہار ہیں۔ وہ باتیں کرتے ہو کہ گدھوں کو بھی ہنسی آئے۔

خوجی:۔ اچھا تو اس شرط پر چلتے ہیں کہ رات کو کسی پیڑ پر بسیرا کریں گے۔

آزاد اور میاں خوجی دونوں چلے تو سرا میں کھٹ سے داخل۔ ایک کوٹھری میں جا کر

میاں خوجی تو مزے سے ایک چھپر کٹ پر دراز ہوئے۔ دوسری کھٹیا پر میاں آزاد خراٹے لینے لگے۔ خوجی افیمچی آدمی نیند کہاں؟ ۔ بس کوئی دم آنکھ جھپکنے ہی نہ پاتی۔ آزاد نے تکیے پر جو سر رکھا تو نیند ہاتھ باندھے آن موجود ہوئی۔ خوجی نے جو ان کی یہ کیفیت دیکھی تو آپ ہی آپ کہنے لگے کہ

ارے میاں آزاد گزر گئے۔ بے چارے خوب آدمی تھے۔

ابھی باتیں کرتے ہی تھے کہ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں۔ کہ ایک شیطان کی خالہ سامنے سے چمکتی دمکتی آتی ہے۔ مگر قد کوئی سات فٹ کا۔ نصف انچ کم نہ جو بھر زیادہ۔ خوجی نے اس کی طرف نظر ڈالی تو اس نے ایک تیکھی چتون سے انہیں دیکھا۔ اور اٹکھلیاں کرتی ہوئی چل چلی تو خوجی نے سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز سنتے ہی وہ ان کی طرف جھک پڑی اور چھما چھم کرتی ہوئی کوٹھری میں آ گئی۔ اب خوجی کے حواس گم ہوئے۔ سوچے کہ اگر آزاد کی آنکھ کھل گئی تو وہ چھوڑیں گے نہیں۔

اشارے سے کہا کہ ذری ذری آہستہ آہستہ بولو'

خوجی: ۔منہ پر انگلی رکھ کر چپ ۔چپ

عورت: ارے واہ کیا چپ شاہ کا روزہ ہے۔

خوجی: ۔اشارے سے میاں آزاد سوئے ہوئے ہیں۔

عورت: ۔ان کا لحاظ کرتے ہو کیا باپ ہیں تمہارے؟ ۔

خوجی: ۔واسطے خدا کے چپ بھی رہو۔

عورت: ۔چلو ہم تم دوسری کوٹھری میں چل کر بیٹھیں۔

خوجی اور وہ عورت چلے اور ایک کوٹھری میں یوں باتیں ہونے لگیں۔

خوجی: آپ کا نام

عورت:۔ کیسر

خوجی:۔ کانپ کر سچ کہنا کہیں زعفران کی بہن تو نہیں ہو۔

عورت:۔ اللہ جانتا ہے کتنے خوبصورت جوان ہو تم اور خدا پاک کی قسم کیا ہاتھ پاؤں پائے ہیں؟۔ مگر داڑھی منڈوا ڈالو۔

خوجی:۔ اکڑ کر۔ ابھی کیا۔ جوانی میں دیکھنا ہم کو۔

راوی:۔ کیا خوب ابھی جوانی شاید پھر آنے والی ہے۔ کچھ اوپر پچاس کی عمر ہونے کو آئی اور کہتے ہیں کہ ابھی کیا'' جوانی میں دیکھنا ہم کو۔ اس عورت نے آپ کو انگلیوں پر نچانا شروع کیا کہ ماشا اللہ کیا ہاتھ پاؤں ہیں۔ اور حضرت پھول بیٹھے۔

عورت:۔ ڈیل ڈول کتنا پیارا ہے اور نک سک سے کتنے درست ہیں آپ کہ ماشا اللہ۔ جی خوش ہو گیا۔ مگر داڑھی منڈوا ڈالو۔

خوجی:۔ اور جو میں ورزش کروں تو (دونوں بازوؤں کو پھڑکا کر) تو شیدھی لنڈور کو لڑاؤں۔

عورت ذرا کان تو پھٹپھٹا ڈالو۔ شاباش۔

خوجی:۔ ایک بات کہوں برا تو نہ مانو گی۔

عورت:۔ جو برا مانوں گی تو ذرا کھوپڑی سہلا دونگی۔ چلو چھٹی ہوئی۔

خوجی:۔ ہاتھ جوڑ کر جان بخشی کرو تو کہوں۔

عورت:۔ کیا بھٹیارے یا بھٹیاری یا کسی اور کی جان لوگے۔ آخر صاحب یہ جان بخشی کیسی؟۔ اچھا تمہیں جو کہنا ہو وہ کہو۔

خوجی:۔خون معاف ہو۔

عورت:۔چپت لگا کر اے بیوقوف خون کیسا؟۔

راوی:۔ ہات تیرے گیدی کی لے اور لیگا۔پڑی ایک زناٹے کی۔واللہ یہ تو زعفران کی ہمشیرہ جان کی ہمشیرہ جان نکلیں۔چپت بازی ہونے لگی۔خوجی سر کی خیر مناؤ۔

خوجی۔یہ دھول دھپا شریفوں میں بھلا کہیں جائز ہے؟۔

عورت:۔شریف تجھ موئے کو کون نگوڑی سمجھتی ہے۔ٹوپی پھینک کر ایک اور چپت لگائی۔چٹاخ۔

راوی:۔ہاں البتہ اب کی چٹاخ کی آواز گونجی۔کیوں نہ کہتے تھے کہ اب کوجی کے سر کی سلامتی نہیں۔جب نہیں تو اب ہی۔

عورت:۔آنکھیں کیا نیلی پیلی کرتا ہے۔پھوڑ ڈالوں دونوں آنکھیں۔

خوجی۔ہمارا مطلب تو اس جھنجھٹ میں خبط ہوا جاتا ہے۔اب یہ بتاؤ۔جو کچھ ہم کہیں وہ مانوگی۔

عورت ہاں کیوں نہیں (کان پکڑ کر ایک تھپڑ ادھر ایک ادھر) کیا پہلیاں بجھواتے ہو؟۔

خوجی:گھبرا کر۔ہم مانگتے ہیں کہ پہلے قول دو۔

عورت:دیا۔

خوجی:پھر مکرنے کی سند نہیں۔

عورت:نہیں

خوجی: میں کہتا ہوں پھر؟۔

عورت:۔بسم اللہ

خوجی: کہنا یہ ہے کہ۔۔۔مگر کہتے ہوئے دل کانپتا ہے۔

عورت:۔اب میں تم کو ٹھیک نہ کروں کہیں۔

خوجی: (جھجک کر) شادی کرلو میرے ساتھ۔

راوی: اوہو ہو۔ارے واہ رے خوجی: اچھا شوق چرایا۔

یہ جب ہی جوتیاں کھاتے جاتے تھے اور بولتے تک نہ تھے۔مگر جناب خواجہ صاحب کو شادی کا شوق تو چرایا مگر اس دیو کی بچی کو بھی تو دیکھیے۔آپ کو اٹھا کر پھینکے تو گیند کی طرح لڑھکتے جائیے اور پھر قد تو ناپیے آپ کوئی پونے پانچ انگل اور وہ پورے سات فٹ ہے۔اتنی بڑی لمبی عورت تو آنکھوں نے دیکھی نہ کانوں نے سنی۔

خوجی: تمہارے ساتھ بیاہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔

عورت:۔ارے ابھی تم بچے ہو۔دودھ کے دانت تک تو ٹوٹے نہیں۔بیاہ کیا کرو گے بھلا؟۔

خوجی: واہ واہ۔میرے دو بچے کھیلتے ہیں۔ابھی تک ان کے نزدیک لونڈے ہی ہیں ہم۔

عورت:۔پھر ایسی نہ کہیئے۔میرا ابھی تو ایک بچہ کھیلتا ہے۔

خوجی: لاحول ولا۔تو بس پھر معاف کیجیے۔

عورت: آگئے نا جھانسے میں۔اتنا نہ سمجھے کہ ابھی آپ ہی بچہ ہوں۔بچے والی کیسے

ہو سکتی تھی بھلا۔؟

خوجی: کیا عمر ہو گی تمہاری؟۔

عورت:۔بارہ اور پانچ کتنے ہوئے۔

خوجی: بارہ اور پانچ سترہ

عورت:۔پھر اس عمر میں کہیں لڑکا بھی ہوا ہے۔؟

خوجی: کہنا مانو۔نکاح پڑھوا لو۔

عورت:۔کچھ کمائی و مائی تو نکالو اور داڑھی منڈوالو۔

خوجی: دس روپے دے کر لو یہ حاضر ہے۔

عورت:۔اونہہ۔ہاتھی کے منہ میں زیرا۔اچھا خیر!

خوجی: لو یہ پانچ اور لو۔اس کے کپڑے بنوانا۔مگر میری دھجیاں نہ اڑانا۔میں زمین کا گز بن جاؤں گا۔اور تم کو بیگم بنا کر رکھوں گا۔

عورت:۔کان پکڑ کر ایک شرط پر شادی کرونگی۔

خوجی: منظور

راوی: ایں اچھی منظوری ہے۔ابھی شرط سنی ہی نہیں اور منظوری کر لی۔

عورت: صبح اٹھ کر مجھے جھک کر سات بار سلام کرنا اور میں سات چپتیں لگاؤں گی۔

خوجی: اجی بلکہ اور دس۔

راوی: شاباش۔حاتم ایسے ہوتے ہیں بلکہ اور بیس۔

کھوپڑی کوئی کرائے کی تھوڑی ہے۔لاحول ولا قوۃ۔شادی ابھی منزلوں دور ہے۔پہلی ہی منزل ہے اور اس قدر سختی کے ساتھ قول لیا جاتا ہے۔اور کھوپڑی سب

سے پہلے تاکی گئی ہے۔

خوجی: اچھل کر چاند سی بیوی پائی۔

راوی: چاند (سر) گنجی ہوگی۔

عورت: اچھا اسی بات پر پانچ روپے کا نوٹ دائیں ہاتھ سے نکالو۔

خوجی: لو پانچ اور لو۔تمہارے دم کے لئے سب کچھ موجود ہے۔

اب دل چسپ واقعہ سنیئے کہ یکا یک عورت نے جھپ سے خوجی کو گود میں اٹھایا اور بغل میں دبا کر لے چلی تو خوجی بہت چکرائے ۔لاکھ ہاتھ پاؤں مارے ۔ہزار زور کیے مگر اس نے جو دبایا تو اس طرح لے چلی جیسے کوئی چڑی مار جانوروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے لے چلے۔اب سارا زمانہ دیکھ رہا ہے کہ خوجی پھڑ کتے ہوئے جاتے ہیں اور وہ عورت چھم چھم کرتی ہوئی پھرتی کے ساتھ قدم دھرتی یہ گئی وہ گئی ۔ایک مقام پر خوجی بھاگ نکلنے کو تھے مگر اس نے پھر پکڑ لیا۔

خوجی: اب چھوڑتی ہے یا نہیں مگر داڑھی میں بچا ہی لوں گا۔

عورت: ایں ہوش کی دعا کر اب عمر بھر تو چھوڑنے کا نام لوں گی نہیں میں ۔ہم بھلے مانسوں کی بہو بیٹیاں چھوڑ دینا کیا جانیں ۔بس ایک کے سر ہو رہیں ۔بھاگے کہاں جاتے ہو میاں؟۔

خوجی: میاں ابھی سے کیوں کر ہو گئے۔

عورت: بس اب زیادہ ٹراؤ گے تو میں اسی وقت سے چپت بازی شروع کر دونگی ۔(گودی سے اتار کر) بھلا تم بھاگ تو جاؤ۔

خوجی: یارو کیا اندھیر ہے۔میں کچھ قیدی ہوں۔

عورت: چپت لگا کر اور نہیں تو کون ہے تو ؟۔آخر تو ہے کون ۔اب کیا میں کہیں جانے بھی دونگی۔؟

خوجی پیچھے ہٹنے لگے تو اس نے پٹے پکڑ کر خوب بے بھاؤ کی لگائیں۔اب یہ جھلائے اور غل مچایا کہ: کوئی ہے۔لانا قرولی"

تماشائی ۔بازاری اردگرد ٹھٹ کے ٹھٹ لگائے کھڑے ہنس رہے ہیں۔

ایک آدمی: کیا ہے میاں ۔کیا ہے کیا۔یہ دھڑ پکڑ کیسی ؟۔

عورت: آپ کوئی قاضی ہیں۔یہ ہمارے میاں ہیں ۔ہم چاہے ماریں چاہے پیٹیں کسی کو کیا؟۔

خوجی: واہ تو میاں بس مارنے پیٹنے کے ہی لئے ہے بس۔

دوسرا آدمی: ان کو بغل میں داب کر کہاں لے چلیں؟۔

عورت: ۔جدھر سینگ سمائے۔

خوجی: ہائے نہ ہوئی قرولی۔

کانسٹیبل: کیا قرولی: ۔پہلے لائسنس تو دکھاؤ! پھر قرولی نکالو۔

تیسرا آدمی: ارے واہ رے بے غیرت جروا (عورت) نے دبایا اور مارا اور تو دم بخود کھڑا ہے۔

چوتھا آدمی: تو حضرت کرے کیا۔یہ بچارے دبلے پتلے مریل آدمی۔اس دیونی سے کیوں کر جیت سکتے ہیں۔

خوجی: بھائیو میری جان بچاؤ۔

لوگ: ۔بیاہ کیوں کیا تھا؟۔

عورت: میاں بیوی کے جھگڑے میں آپ لوگ نہ پڑیں۔

خوجی: میاں کون مردود ہے؟

عورت: تو مردود اور کون؟

خوجی: خدا کی مار جو اس کے ساتھ نکاح بھی ہوا ہو۔

عورت: ۔پھر میں یوں ہی بھلا ان کو بغل میں دبوچ کر لے آتی۔

لوگ: ۔جیسے بلی اپنے بچوں کو منہ میں دبا کر گھر لے جاتی ہے۔

کانسٹیبل: یا جیسے دائی بچوں کو گود مین لے کر تماشا دکھاتی ہے۔

خوجی: یارو میاں آزاد کو سرائے سے بلانا۔

عورت: ہاں یہ کہیئے کہ اب آپ کی کچھ اور نیت ہے۔

پھر گود میں اٹھایا اور لے چلی۔ مشک دریاؤ ٹھنڈا پانی۔ مشک دریاؤ ٹھنڈا پانی۔

خوجی ایسے جھلائے کہ بوٹیاں نوچے ڈالتے تھے۔ مگر قرولی میان ہی میں ہے۔

لوگ: اجی بس جاؤ بھی۔ عورت ذات سے جیت نہیں پائے۔ بس عزت ہی ڈبو دی بالکل۔ لاحول ولا۔

عورت: (جھلا کر) ہاں کوسنے بھی لگے۔ اب اچھا اچھا کہہ کر جو اس نے دبایا تو میاں خوجی نے خوب غل مچایا۔

خوجی: ارے یارو کیا شہر شملہ ہے۔ ایک عورت ڈائن ایک بھلے مانس کو مارے ڈالتی ہے۔ اور کوئی بیچ بچاؤ نہیں کراتا۔ یارو خدا کے لئے بچاؤ۔ اللہ بچاؤ۔

اتنے میں میاں آزاد جو بیدار ہوئے۔ تو خوجی غائب غلہ۔

اودھر ادھر دیکھا۔ کہیں پتہ ہی نہیں۔ خوجی۔ خوجی۔

خواجہ صاحب ۔اجی جناب خواجہ صاحب ۔ایں جواب ہی نہیں دیتے ۔ارے میاں کہاں ہو۔وہ ہوں تو بولیں۔

بھٹیاری نے کہا کہ میاں خوجی بازار کی طرف گئے تھے۔آزاد بازار کی طرف گئے کہ دیکھیں کیا مصیبت پڑی ہے۔دیکھا تو دنگ رہ گئے۔للکار کر کہا کہ چھوڑ دے۔ اس عورت نےخو جی کو چھوڑ دیا اور سلام کر کے میاں خوجی سےکہا:

حضور میرا انعام ہوا۔میں بہروپیا ہوں۔

خوجی: کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔پچیس تیس روپے گئے الو کے الو بنے۔

اب میاں خواجہ صاحب گرتے پڑتے لپ جھپ قدم دھرتے چوٹ کھائے ہوئے ہرن کی طرح طرارے بھرتے بازار سے بھاگے تو شہر بھر کے لونڈے لاڑھیے ساتھ۔پیچھے پیچھے تالیاں بجاتے جاتے ہیں۔حضرت خوجی اپنے حساب سے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہیں۔مگر کمر دہری ہوئی جاتی ہے۔

خوجی بے چارے کو راستہ چلنا دوبھر ہو گیا۔جدھر نکل جاتے ہیں۔آوازوں کے چھرے چلتے ہیں۔پھبتیوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔بیوی سے باتیں بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ تلخی نصیب ہوئی۔دل ہی دل میں سب کو صلواتیں سناتے اور چپکے چپکے کوستے اور بڑبڑاتے جاتے ہیں اس طرح حواس اور بھی غائب ہو گئے۔دو چار آدمیوں نے بہروپیے کی بات کی تو خوجی جل بھن کر خاک ہو گئے۔وہ تو کہیئے کہ خیر سے قرولی میان ہی میں تھی۔ورنہ خون کی ندیاں بہنے لگتیں۔اب کسی سے بولتے ہیں نہ چالتے ہیں۔دم دبائے۔قدم بڑھائے۔آنکھیں جھکائے۔گردن نیوڑھائے پٹا توڑ بھاگ رہے ہیں۔اور قطع شریف دیکھ کر لوگوں کو اور بھی ہنسی آتی

تھی۔اوران کی ہنسی ان کوخون رلاتی ہے۔

نیا شہر۔مسافر آدمی۔گلی کوچوں سے ناواقف۔بات کرنے کی قسم کھائی اور شامت آئی۔سرا کا راستہ یاد نہیں۔گھومتے گھامتے۔شہر بھر کے صدقے ہوتے بارے خدا خدا کر کے سرا میں بلا کی طرح نازل ہوئے۔تو یہاں بھی تالیاں بجنے لگیں۔یہ نیم کی چھاؤں میں ایک چھپر کٹ پر دراز ہوئے۔کئی بھٹیاریوں نے حضرت کو آن کر گھیر لیا۔ایک سبز پوش نے مسکرا کر کہا کہ:

''خدا کی مار ایسی عورت پر جو میاں کو گود میں اٹھائے اور بازار میں لے جائے۔

اتنے میں میاں آزاد بھی آگئے اور خوجی کی چارپائی پر بیٹھے۔بے چارے بے بس خوجی نیم کے پیڑ کے سائے میں ٹھنڈی ہوائیں کھا رہے تھے۔فقرے باز فقرے کس رہے تھے۔سرا کی بھٹیاریوں نے ایسا انگلیوں پر نچایا کہ خدا کی پناہ۔

خوجی پھر دھوکا کھا گئے

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جوان اودھی پگڑی سر پر جمائے بانکی ترچھی وضع بنائے او پچی بنا ہوا خوب تنا ہوا۔ جوانی کے جوش میں اکڑتا آتا ہے۔ بھٹیاریاں غور سے تاکنے لگیں۔ چھپ چھپ کے جھانکنے لگیں۔ سمجھیں کہ مسافر ہے۔ چو طرفہ سے غل مچایا۔ آسمان سر پر اٹھایا کہ میاں ادھر آؤ۔ یہاں بستر جماؤ" میاں مسافر دیکھو"

صاف ستھرا مکان ہے" "میاں سپاہی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں ہے" "ذرا تو تکلیف ہو گی نہیں"

سپاہی بولا: ہمیں بازار سے کچھ سودا خریدنا ہے۔

کوئی ہمارے ساتھ چلے تو سودا سلف خرید کر ہم آ جائیں۔

ایک بولی: چلیے ہم چلتے ہیں۔

دوسری نے کہا: لونڈی حاضر ہے۔

تیسری چمک کر بولی: میں جاؤں"

سپاہی نے کہا" پرائی عورت کو بیچ بازار میں لے جانا رسوائی ہے۔ کوئی پڑھا لکھا مرد چلے تو ہم پانچ روپے دیں۔

ابھی چہرہ شاہی کھرے۔ چمکتے کھنکتے گنواتے۔ میاں خوجی کے کان میں جو پانچ روپے کی بھنک پڑی تو کلبلا کر اٹھ بیٹھے اور کہا کہیے تو میں چلوں۔ مگر پانچ نقد گنوا دیجیے۔ بندہ جھگڑے سے منزلوں دور بھاگتا ہے۔

سپاہی نے جھپ سے کھن کھن کر کے پانچوں گن دیے۔

روپے تو خوجی نے ٹینٹ میں رکھے۔اور مال و اسباب بھٹیاری کو سونپ کر سپاہی کے ساتھ چلے۔اب بازار میں حضرت جس طرف سے نکل جاتے ہیں۔غول کے غول جمع۔لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں کہ یہ وہی جانگلو ہے جس کو بہروپیا عورت کا بھیس بدل کر اٹھا لایا تھا۔اور راہ میں خوب گدگدایا تھا۔جسے دیکھو قہقہہ اڑاتا ہے۔لوٹن کبوتر ہوا جاتا ہے۔بھئی خدا کی قسم خوب جھانسا دیا۔اچھی بیوی پائی۔خوب ہی گت بنائی۔کھوپڑی ہی جانتی ہو گی۔چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہو گا۔واللہ کتنے بھولے بھالے ہیں۔خوجی خوب ہی جھلائے اور ایک ایک کو ڈانٹنے لگے کہ "بس اب زبان سے کوئی کلمہ نکلا تو برس ہی پڑوں گا" ایک ایک سے اسی میدان میں لڑوں گا۔

(سپاہی سے) حضرت ذرا قرابینچہ تو دیجیے گا۔اور یہ میرا گنا تو لیجیے گا" یہ کہہ کر خوجی نے کمر کسی اور گنا لے کر پینترا بدلا۔اور ٹھاٹھ سے سامنے کھڑے ہو گئے۔اے کیوں نہ ہو میرے شیر۔اس بات کے صدقے۔اتنے میں ایک شخص نے جھپٹ کر ہاتھ جو مارا تو گنے کے دو ٹکڑے۔ایک تو وہ لے بھاگا۔دوسرا میاں خوجی نے لپک کر اٹھایا۔اور سینکڑوں گالیاں دینی شروع کیں۔سپاہی نے اردگرد کے بگڑے دل بے فکروں کو للکارا اور خوجی کو تھمبو کر کے سمجھایا۔چلتے چلتے ایک افیون کی دکان پر پہنچے۔اب تو میاں خوجی کی جان میں جان آئی۔چنیا بیگم پائی۔باچھیں کھلی جاتی ہیں۔

سپاہی: کہو بھئی جوان۔ہے شوق۔پلواؤں؟

خوجی:۔اے میں تیری زبان کے قربان اوراس دکان کے صدقے۔اس افیون کے واری۔چنیا بیگم میری پیاری۔

سپاہی:شوقین آدمی ہو۔

خوجی:اجی میں تو اس پر عاشق ہوں۔

سپاہی نے میاں خوجی کو خوب افیون پلوائی اور خوجی غٹ غٹ کر کے پیتا ہی گیا۔جب خوب سرور گٹھے اور نشے جمے تو سپاہی نے ان کو ساتھ لیا اور لے چلا۔ راستے میں خوجی سے یوں میٹھی میٹھی باتیں ہوئیں۔

خوجی:افیون پلوائی ہے تو مٹھائی بھی کھلواؤ۔احسان کرے تو پورا کرے۔

سپاہی:ابھی لو!چار گنڈے کی پنچ میل کی مٹھائی حلوائی کی دکان سے لاؤ۔

حلوائی کی دکان سے میاں خوجی نے خوب لڑلڑ کر خوب مٹھائی لی اور چنگیل لے کر جھومتے ہوئے چلے۔اب مارے بھوک کے راستے ہی میں چپکے چپکے ڈلیاں نکال کر چکھنی شروع کر دیں۔سپاہی کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔مگر جان بوجھ کر آنکھ چرا لیتا تھا۔خوجی نے تھوڑی ہی دیر میں آدھی چنگیل خالی کر دی۔

سپاہی:مٹھائی سے بوجھ معلوم ہوتا ہے تو مجھے دے دو۔

خوجی:جی نہیں حضرت میں تو ایک بہنگی اٹھانے کا دم رکھتا ہوں۔آپ پاؤ بھر مٹھائی بوجھ سمجھتے ہیں

سپاہی:۔کیا کسی کمہار کی نسل سے ہیں آپ؟

خوجی:(سنا نہیں مگر تڑ سے جواب دے دیا)جی ہاں جہ ہاں۔جی ہاں کہہ کر ایک اور ڈلی منہ میں رکھ لی۔اتنے میں سپاہی نے مزدور کے ایک لونڈے کو اپنے ساتھ

لیا اور چلتے چلتے ایک بزاز کی دکان پر پہنچے۔

بزاز: حکم۔ کیا کھریداری (خریداری) ہوگی؟۔

سپاہی: (خوجی کی طرف اشارہ کر کے) ان کے انگرکھے کے برابر جامدانی دیجیے۔ خوجی نے انگرکھے کا نام اور جامدانی کا نام سنا تو جامے میں پھولے نہ سمائے۔

بزاز: اچھا ہجور (حضور) اپنے انگرکھے کے ماپھک (موافق) لیں تو ہمیں بھی کچھ بچ رہے۔ اور خوجی کی طرف اشارہ کر کے ان کا تو انگرکھا اور پاجامہ سب کچھ گج (گز) بھر میں تیار ہے۔

سپاہی تم کو اس سے کیا مطلب۔ کپڑا دکھاؤ۔

خوجی: گنا ٹیک کر نکالو جامدانی نکالو۔ بہت باتیں نہ بناؤ۔

بزاز: لیجیے کیا جامدانی ہے اول نمبر۔ بہت بڑھیا۔ مول تول دس روپے گز نہیں سات روپے گز کو آئے گی۔

سپاہی: ۔ بھئی ہم پانچ روپے کو لیں گے۔

بزاز: اب تکرار کون کرے۔ آپ چھ کے دام دیں۔

سپاہی: اچھا دو گز اتار دو۔

بزاز: لیجیے یہ الپاکا ہے۔ سات آنے گز دیا ہے۔

سپاہی: اچھا دس گز یہ بھی اتار دو۔

سپاہی نے بزاز سے کل ملا کر پچیس روپے کا کپڑا لیا۔ میاں خوجی کی یہ کیفیت کہ افیم کے نشے میں غین۔ سر کی خبر نہ پاؤں کی۔ ایک ہی دفعہ جو نشے میں جھونک کھائی تو

سر پاؤں کو لگ چلا۔مزدور کا لونڈا یہ حال دیکھ کر ہنس پڑا۔تو حضرت جاگ اٹھے مگر پھر آنکھیں جھپک گئیں۔سر کھمبے کی طرف چلا۔اپنے آپ میں تو تھے ہی نہیں۔وہ تو افیم کے بس میں تھے۔میاں سپاہی جب خوب لے دے چکے تو گٹھا باندھ کر لونڈے کو دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

بزاز: کہاں؟

سپاہی: گھر

بزاز: گھر؟۔

سپاہی: ہاں

بزاز: اور کپڑے کے پیسے

سپاہی: آ کر دیں گے

بزاز: واہ۔

سپاہی: ارے بھائی کچھ چوروں سے بیوہار ہے۔

بزاز: جمانا نا جک (زمانہ نازک) ہے۔

سپاہی: (خوجی کی طرف دیکھ کر) ہمارا سالا بیٹھا ہے۔ہم ابھی آئے۔وہ تو خوجی کو سالا بنا کر چل دیے۔اب کوجی جو پینک سے چونکے تو سپاہی نہ مزدور کا لونڈا۔فقط خوجی اور ران کا گنا۔یہ بھی چلے تو بزاز نے گردن ناپی۔

''کہاں چلے آپ''

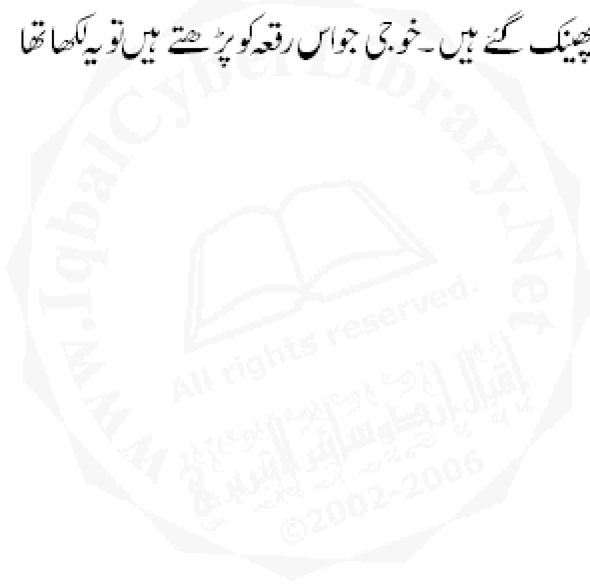
''کہاں چلے کہاں؟ ہم کیا کسی کے غلام ہیں؟۔

''گلام (غلام) نہیں تو اور کون ہو؟''تمہارے بہنوئی تم کو بٹھا کر کپڑا لے گئے

ہیں۔تب تو خوجی چکرائے۔

''ابے کیسے بہنوئی؟۔

ابے تبے نہ کرنا میاں۔سالے ہوان کے کہ نہیں'' اتنے میں ایک شخص نے کہا یہ خط وہ یہاں پھینک گئے ہیں۔خوجی جو اس رقعہ کو پڑھتے ہیں تو یہ لکھا تھا



رقعہ

''ہات تیرے کی۔ کیوں کھا گیا نا جھانسا۔ دیکھ اب کی پھر پھانسا۔ پہلے بیوی بن کے پٹا تھا۔ اب کی میاں بن کے غپا دیا۔ بڑے مزے سے حضرت مٹھائی کھانے آئے تھے۔ گویا ہم اندھے تھے۔

خوجی: ارے کرکے رہ گئے۔ واہ رے بہروپیے۔

خوجی چکر میں کہ اچھا گھن چکر بنایا۔ سالا کا سالا بنا گیا۔ اور غپا جو دیا وہ الگ۔ خیر تو جو ہوا وہ ہوا۔

اب یہاں سے چھٹکارا تو ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ یہاں کسی سے جان نہ پہچان اور قرولی پاس نہیں۔ برے پھنسے۔

پھر ایک ہی دفعہ حضرت خوجی نے آنکھیں نیلی پیلی کیں اور مارے غصے کے منہ لال چقندر ہو گیا۔ حضرت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ گنا تان کے پینترا بدل کے کھڑے ہو گئے۔ اور بزاز کو گنا دکھا کر کہا دوں ایک۔

بزاز نے جوان کے قد وقامت اور ڈیل ڈول پر نظر ڈالی تو ہنس دیا اور گنے کے جواب میں اس نے گز اٹھالیا۔

آیئے آپ کا گنا۔ ہمارا گج (گز)

خوجی: بہت ہی بگڑے اب قسمیں کھاتے ہیں کہ بھائی میں تو اچھی طرح اس کی صورت سے بھی واقف نہیں۔ مجھے کیوں پھانستے ہو؟۔

بزاز بولا: جب تک آپ کے بہنوئی نہیں آئیں گے۔ میں دکان سے ملنے نہ دونگا۔

اتنے میں ایک شخص نے آ کر بزاز کو سات روپے دیے اور کہا: "لیجیے انہوں نے کپڑا واپس کر دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ ہمارے سالے کو چھوڑ دو" بزاز نے روپے گن لیے اور خوجی کو آزاد کیا۔ بارے خدا خدا کر کے اس جھنجٹ سے جان چھوٹی۔

خوجی کی چالاکی

خوجی ایک شخص سے بہروپیے کے مکان کا پتا پوچھ چکے تھے۔پوچھتے پوچھتے بہروپیے کے مکان پر داخل ہوئے۔اس وقت اتفاق سے بہروپیا گھر میں نہ تھا۔اور بہروپیے کی بیوی کو ضرورت تھی کہ اپنے ایک عزیز کو تیس روپے بھیجے۔وہ پارسل بنا کر اور سی کر رکھ چکی تھی۔لونڈی سے اس نے کہہ دیا تھا کہ جو کوئی پڑھا لکھا آدمی ادھر سے گزرے۔تو اس سے پارسل کا لفافہ لکھوا لینا۔لونڈی کھڑی راہ دیکھ رہی تھی۔میاں خوجی تو اس تاک میں تھے ہی کہ کسی طرح لونڈی سے ہم کلام ہوں۔اور لونڈی اس فکر میں کہ کوئی منشی یا مولوی ملے تو اس سے لفافہ لکھوا لوں۔خوجی اور اس کی یوں گفتگو ہوئی۔

خوجی: لونڈی سے کیوں جی ذری پانی نہیں پلاتی ہو؟۔لونڈی یہ سنتے ہی پھول گئی۔لو منہ مانگی مراد پائی جو دل میں آرزو تھی بر آئی خوش ہو کر بولی کہ میاں بیٹھو۔پانی پیو۔پان کھاؤ۔حقہ گڑ گڑاؤ۔میں ابھی لائی دوڑتی دوڑتی گھر میں گئی۔اور ہنس کر بیوی سے کہا: لو اب کیا چاہتی ہو؟ میں پانی لیے جاتی ہوں۔آپ جھپ سے پان بنا رکھیے۔ایک منشی کو بڑی دور سے پھانس پھونس کر لائی ہوں۔اور دو آنے کی رقم بھی اینٹھی۔

اب سنیے لونڈی اس قدر گھبرائی ہوئی تھی کہ جس برتن میں پان بھیگ رہے تھے۔وہی جلدی سے اٹھا کر لے گئی۔پانی کھاری اور کڑوا ہو رہا تھا۔پانچے ایک ہاتھ سے اٹھائے اور دوسرے ہاتھ میں کٹورا لیے ہوئے باہر پہنچی۔

لونڈی: لیجیے میاں پیجیے!

خوجی: ہنس کر تم بڑی نیک بخت ہو۔

لونڈی:۔ ارے واہ میں نے اتنا سارا پانی پلا دیا تو کیا احسان کر دیا؟۔خوجی نے کٹورے سے پانی پیا تو غل مچایا کہ کیا زہر ملا لائی ہو۔ مار ہی ڈالا۔ لا حول ولا قوۃ۔اپنے دل میں سچ ہے۔واللہ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ بہروپیے کی لونڈی نے اس کے بھی کان کاٹے۔خیر لونڈی جھٹ پٹ اندر گئی اور صراحی سے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی لے آئی۔میاں خوجی نے پیا تو جان میں جان آئی۔اتنے میں پان لا کر میاں خوجی کو دیا۔ چباتے ہی اگل دیا۔منہ ہی کاٹ ڈالا۔چونا ہی چونا لگا لائی ہو۔ارے توبہ (دل میں) اس بہروپیے کی بیوی تو لونڈی کی بھی خالہ ہے۔بڑی بی تو بڑی بی چھوٹی بی سبحان اللہ۔دونوں بس کی گانٹھ۔

اتنے میں لونڈی اندر سے پارسل لائی اور کہا کہ میاں اتنا احسان ہم پر کرو کہ اس پارسل کا لفافہ لکھ دو۔

خوجی: اچھا کہاں جائے گا کس کے نام ہے۔کون بھیجتا ہے۔کچھ معلوم بھی تو ہو یا واہی تباہی جہاں چاہوں بھیج دوں۔

لونڈی:۔ میں بیوی سے سب حال پوچھ لوں تو بتاؤں۔آپ بیٹھے رہیئے گا۔پارسل مجھے دے دیجیے گا۔میں ابھی آئی (پردے کے پیچھے سے) میاں جانا نہیں۔میں صدقے ایک پان اور کھلا دونگی۔

خوجی: اچھا جاؤ جاؤ (دل میں سوچا) کہ اف کیا کائیاں لونڈی ہے۔پارسل جھپاک سے لے ہی بھاگی۔نہیں تو اس وقت پارسل ہی اڑا دیتا۔لونڈی اندر سے

پارسل لے آئی اور بہروپیئے کی بیوی نے اندر سے پتا بتا دیا۔ میاں خوجی نے پتے اور نشان کی دم پر رسا باندھا۔ اور اپنا نام اس پر موٹے قلم سے لکھ دیا۔ شہر بمبئی۔ محلّہ بھنڈی بازار۔

قبلہ وکعبہ میاں خواجہ بدیع صاحب کو ملے۔

یہ لفافہ لکھ کر حضرت نے لونڈی کو دیا اور اپنی راہ لی۔ لونڈی نے فوراً ڈاک خانے میں پارسل کر دیا۔ اور رجسٹری کرا کے چلتی ہوئی۔ واہ رے لونڈی۔

دوسرے دن دوپہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ لال لال پگڑی سر پر جمائے آیا۔

ہرکارہ:۔ کیا یہاں کوئی کھوجی رہتے ہیں؟

خوجی: ہاں جی ہاں ہمارے نام پارسل آیا ہوگا (اٹھ کر پارسل لیا) دستخط کیے اور ہرکارہ روانہ ہو گیا۔

اب آزاد بڑے حیران کہ کھوجی کے پاس پارسل کہاں سے آیا ہوگا۔ پڑھا تو سخت حیران ہوئے کہ قبلہ وکعبہ لکھا ہے اور پتا بھی ٹھیک ٹھیک۔

ادھر بہروپیا جو گھر میں گھسا تو بیوی نے کہا: لو تم لفافہ نہیں لکھتے تھے۔ ہم نے لکھوالیا اور جھپ سے پارسل بھجوا دیا۔

لونڈی: ایک ٹھگنے سے دبلے پتلے آدمی تھے افیم کے نشے میں اونگھتے چلے جاتے تھے۔ انہوں نے لکھ دیا۔

بہروپیا: (ہاتھ مل کر) ارے۔ افسوس مار ڈالا۔ دے گیا چکما۔ وہی سرائے والا خوجی ہوگا۔ بس غضب ہی ہو گیا۔

بیوی خیر تو ہے؟۔

بہرو پیا: کچھ نہ پوچھو۔

بیوی: ۔یہ افسوس کیسا۔جلد حال بتاؤ۔کلیجہ الٹا جاتا ہے۔

بہرو پیا: تمھیں کیا بتاؤں؟۔

بیوی: ۔کیا ایسی ہی بات ہے کہ مجھ سے کہنے کی نہیں۔کیا کوئی دھوکا دے گیا ہے؟۔

بہرو پیا: بس چپ رہو۔

بیوی: آخر یہ ماجرا کیا ہے۔کیا کسی سے لڑ کے آئے ہو۔یہ گڑ بڑاتے کیا ہو؟۔تم نے نہ لکھا ہم نے دوگلوری دے کر کسی اور سے لکھوالیا۔

بہرو پیا: غضب کیا۔

بیوی: ۔کچھ کہو گے بھی یا یہی کہے چلے جاؤ گے کہ غضب ہوا۔آخر معلوم تو ہو کس نے غضب کیا۔

آ چھیں

بیٹی میں حسن آرا کی رشتے کی ایک بہن تھیں۔حسن آرا نے خط لکھ دیا تھا کہ آزاد بمبئی آئیں گے۔انہیں جب آزاد کے آنے کا پتا چلا۔تو وہ لوگ انہیں سرائے سے اپنے گھر لے گئے۔ظاہر ہے کہ خوجی بھی ساتھ ہی تھے۔

بمبئی میں آزاد کی مسلمانوں نے بڑی ہی خدمت کی اور ایک دن مقرر ہوا کہ میاں آزاد کے یہاں آنے اور ترکی جانے کے سلسلے میں ایک جلسہ کریں گے۔میاں آزاد اپنے دوست میرزا صاحب یعنی حسن آرا کی بہن کے میاں کے ساتھ جہاز کی فکر میں گئے اور ادھر خوجی نے افیم کی چسکی لگائی اور پلنگ پر دراز۔زیبن یعنی مرزا صاحب کی لونڈی جو باہر آئی تو حضرت کو نشے میں دیکھ کر خوب ہی کھل کھلائی اور اندر جا کر بیوی سے یوں کہا۔

زیبن: اے بیگم صاحب ذری پردے کے پاس آیئے تو لوٹ لوٹ جایئے گا۔یہ مواخوجی بڑی افیم کھاتا ہے۔ذری آیئے تو سہی۔

بیگم نے پردے کے پاس سے جو جھانکا۔تو ایک دل لگی سوجھی۔جھپ سے ایک بتی بنائی اور زیبن سے کہا کہ لے چپکے سے ان کی ناک میں بتی کر۔زیبن ایک ہی شریر۔جا کے بتی میں مرچیں بھی لگا لائی اور خوجی کی چارپائی کے نیچے گھس کر سرہانے کی طرف گئی اور ہاتھ بڑھا کر میاں خوجی کی ناک میں آدھی بتی داخل کر دی۔اور جھپ سے کھینچ لی۔

خوجی جو کلبلا کے اٹھے تو ۔اچھیں۔۔اچھیں۔

۔چھیں ۔۔اچھیں ۔۔چھیں ۔اوگید۔۔۔(گیدی کہنے کو تھے کہ چھینک آ گئی ۔اور اوگیدی ہی کہہ کر رہ گئے) او نا ۔۔۔اچھیں ۔۔۔او نامعقول کہنے کو تھے کہ چھینک نے زبان بند کردی ۔اور معقول کا لفظ اس نامعقول کی زبان تک نہ آنے پایا کہ ۔اچھیں ۔

اتفاق سے پڑوس میں ایک پرانے زمانے کے بزرگوار نوکری کی تلاش میں ایک حاکم کے پاس جانے والے تھے ۔وہ جیسے ہی دہلیز کے قریب آئے خوجی نے چھینکا ۔اندر چلے گئے ۔بیوی نے ایک پان بنا کر دیا ۔چباتے ہوئے چلے ہی تھے کہ پھر چھینک پڑی لاحول ولا ۔پھر اندر گئے اب کی چکنی ڈلی کھائی ۔روانہ ہونے ہی کو تھے کہ ۔اچھیں ۔کی آواز آئی ۔اور ادھر بیوی نے لونڈی کو دوڑایا کہ اندر چلیے بیوی بلاتی ہیں ۔اندر جا کر انہوں نے جوتے کا پاؤں بدلا ۔پانی بھی پیا اور رخصت ہوئے جیسے ہی باہر آن کر رکاب پر پاؤں رکھنے ہی کو تھے کہ خوجی نے ناک کی دونالی بندوق سے ایک اور فیر داغ دیا ۔تب تو وہ بہت ہی جھلائے ۔

ہات تیرے چھینکنے والے کی ۔ناک کاٹوں مردود کی ۔اور پاؤں تو کیا کان بھی صاف کتر لوں ۔مردود نے مرچوں کی ناس لی ہے کیا ۔ناک کیا ہے ۔ناک چھلنی کی جھاڑی ہے ۔ہات تیری منحوس نے جانا دوبھر کر دیا ۔رکاب پر قدم رکھا اور ۔چھیں ۔دہلیز تک آئے تو ۔چھیں ۔

بیوی اندر سے بولی کہ: ناک کٹے موئے کی جو پرانی بدشگونی کے لئے ایسی دل لگی بازی کرتا ہے ۔ذری زیبین کو بلا کر پوچھو تو یہ کس نکٹے مونڈی کاٹے کو بلایا ہے ۔اللہ کرے گدھے کی سواری نصیب ہو ۔

ادھر یہ میاں بیوی پانی پی پی کرکوس رہے تھے۔ ادھر خوجی کا سچ مچ چھینکتے چھینکتے ناک میں دم ہو گیا تھا۔ اور بیگم صاحبہ گھر کے اندر لوٹ رہی تھیں۔ ہنسی کا ضبط کرنا محال تھا۔ مگر واہ ری زیبین چارپائی کے نیچے دبکی پڑی رہی۔ سانس تک نہ لی۔ مگر مارے ہنسی کے برا حال تھا۔ سمجھی کہ ہنسی اور قلعی کھلی۔ دم بخود جب چھینکنے نے ذرا فرصت دی۔ تو خوجی نے غل مچایا۔ او گیدی بھلا بہروپیے نکالی ناک سر تو نے۔ اچھا بچہ جی چچا ہی بنا کر چھوڑوں گا۔

خوجی بے چارے اٹھے اور پانی لے کر منہ دھویا اور کھوپڑی پر خوب پانی ڈالا۔ تب ذرا کسی قدر تسلی ہوئی اور بیٹھ کر بہروپیے کو کوسنا شروع کیا۔ خدا کرے سانپ کاٹے مردود کو مکان پھٹ پڑے۔ سونا تک ملعون نے حرام کر دیا۔ خدا جانے اس کو میرے ساتھ کیا ضد پڑ گئی ہے۔ یہ گھر بھی ڈھونڈ نکالا۔ ٹھہر مردود کل تیرے چھپر پر چنگاڑی ہی نہ رکھ دی تو خواجہ بدیع نہیں۔ ہونے دے تڑکا۔ دن دہاڑے آگ لگاؤں گا۔ اس تقریر کو سن کر زیبین کا برا حال تھا۔ لوٹتی تھی مگر واہ ری زیبین۔ اس وقت کی فوٹو کھینچنے کے لائق تھی۔ دبکی دبکائی۔ سکڑی سکڑائی چارپائی کے نیچے پڑی تھی۔ سانس تک لینا محال تھا۔

اتنے میں میاں خوجی نے دروازے سب بند کر دیئے۔ جب سب دروازے بند ہوئے تو زیبین چکرائی۔ کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ اور قریب تھا کہ چیخ کر نکل بھاگیمگر دیکھا کہ میاں خوجی چارپائی پر دراز ہو گئے۔ اور ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ زیبین کی جان میں جان آئی۔ چپکے سے کھسکتی ہوئی نکلی اور بھاگتی ہوئی دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ خوب کھل کھلا کر ہنسی۔ ادھر بیگم صاحبہ قہقہے لگاتی تھیں اور ادھر

زیبین زمین پر لوٹتی جاتی تھی۔

بیگم جاؤ۔اب کی پھر چپکے چپکے ناک میں بتی کر آنا۔

زیبین: نہ بیوی اب میں نہ جانے کی۔بڑی سودائی آدمی ہے۔اس کے منہ کون لگے؟۔

بیگم:ہاں نہ جاؤ گی۔اچھا نہ جاؤ۔

زیبین:۔لو بیوی یہ تو زبردستی کی بات ہوئی۔وہ کیا مثل ہے کہ زبردست مارے اور رونے بھی نہ دے

اتنے میں زیبین کا دیور آ گیا۔دس برس کا چھوکرا مگر آفت کا پر کالہ۔انتہا کا شریر شیطان کا چچا اور پھر کانا۔ایک تو کڑوا کریلا پھر نیم چڑھا۔رگ رگ میں شرارت اس نے کہا میں جاتا ہوں اور دیکھے جائیے بیگم صاحبہ کیسے اس اپنچی کو انگلیوں پر نچاتا ہوں۔لیکن انام (انعام) لوں گا۔

بیگم صاحبہ بولیں:۔کہ اچھا ہمیں ہنسا دیا تو انعام دیں گے۔

کتا گھر میں بندھا تھا۔اس نے جھٹ زنجیر سے کھول۔زنجیر میں رسی باندھی اور باہر لے جا کر چارپائی کے پائے سے کتے کو باندھا۔اورمیاں خوجی کی ٹانگ میں بھی رسی باندھ دی اور چمپت۔کتے نے جو بھونکنا شروع کیا۔تو خوجی چونک اٹھے مگر ہاتھ ابھی ناک پر ہی ہے۔دیکھتے ہیں ٹانگ میں رسی اور رسی میں کتا ہے۔اب ادھر سے خوجی چلاتے ہیں۔ادھر سے کتا۔لونڈا گھر سے دوڑا آیا۔خیر تو ہے۔خیر تو ہے۔کیا ہوا؟۔ارے او رسنو کوئی کتے کو ان کی ٹانگ میں باندھ گیا۔اب زور نہ کیجیے۔ورنہ کتا مفت میں ٹانگ پر کاٹ لے گا۔

خوجی: ہوں پوچھتے ہیں کون باندھ گیا؟۔کون کیا۔یہ اسی بہروپیے کا کام ہے۔کسی کو کیا پڑی ہے۔

زیبین:۔اے کیا ہوا میاں کیوں غل غپاڑا مچایا ہوا ہے۔

لونڈا:۔اجی میاں جی کی ٹانگ پر کوئی کتا باندھ گیا۔

خوجی:۔ٹانگ میں کتا باندھ گیا۔یوں نہیں کہتیں کہ دم میں نمدا باندھ گیا۔

زیبین: ہاں میاں میں بھول گئی۔سچ مچ دم میں نمدا بند گیا۔مگر یہ آیا کہاں سے؟۔کواڑ تو سب کے سب بند پڑے ہیں۔

خوجی: یہی تو مجھے بھی حیرت ہے کہ مگر اب کی میں نے بھی ناک پر اس زور سے ہاتھ رکھا کہ بہروپیا میرا لوہا مان گیا ہو گا۔اب یہ تو سوچو کہ آیا کس طرف سے؟۔اچھی دل لگی ہے۔بھلا کتے اور بلی کی دل لگی کونسی نکالی ہے۔اب میں چھچھوندری اس کی ٹانگ سے باندھ آؤں گا۔ٹھہر تو چچا جان۔

زیبین:۔میاں کہتے ڈر معلوم ہوتا ہے۔اس جگہ ایک خبیث رہتا ہے۔

خوجی: خبیث۔اجی نہیں یہ اس بہروپیے کا کام ہے۔

لونڈا:۔یہ یوں نہ مانیں گے جب تک خبیث ان کی چارپائی نہ الٹ دے گا۔تب تک مانے گے تھوڑا ہی۔

خوجی: یہ بات تھی تو اب تک ہم سے کیوں نہ کہا۔بھلا جان لوگی کسی کی؟۔دو دن کے مہمان تمہارے ہاں آئے اور خبیث کو پیچھے لگا دیا۔اب رات کو جو یہاں سوئے اس پر تین حرف۔

زیبن:۔میں بھی کہوں یہ بند دروازہ اور کتا باندھ جانا کیا اچنبھے کی بات ہے۔مگر

اب معلوم ہوا۔ میں تو پہلے ہی کہہ گئی تھی میرا ماتھا تو پہلے ہی ٹھنکا تھا۔ مگر بولی نہیں۔

خوجی:۔ واہ کیا اپنی دانائی بیان کر رہی ہو؟ آزاد آئیں تو ان کو آڑے ہاتھوں لوں۔ وہ خبیث۔ پریت۔ جن۔ چڑیل وغیرہ کسی کے قائل نہیں۔ یہاں سوئیں تو معلوم ہو کہ کبھی بلی میاؤں کر رہی ہے۔ اور کبھی کتا بھونک رہا ہے۔ ایک پائنتی۔ دوسرا سرہانے۔

آزاد کا کارنامہ

آزاد مرزا صاحب کے ساتھ تالاب کے کنارے کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ تالاب کا پانی وہ صاف سیڑھیاں وہ سڈول اور شفاف کہ بے اختیار نہانے کو دل چاہے۔ طبیعت لہرائے کہ دھم سے غوطہ لگایئے۔ درختوں کے سائے میں کھڑے ہوئے میاں آزاد تیراکوں کے کرتب دیکھ رہے تھے۔ ایک شخص لنگوٹا باندھ کر پل پر سے کودا۔ دھم۔ دوسرا درختوں سے دھماک۔ تیسرا چبوترے سے آیا تڑ۔ جن کو استادی کا دعویٰ ہے۔ وہ ابھر ابھر کر کمر اور لنگوٹ دکھاتے ہیں۔ سمجھنے والے تعریف کے پل باندھے جاتے ہیں۔ تیراکی سیکھنے والے کنارے ہی پر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ جو تیرنا ویرنا خاک نہیں جانتے۔ وہ پہلی۔ دوسری ہی سیڑھی پر بیٹھ کر نہائے اور لمبے ہوئے۔ ڈرپوک آدمی دور سے سر تو دیکھ رہے ہیں۔ مگر پانی کے قریب جاتے ہوئے پتہ پانی ہوا جاتا ہے۔ بدن تھرتھراتا ہے۔ بھئی احتیاط شرط ہے۔ پانی اور آگ سے زور نہیں چلتا۔ جس چیز کو انسان نہ جانے۔ اس میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔ جب کچھ عرصہ تک یہ لطف اٹھا چکے۔ تو آزاد نے مرزا سے یوں کہا:

آزاد: کہیے آپ کو بھی تیرنے کا کچھ شوق ہی یا نہیں؟

میرازصاحب: جی میں کچھ دو ہی چار ہاتھ لگانا جانتا ہوں۔

آزاد: ۔مقابلہ ہوگا آپ سے۔

میرزاصاحب: ۔بھلا مجھے کیا سلیقہ۔

آزاد: یہاں سب سے بڑھ کر کون استاد ہے اس فن کا؟۔

میرزاصاحب: وہی جو نیلا لنگوٹ باندھے مشرقی زینوں کی طرف کھڑا ہے۔

آزاد: ۔وہ جن کا چھریرا بدن ہے۔

میرزاصاحب: جی ہاں۔

اتنے میں یہ وقعہ ہوا کہ ایک لڑکا بلا کا حسین تالاب میں نہا رہا تھا۔ کمر کمر تک پانی میں کھڑا غوطے لگا رہا تھا۔ سوچا کہ اچھی طرح غوطہ لگانا محال ہے۔ آؤ ذرا ایک زینہ نیچے اتریں۔ اس شوق سے جیسے ہی ایک پاؤں زینے سے بڑھایا اور بس۔ دوسرا پاؤں بھی ساتھ ہی اٹھ گیا اور اٹھتے ہی چلا۔ اور غڑاپ سے پانی میں ایک غوطہ کھایا۔ پھر ابھرا۔ وہ تو ڈوب رہا ہے۔ اردگرد کے تماشائی ابھی تک یہی سمجھتے تھے کہ دل لگی کرتا ہے۔ آخر کار جب اس نے تیسری بار غوطہ لگایا تو لوگوں نے غل مچایا "ارے دوڑو۔ ڈوبا۔ ہائے ڈوبا۔ ہائے ڈوبا۔

اس کا چھوٹا بھائی بھی قریب ہی ایک زینے پر کھڑا تھا وہ بے اختیار ہو کر چلانے لگا۔ اور سارا زمانہ غل مچانے لگا کہ غوطہ خوروں ک وبلاؤ۔ ملاحوں کو پکڑ واؤ۔ مگر مدد کو کوئی نہیں جاتا۔ جان بھی کیا پیاری ہوتی ہے۔

بڑے بڑے استاد کنارے پر موجود ہیں مگر کندھے تول تول کر رہ جاتے ہیں آخر

کارمیاں آزاد جھپ سے پل پر آئے اور دھم سے کود پڑے۔

ابھرتے ہی غڑاپ سے غوطہ لگایا۔اور غوطہ لگاتے ہی اس لڑکے کا کندھا ہاتھ آیا۔انہوں نے اس کو نکالا۔اور کندھے پر لائے تو دیکھا کہ جان باقی ہے۔کوئی دم کا مہمان ہے۔پڑا سسک رہا ہے۔لیکن آزاد کی تعریفیں ہونے لگیں۔اب کوئی ان کی پیٹھ ٹھونکتا ہے۔کوئی چومے لیتا ہے۔کوئی کروڑوں دعائیں دیتا ہے۔لوگوں نے مل کر اس کو الٹا لٹایا۔جب پانی بالکل باہر نکل گیا تو اس لڑکے کو ذرا ذرا ہوش آیا۔اوراس نے آنکھیں کھول دیں مگر ہیبت چھائی ہوئی تھی۔بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔جب اس لڑکے ک وہوش آیا تو اس نے یوں واقعہ بیان کیا۔

لڑکا:۔میں نے چاہا کہ غوطہ لگاؤں کیونکہ میں جہاں پہلے کھڑا تھا۔وہاں پانی کمر کمر تک تھا۔اچھی طرح سے غوطہ لگانا مشکل تھا۔جب میں نے قدم بڑھایا تو مجھے خود معلوم ہو گیا کہ پانی یہاں زیادہ ہے۔لیکن میرا دوسرا پاؤں خود بخود اٹھ گیا۔اور میں نے لاکھ چاہا کہ بچوں لیکن بچنا سخت دشوار تھا۔بلکہ محال۔جب دونوں پاؤں اکھڑ گئے تو بس غوطے کھانے لگا اور ڈوبا۔اس وقت میری جو کیفیت تھی بیان کرنے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔جب پہلی مرتبہ غوطہ کھایا تو پانی منہ میں جانے لگا۔میں نے ہاتھ سے منہ کو بند کیا تو پانی ناک کی راہ آنے لگا۔جب ناک کو بچایا تو پانی پھر منہ میں آنے لگا۔اتنے میں لاش ابھرنے لگی۔مگر پھر غوطہ کھایا تو پانی کی تہہ میں زرد زرد کوئی شے نظر آئی لیکن ہوش وحواس اب بالکل غائب ہو گئے تھے۔تیسر غوطے کا حال اچھی طرح نہیں معلوم۔اتنا جانتا ہوں کہ میرے دل پر اس قدر دھچکا کبھی نہیں ہوا تھا۔جس قدر اب کی ہوا۔اف

اف اس وقت تالاب کی صورت مجھے کاٹے کھاتی ہے۔اور بے موت میری جان جاتی ہے۔غضب ہی ہو گیا تھا۔مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ صاحب میرے پاس آئیں۔جنہوں نے میری جان بچائی ان کا مجھ پر عمر بھر احسان رہے گا۔

لوگوں نے میاں آزاد کو آواز دی کہ چلیے آپ کو وہ لڑکا بلاتا ہے جس کو ابھی ابھی آپ نے تالاب سے نکالا ہے۔میاں آزاد گئے تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے ٹپ ٹپ ٹپ۔روتے روتے وہ آزاد کے گلے لپٹا اور کہا کہ" میں اس عنایت کا کیا معاوضہ ادا کروں۔اس احسان کا بوجھ کیوں کر میرے سر سے" اترے گا۔

آزاد:اس کا ماتھا چوم کر) احسان۔احسان کیسا؟۔

لڑکا:اب میں آپ کے ہمراہ چلوں گا اور ضرور چلوں گا۔

آزاد:۔بھائی میں سیاح جہاں گرد۔میرے ساتھ تم کہاں جاؤ گے؟۔

لڑکا:اگر ساتھ چھوڑ دوں تو جو جی چاہے وہ کہیے گا نام بدل ڈالوں گا۔

میرزا:۔اچھا اس وقت تو یہ ہمارے مکان میں جاتے ہیں وہاں ہی ان سے آن کر مل لینا۔

لڑکا:پتا۔

میرزا صاحب:بھنڈی بازار۔

لڑکا:نام؟

میرزا صاحب:مرزا اسداللہ بیگ

لڑکا:اچھا پھر جایئے میں حاضر ہوں گا۔

رستم جی جمشید جی

اب سنیے کہ جس لڑکے کو میاں آزاد نے تالاب سے نکالا تھا۔وہ ایک پارسی کا بیٹا تھا۔اس کو اس کے والدین نے بڑی محبت سے پالا تھا۔اس کا باپ بڑا دولت مند اورامیر کبیر آدمی تھا۔اس نے جب اپنے بیٹے کے ڈوبنے کی خبر سنی۔بے اختیار رونے لگا۔اور سر میں خاک ڈالنے لگا۔اتنے میں ایک شخص نے آن کر کہا کہ گھی کے چراغ جلایئے اور غریبوں کو خیرات سے مالا مال فرمایئے صاحب زادے کو ڈوبتے دیکھ کر ایک شریف زادے نے دھم سے غوطہ لگایا۔اور ڈوبنے سے بچایا۔یہ خبر سنتے ہی پارسی کے دل کی کلی کھل گئی۔منہ مانگی مراد مل گئی۔اس نے اسی وقت فٹن تیار کرائی اور تالاب پر پہنچا۔لڑکا باپ سے چمٹ گیا۔اب پارسی کو فکر ہوئی کہ میاں آزاد کو کہیں سے پائیں۔تلاش کرتے کرتے انہوں نے ڈھونڈ ہی نکالا۔لوگوں نے پتا بتایا کہ میرزا اسد بیگ کے گھر پر آزاد ٹھہرے ہوئے ہیں۔اس نے فوراً اپنے خادموں کو اس پتے پر بھیجا۔

آزاد بیٹھے ہی تھے کہ دیکھتے ہی دو آدمیوں نے جھک کر سلام کیا اور کہا کہ رستم جی جمشید جی جی۔سی۔ایس۔آئی نے آپ کو بلایا ہے کہ اگر فرصت نہ ہو تو میں خود حاضر ہوں۔آزاد حیران کہ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟۔

آزاد: یہ کون بزرگوار ہیں۔

آدمی: حضور جن کے لڑکے کو آپ نے ڈوبنے سے بچایا تھا۔

آزاد: ہم کل رات آئیں گے اسوقت تھکے ماندے ہیں۔ہرگز نہ جائیں گے۔

دوسرے دن ادھر سورج غروب ہوا۔ ادھر آزاد نے صاف ستھرے کپڑے ڈانٹے اور دو گھوڑا گاڑی پر سوار ہو کر چلے۔ میاں خوجی کوچ بکس پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ادھر یہ گاڑی بھی کھڑ کھڑاتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ ادھر سامنے سے ایک بگھی بڑی تیزی کے ساتھ آتی تھی۔ دونوں لڑ گئیں اور اس زور سے ٹکرائیں کہ میاں خوجی نے کوچ بکس سے زمین پر پچھنی کھائی۔ اب گرے تو اٹھے کان۔ جس طرح گرے تھے۔ اسی طرح پڑے رہے۔ ادھر تماشائیوں کا اردگرد ہجوم۔ غل غپاڑے کی دھوم۔ حضرت لڑھکے تو لڑھکے لیکن اب اپنے نزدیک پھولوں کے بستر پر سوئے تھے۔ اتنے میں میاں آزاد اتر آئے اور خواجہ بدیع صاحب کو زبردستی اٹھا لائے۔ تو آپ نے بنکارنا شروع کیا۔

خوجی:۔ یہاں اتنے بڑے غدار شہر میں کوئی بگھی وگھی چلانا تو جانتا ہی نہیں۔ ہم پہلے ہی سمجھے کہ اب ٹکرائی۔ ماتھا ٹھنکا کہ اب ٹھوکر کھائی اور اب کھائی۔ مگر قربان اپنے استاد کے واللہ اس پھرتی سے کودا ہوں کہ واہ جی واہ۔ میاں آزاد ہوتے تو اس وقت دس بارہ سیر ہلدی تھوپنی پڑتی۔ مگر واہ رے میں۔

راوی: کیا زبان ہے۔ نشے میں حضرت غین تھے وہ تو کہیے کہ خیر گزری۔ ورنہ اگر حضرت پر گھوڑا پیر رکھ دیتا تو چرمر ہی ہو جاتے۔ اور جو کوئی پہیے کے نیچے آجاتے تو حواس بے پوچھے ہی غائب غلہ ہو جاتے۔ مگر بیٹھے بیٹھے بنکارتے ہیں اور غل مچا مچا کر پکارتے ہیں کہ قربان جاؤں اپنے استاد کے دھم سے کود ہی پڑا۔

میاں آزاد:۔ پارسی رئیس کے گھر پہنچے تو علیک سلیک صاحب سلامت ہوئی۔ چو طرفہ سے آزاد کی تعریفیں ہونے لگیں۔ مگر آزاد سر جھکائے خاموش۔

رئیس: (ٹوٹی پھوٹی اردو میں) آپ نے اپنے لڑکے کو ڈوبنے سے بچایا۔

راوی: مطلب یہ کہ آپ نے میرے لڑکے کو بچایا۔ مگر میرے کی بجائے اپنے کہہ گئے۔ اس پر خوجی ہنس پڑے۔ اور بے تکے تو تھے ہی کہتے کیا ہیں؟:

خوجی: واہ ری قسمت مفت میں لڑکا پایا۔ لو بھئی اب تو چین کرو۔

آزاد: رئیس سے بھلا اس وقت مجھ سے دیکھا جاتا کہ ایک بے چارے بے گناہ لڑکے کی جان جائے اور میں بیٹھا دیکھا کروں۔

خوجی: حق ہے واللہ حق ہے۔ ہم ایسے شیروں کے تم ایسے ہی شیر ہوتے ہیں۔ اور یہ دیکھو واللہ جو میں ہوتا تو غڑاپ سے میں بھی کود پڑتا۔ مگر یار اب کے دعا مانگنی پڑی کہ یہ موئی تو ندوالا ابھی کسی دن غوطہ کھائے۔ اور اس کا بھی پاؤں پھسل جائے تو پھر ہماری پانچوں گھی میں اور بوا زعفران کا سر کڑاہی میں اور داروغہ کا دھڑ ادھر ادھر۔ یہ ڈوبیں تو خدا کرے بچائیں ہم ہی۔

راوی: بجا ہے پانی کا نام لیتے ہی تو آپ کا بدن کانپ جاتا ہے۔ عضو عضو تھر تھراتا ہے۔ اور دم خم یہ کہ ڈوبتے کو نکالیں اور کس کو بھینسے کو۔

آزاد: آپ کی زیارت سے بڑی خوشی ہوئی۔

رئیس: اپنے کو بھی بڑا کھوسی (خوشی) کا بات چیت۔ سبحان اللہ۔

خوجی کی حماقت

ذرا خوجی کی صورت دیکھیے واللہ اس وقت تو فوٹو اتارنے کے قابل ہیں۔صبح کا وقت ہے حضرتِ خوجی کھاروے کی ایک لنگی باندھے ہوئے کھٹیا پیپل کے درخت کے سائے میں بچھائے اونگھ رہے ہیں۔مگر گرگڑی بھی ایک ہاتھ سے تھامے ہوئے ہیں۔چاہے پیں نہ مگر ایک چلم پر کوئلے دہکتے ہیں۔

اتفاق دیکھیے کہ اس وقت ایک چیل نے اوپر سے بیٹ کر دی۔خوجی چونکے اور چونکتے ہی آگ ہو گئے۔بہت ہی اچھلے۔کودے۔پھاندے اور اتنا غل مچایا کہ محلّہ بھر سر پر اٹھا لیا۔

خوجی:ہات تیرے گیدی کی ہمیں بھی کوئی وہ سمجھ لیا (درخت کی طرف نظر کر کے اور چیل سے مخاطب ہو کے) اور سنیے آج بہروپیا چیل بن کر آیا ہے۔قرولی تو وہاں تک اثر نہ کرے گی نہ ہوئی پتھر کلا۔اس وقت توڑے دار بندوق ہوتی تو وہ تاک کر نشانہ لگاتا کہ یاد ہی کرتا مردود۔

آزاد:یہ کس پر گرم ہو رہے ہیں خواجہ صاحب؟۔

خوجی:اور اوپر سے پوچھتے ہو کس پر گرم ہو رہے ہیں۔گرم کس پر ہوں گے۔اسی بہروپیے پر۔وہی جو بیوی بن کر ہم کو جھپ سے لے بھاگے تھے۔وہی جو سپاہی بن کر بزاز کی دکان پر ہم کو بٹھا آئے تھے۔

مرزا:پھر اب کچھ تدارک تو کیجیے۔

خوجی:تدارک کیا خاک کروں میں زمین پر وہ آسمان پر کہتا تو ہوں توڑے دار

بندوق منگوا دیجیے۔تو پھر دیکھیے کیسا نشانہ لگاتا ہوں تاک کر۔جائے گی تو بدیع بے چارے کے ماتھے پر۔

میرزا: ہم بتائیں ۔زینہ منگوائیں اور آپ پیڑ پر چڑھ جائیں۔آخر گیدی بھاگ کر جائے گا کہاں؟

خوجی: اچھل کر لانا ہاتھ۔

آزاد: خوب سوجھی۔

میرزا صاحب نے آدمی سے کہا کہ بڑا زینہ اندر سے لے آؤ مگر جلدی لانا ۔ایسا نہ ہو کہ بیٹھ رہو۔

خوجی: ۔ہاں میاں اسی سال آنا۔میرا یارا یسا نہ ہو کہ گیدی بھاگ نکلے۔

آدمی: (دروازے کے پاس سے)زیبن۔زیب۔زیبن!

زیبن: کچھ کہو گے بھی یا زیبن ہی زیبن رٹے جاؤ گے۔پہاڑی مینا کی طرح سے۔

آدمی: لو کوئی پکارے تو بولنا قسم ہے۔مگر تنکنا کوئی اس سے سیکھے۔پردہ کرادو۔میاں ذرا سیڑھی مانگتے ہیں۔

بیگم: سیڑھی کیا ہوگی؟۔

آدمی: وہی سڑان ہے۔خفقان ہیں۔وہی میاں خوجی۔ان پر کہیں چیل نے بیٹ کردی بس جھک باندھنا شروع کی کہ بہروپیے کا کام ہے۔سواب سیڑھی لگا کر پیڑ پر چڑھیں گے۔ذری پردہ کردیجیے۔

بیگم ہنسوڑ عورت خوب ہی کھل کھلائیں۔اور فوراً مہتابی پر داخل۔اب بیگم صاحبہ کھلی جاتی ہیں اور زیبن کو للکار رہی ہیں کہ اس سے کہو جلدی سیڑھی لے جائے۔

اتنے میں زینہ لے کر خدمتگار جا پہنچا۔میاں خوجی نے کمر کسی۔افیم کی ڈبیا چھپر کھٹ پر رکھی۔مگر پھر سوچے کہ یہ لوگ دل باز کہیں دل لگی دل لگی میں ڈبیا اڑا دیں۔تو اپنا کام ہی تمام ہو جائے گا۔پھر جیب میں رکھ لی اور کانپتے ہوئے زینے پر چڑھنے لگے۔قدم ڈگمگا رہے ہیں۔جب آخری زینے پر پہنچ کر درخت کی ٹہنی پر بیٹھے تو چیل کی طرف رخ کر کے کہا:

گانس۔گانس لیا پھانس لیا۔ہت تیرے گیدی کی لے میں بھی آن پہنچا۔اب جاتا کہاں ہے۔لے بچہ آج ہی تو پھنسے ہو روز جھانسے دے دے کر اڑنچھو ہو جایا کرتے تھے۔ہونہہ کیا ہم کو زم چارہ سمجھے تھے۔اب سوچو تو جاؤ گے کدھر سے؟۔

لے آیئے بس اب میں نے اپنی قرولی تیز کر رکھی ہے۔اتنے میں پیچھے پھر کے جو دیکھتے ہیں تو زینہ غائب۔یا جل جلالہ۔لگے سر پیٹنے۔ادھر چیل پھر سے اڑ گئی ارے ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔بیگم صاحبہ نے جو یہ کیفیت دیکھی تو کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

خوجی: یہ مرزا صاحب کہاں گئے۔ذری چار آنکھیں تو کیجیے ہم سے۔آخر ہم کو آسمان پر چڑھا کر غائب غلہ کہاں ہو گئے۔تدبیر بتاتے ہی نہیں۔بڑے وہ بن کر آئے تھے۔وہاں سے۔ارے یارو کوئی سانس ڈکار ہی نہیں لیتا۔(غل مچا کر) ارے میاں آزاد۔میرزا صاحب۔اے زہن ارے کوئی ہے یا سب مر گئے۔خدا سمجھے ان ملعونوں سے۔

اب آخر ہم کب تک یہاں ٹنگے رہیں۔ارے یارو کچھ خدا کا خوف بھی ہے۔واہ

بہروپیے کے دھوکے ۔دھوکے میں اچھا ہم کو الو بنایا کہ چیل کو بہروپیا کر کے دکھایا۔آخر یہ سب کے سب بہرے ہو گئے ہیں ۔ارے میاں آزاد۔اجی میرزا جی ۔اری زیبن ۔کوئی بولتا ہی نہیں ۔

بیگم (مہتابی سے قہقہہ لگا کر)اللہ کرے افیم کا نشہ آجائے ۔

خوجی :چونک کر یہ کون بولا (بیگم کو دیکھ کر)واہ حضور آپ کو تو ایسی بد دعا نہ دینی چاہیے۔

ادھر میاں آزاد سوچے کہ خوجی افیمی آدمی ایسا نہ ہو کہ پاؤں ڈگمگا جائیں ۔تو مفت کا خون ہماری گردن پر ہو۔بس اب دل لگی ہو چکی اور وہ سمجھ بھی گئے کہ یاروں کا فقرہ ہی فقرہ تھا۔ہم کو پیڑ پر بھیجا۔چیل کو بہروپیا بنا دیا۔اور ہمیں الو۔ادھر ہم کو پیڑ کی سمائی ۔ادھر حضرت نے سیڑھی کھسکائی ۔اب جائیں تو کہاں جہنم میں ۔میرزا صاحب نے آدمی کو حکم دیا کہ زینہ لگاؤ ۔بیگم نے جو سنا تو ہزاروں قسمیں کھائیں ۔اور انتہا کی بے قرار ہوئیں ۔

بیگم جو زینہ لگائے ہمیں کو ہے ہے کرے ۔اللہ کرے آندھی آئے ۔ٹہنی پھٹ پڑے ۔

میرزا ۔دیکھو چپ رہو ۔راہ چلتے سب سنتے ہیں ۔تم مہتابی پر ۔ہم یہاں ۔غل مچانے کا کون سا موقع ہے بھلا ۔

بیگم :اللہ کرے زلزلہ آئے درخت جڑوں سے ہل جائیں ۔

خوجی : جی اور کیا۔یہاں ہڈیاں چور ہو جائیں ۔گرتے ہی اگلے جہاں کی راہ لیں ۔آپ کی ایک ادنیٰ سی ادا ہے ۔

بیگم: اس وقت تو پیپل بھر کا بھتنا معلوم ہوتا ہے۔

خوجی: میاں آزاد! بس یہی باتیں تو بری معلوم ہوتی ہیں۔

آزاد: گھبراؤ نہیں زینہ لینے گیا ہے۔

خوجی: اجی یہاں جان پر بن آئی ہے۔ آپ کو گھبرانا سوجھتا ہے۔ خیر آدمی زینہ لایا اور خوجی درخت پر سے اترے۔

خوجی نے ایک دن کہا! ''ارے یارو کیا اندھی رہے۔ تم ترکی چلتے چلتے کہاں پھرتے ہو؟۔ افسوس ہے کہ تم کو اپنی بات کا ذرا پاس نہیں۔ کسی سے وعدہ کیا ہے تو پھر اسے پورا کرنا چاہیئے یا نہیں۔ اب آخر ترکی کب جاؤ گے قیامت کے دن۔ اجی بس اب بقچہ سنبھالو اور چلو سیدھے۔ اب چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے ہم ایک نہ مانیں گے۔ چلیے اٹھیے کوچ بولیے۔

آزاد: میرزا صاحب! اتنے دنوں میں خوجی نے یہی ایک بات پکی کہی۔ اب جہاز کا جلد انتظام کیجیے۔

مرزا: اجی حضرت تیاری کیجیے۔ بس اب چلیے۔

خوجی: قبلہ پہلے یہ بتایئے کہ کتنے دن کا سفر ہے؟۔

آزاد: اس سے کیا واسطہ؟۔

خوجی: اور سنیئے اس سے کچھ واسطہ ہی نہیں۔

آزاد: بھئی ہم کبھی جہاز پر سوار ہوئے ہوں تو بتائیں۔

خوجی: جہاز۔ ہائے غضب کیا پانی کے راستے جانا ہوگا۔

آزاد: اجی اورنہیں تو کیا خشکی کے راستے۔ آپ ابھی تک اس بھروسے تھے۔ بہت جلد چونکے۔

خوجی: بھیا میری تو روح لرزنے لگی ہے۔ میں نہیں جانے کا۔

آزاد: چلو وہاں ترکی عورت سے تمہارا بیاہ کرا دیں گے۔

خوجی: خشکی خشکی ہو تو بھائی میں چلوں۔ سمندر میں جاتے پاؤں ڈگمگاتا ہے۔

مرزا: آپ بھی واللہ چونچ ہی رہے۔ عجب آدمی ہو بھئی۔ خشکی کی راہ سے کتنے دن میں پہنچو گے۔ بھلا کچھ ٹھکانہ ہے۔ کجا بمبئی کجا قسطنطنیہ۔ آپ بھی طرفہ معجون ہیں۔ پرسوں جہاز میں سوار ہوں دن سے ترکی میں داخل۔ خشکی کی بھی ایک ہی کہی۔

خوجی: اب آپ سے بحث کون کرے۔ آپ تو ہاری مانتے ہیں نہ جیتی۔ جہاز کا کیا اعتبار۔ اور جو ڈوب گیا۔ ذرا کسی سوراخ سے پانی آیا اور پہنچے جہنم میں سیدھے۔ ذرا ہوا تیز چلی اور مغرب کی بجائے مشرق پہنچے۔

آزاد: تو نہیں چلو گے نا۔ صاف صاف بتا دو ابھی سویرا ہے۔

خوجی: چلیں تو بیچ کھیت اور ڈنکے کی چوٹ۔ مگر پانی کا نام سنا اور روح فنا ہو گئی۔ بھلا یہ تو بتایئے کہ سمندر کا پاٹ گنگا کے پاٹ سے دوگنا ہوتا ہے۔ یا کچھ کم و بیش۔ آزاد: اجی بس اور کیا۔ چلیے آپ کو سمندر دکھا ہی لائیں۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔

خوجی: بس کیوں صاحب شہید مردوں سے بھی دل لگی۔ ہم کو لے چلیے۔ اور جھپ سے چپر غٹو کر کے جہاز پر بٹھا دیجیے۔ ایک شرط پر چلتے ہیں۔ بیگم صاحبہ ضمانت

دیں۔ ہمارے سر کی قسمیں کھائیں۔ کہ زبردستی نہ کریں گے۔ خواہ مخواہ ہی جہاز پر جاؤ۔

آزاد:۔ کیا خوب۔ آپ کیا اور آپ کا سر کیا۔ مگر چلیے ہم بیگم صاحبہ سے کہلوائے دیتے ہیں آپ اور آپ کے باپ دونوں کے سر کی قسم کھالیں تو سہی۔

مرزا:۔ اچھا چلیے وہ ضمانت دے دیں گی۔ آئیے اٹھیے۔

مرزا صاحب اور میاں آزاد دونوں مل کر گئے اور بیگم صاحب سے کہا کہ واسطے خدا کے اس سڑی افیمی خطبی خوجی سے اتنا کہنا کہ تم جہاز دیکھنے جاؤ یہ زبردستی سوار نہیں کریں گے۔ بیگم صاحبہ نے جو یہ کہانی سنی تو خوب کھلکھلائیں اور تنک کر بولیں کہ ہم نہ کہیں گے۔ آپ لوگوں نے ذرا سی بات نہ مانی اور سیڑھی ہٹالی۔ اچھا خیر پردے کے پاس بلاؤ۔

خوجی: پردے کے پاس سے (آداب بجالاتا ہوں حضور)

اب جواب کون دے بیگم صاحب تو مارے ہنسی کے لوٹی جاتی ہیں۔ اور میاں آزاد کے خیال سے اپنی بے تکلفی اور چلبلاہٹ پر کسی قدر شرماتی ہیں۔ اتنے میں خوجی نے پھر ہانک لگائی کہ "آداب بجالاتا ہوں حضور" غلام کو کیوں یاد فرمایا؟۔

مرزا: وہ کہتی ہیں کہ ہم ضمانت دیتے ہیں۔

خوجی: آپ رہنے دیجیے۔ انہی کو کہنے دیجیے۔

بیگم: خواجہ صاحب بندگی! آپ کیا پوچھتے ہیں؟۔

خوجی: اے حضور مجھ کو جہاز دکھانے لے جاتے ہیں۔ جاؤں یا نہ جاؤں جو حکم ہو بجالاؤں۔

بیگم:۔کبھی بھولے سے بھی نہ جانا۔ورنہ پھر کے نہ آؤ گے۔اور جو کہیں وہ بھروپیا مل گیا تو بن گئی بات۔

خوجی: آپ ان کی ضمانت دیتی ہیں۔

بیگم: میں کسی کی ضمانت ومانت نہیں دوں گی۔یہ ڈبو ہی دیں گے۔قرولی رکھی ہی رہے گی۔

خوجی: چلیے بس اب حد ہوگئی۔اب ہم ہرگز نہ جائیں گے۔

آزاد: بھائی تم ذرا ساتھ چل کر سیر تو دیکھ آؤ۔

خوجی: واہ اچھی سیر ہے۔کسی کی جان جائے۔آپ کی سیر ہے۔اس جانے والے پر تین حرف۔

خیر تھو تھمو کر کے مرزا صاحب اور میاں آزاد خوجی کو لے چلے۔ چلتے چلتے جب سمندر کنارے پہنچے تو خوجی نے نظر بھر کر سمندر کو دیکھا۔دیکھتے ہی دو چار قدم پیچھے ہٹے اور چیخ پڑے۔پھر دس پانچ قدم پیچھے کھسکے اور رونے لگے۔

خوجی: اف خداوندا بچائیو۔یا خدا بچا۔یہ **ملک الموت** ہے یا سمندر۔لہریں دیکھتے ہی کلیجے کو کسی نے مسوس دیا۔

مرزا: کیا لطف ہے۔خدا کی قسم جی چاہتا ہے کہ پھاند ہی پڑوں او ہو۔ہو۔ہو۔

خوجی: مرزا کا ہاتھ پکڑ کر۔کبھی بھولے سے پھاندے واندنے کا قصہ بھی نہ کرنا۔ حیادار کے لئے ایک ہی چلو کافی ہوتا ہے۔

آزاد: عجب مسخرہ ہے بھئی۔ایک آنکھ سے روتا ہے۔ایک آنکھ سے ہنستا ہے۔

خوجی: آپ تو کہتے تھے کہ گنگا کے پاٹ کے برابر ہے۔معاذ اللہ کچھ ٹھکانہ

ہے۔اور چھوڑ ہی نہیں۔چلتے چلتے پاؤں کے پرخچے اڑ گئے۔وہاں کہتے تھے کہ بس تھوڑا ہی سا فاصلہ ہے۔ان فقرہ بازوں سے خدا سمجھے۔اور اس پر اتنی دور سواری پر آئے۔ورنہ کیا جانے کیا ہوتا۔

اتنے میں دو چار ملاح سامنے سے آئے خوجی نے جو ان کو غور سے دیکھا تو ہنسے۔مرزا صاحب سے پوچھا کہ یہ کون ہیں بھئی۔انہوں نے کہا یہ ملاح ہیں۔دن رات سمندر ہی میں رہتے ہیں۔جب دیکھیے جہاز پر۔

خوجی: بھلا یہ ہماری بولی سمجھ لے گا؟ اردو جانتا ہے کہ نہیں۔

مرزا صاحب ہاں ہاں جانتا کیوں نہیں ہے۔ ہزاروں ہندوستانیوں کو لے گیا ہے۔اردو خوب جانتا ہے۔

خوجی: ایک بوڑھے ملاح سے کیوں میاں ماجھی تمہارے باپ کہاں مرے تھے؟۔

مانجھی: ساگر (سمندر پر) جہاز پر

خوجی: ہوں اور دادا۔

مانجھی: وہ بھی جہاز پر۔

خوجی: ہوں اور پچا و چا

مانجھی: وہ بھی سمندر میں۔

خوجی: افسو بھلا تم کہاں مرو گے۔

مانجھی:۔اب یہ کون جانے۔کسی کو اپنے مرنے کا حال کیا معلوم۔مگر مریں گے اسی سمندر میں ہم بھی۔

خوجی: پھر بھلا تمہارے کنبے کے اتنے مرے اور تم خود بھی وہیں مرنے والے ہو۔ تو اس سے پرہیز کیوں نہیں کرتے کوئی اور پیشہ اختیار کرو۔

مانجھی: آپ کے باپ کہاں مرے تھے میاں؟۔

خوجی: ہمارے شہر میں اور کہاں مرتے بھلا؟

مانجھی: اور تمہارا دادا کہاں مرا تھا؟

خوجی: وہ بھی شہر میں مرے اور قبرستان میں ان کی بھی لاش ہے۔

مانجھی: اور چچا وچا کہاں مرے؟۔

خوجی: سب وہیں مرے کئی قبریں اب تک موجود ہیں۔

مانجھی: گردن ہلا کر پھر آپ اس شہر کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ جہاں آپ کے باپ اور دادا اور سب عزیز مرے۔

خوجی: واہ واہ شہر کے چھوڑنے سے کیا موت سے بچ جائیں گے؟۔ ہم چاہے جہاں رہیں مریں گے ضرور۔ مرنا برحق ہے۔

چاہے یہاں سے لندن جائیں۔ چاہے روم وشام۔ جدھر جائیں بھلا ملک الموت سے کوئی بچ سکتا ہے۔

مانجھی: تو پھر میں اپنا پیشہ کیوں چھوڑنے لگا۔ بھلا جب موت سے بچ ہی نہیں سکتا کوئی تو پھر میں اپنا پیشہ کیوں چھوڑوں۔

خوجی: آپ منطق بھی پڑھے ہیں معلوم ہوتا ہے۔ اچھی دلیل پیش کی۔

مانجھی: کیا میں سمجھا نہیں۔

خوجی: اجی تم خوب سمجھتے ہو مگر شکل وصورت سے تو ہم سمجھے تھے کہ جانگلو ہو لیکن تم تو

اردو خوب بولتے ہو۔

مانجھی: میں جبل پور کا رہنے والا ہوں۔ باپ دادا سب نے یہی پیشہ اختیار کیا۔

آزاد: کہیئے خوجی صاحب جھینپے تو نہ ہوں گے آپ سچ کہنا کیا جواب دیا واہ رے

مانجھی ۔کہیے اب تو تسلی ہوئی۔ اب تو چلیے گا نا جہاز پر۔

خوجی: ہاں ضرور سو کام چھوڑ کر نہ چلنا کیسا۔ مانجھی سے) کیوں بھئی ہم کو پاؤں

پاؤں تو نہ چلنا ہوگا کسی مقام پر۔

مانجھی: ہوں کیا دھرتی زمین پر چلنا ہے۔

خوجی: بھلا افیم کھانے کی تو جہاز پر ممانعت نہیں ہے۔

مانجھی: نہیں بہت سے آدمی افیم گھول کر پیا کرتے ہیں۔ جس کا جو جی چاہے کھائے

۔

خوجی: اے میں تیری زبان کے قربان ۔واہ میری جان بس چنیا بیگم پاس ہوں تو

مزے ہیں ۔بھلا کیوں میاں جہاز پر کوئی جگہ ایسی بھی ہے جہاں سے سمندر نظر ہی

نہ آئے اور ہم آرام سے بیٹھے رہیں ۔سچ بتانا استاد ہم پانی سے بہت ڈرتے ہیں

بھائی۔

مانجھی: ہم آپ کو ایسی جگہ بٹھا دیں گے بھائی جہاں پانی آسمان کچھ سوجھ ہی نہ

پڑے۔

خوجی: صدقے قربان ۔بڑے دوست ہو ایک بات اور بتاؤ گنے ملتے جائیں گے

راہ میں یا ان کا کال ہے۔

مانجھی: گنے وہاں کہاں ۔کیا کچھ منڈی ہے؟ اپنے ساتھ چاہے جتنے لے چلیے ۔

خوجی: ہاں گنڈیریاں تازی تازی کھانے میں نہ آئیں گی بھلا حلوائی کی دکان تو ہوتی ہو گی۔آخر یہ اتنے شوقین افیمی جو جاتے ہیں تو کھاتے کیا ہیں سنکھیا؟ کھاجا۔برفی۔لڈو۔پیڑے یہ سب ملتا ہے کہ نہیں؟۔

مانجھی: اجی جو چاہے ساتھ رکھ لو۔

خوجی: اور جو منہ ہاتھ دھونے کو پانی کی ضرورت ہو تو کہاں سے آئے؟۔

آزاد: پاگل ہے۔کون مسخرہ اتنا نہیں سمجھتا کہ سمندر میں جاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ پانی کہاں سے آئے گا۔سب پانی پئیں گے اور تم پیاسے مرو گے۔میدان کربلا ہے احمق۔

خوجی: تو آپ کیوں الجھ پڑے۔آپ سے پوچھتا کون گیدی ہے۔ملاح سے کیوں جی بھلا ہم گنے یہاں سے باندھ لے چلیں اور گنڈیریاں بنائیں اور جہاز پر چوسیں مگر چھلکے کہاں پھینکیں گے۔آخر ہم صبح شام دو چار گنے کھایا چاہا تو پھینکیں کہاں؟۔

آزاد: یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ہم بتا دیں گے آپ کو آپ بدحواس نہ ہوں۔

خوجی: اس کی ممانعت تو نہیں ہے کہ کوئی نشے میں نہ ہو!

مانجھی: ہنس کر نہیں۔

خوجی: اور جو قرولی باندھے ہو تو ہرج تو نہیں یا مثلاً قرابین ہو؟۔

مانجھی: چاہے جو ہو۔توپ نہ ہو۔تارپیڈو نہ ہو۔تلوار ہو کٹار ہو چاہے جو کچھ ہو مگر لائسنس ضرور ہونا چاہیے۔

خوجی: ہوں دیکھیے ایک بات معلوم ہوئی نا! اچھا یہ سب تو ہوا۔اب دو دو باتیں اور

ہو جائیں۔ایک تو یہ بات پوچھنی ہے کہ بہروپیے تو جہاز پر چڑھنے نہیں پاتے۔

مانجھی: چاہے جو سوار ہو۔کرایہ دے سوار ہو لے۔

خوجی: کمہار تو سوار نہیں ہوتے جہاز پر؟۔

مانجھی: آج تلک کوئی کمہار گیا نہیں۔یاد نہیں پڑتا۔

خوجی: اے میں تیری زبان کے قربان۔بڑی ڈھارس ہوئی۔خیر کمہار سے تو بچے۔باقی رہا بہروپیا۔اس گیدی کو سمجھ لوں گا۔اتنی قرولیاں بھوکوں گا کہ یاد ہی کرے گا۔

مانجھی: اتنی باتیں تو کسی نے نہ پوچھی ہوں گی۔اب کچھ اور بھی پوچھو گے؟۔

خوجی: ہاں بس ایک بات اور یہ تو قید نہیں کہ صبح شام ہر شخص ضرور ہی نہائے۔اگر یہ قید ہوئی تو جانے والے پر تین حرف۔ہم کوئی جیل خانے میں تو ہوں گے نہیں۔

مانجھی: آپ چاہے عمر بھر نہ نہائیں۔

خوجی: اے میں تیری زبان کے قربان۔

مانجھی: افیم بہت کھاتے ہو معلوم دیتا ہے۔

خوجی: مسکرا کر ہاں خوب پہچان گئے۔آپ قیافہ شناس بھی ہیں خیر سے تم۔کیوں کر بوجھ گئے بھائی۔شوق ہو تو گھولوں۔

مانجھی: دھت۔بس الگ رہو ہم افیم کو چھوتے تک نہیں۔

خوجی: بگڑ کر او گیدی۔ٹکے کا آدمی تم اور جھک مارتا ہے نکالوں قرولی؟۔

آزاد: ہاں ہاں خواجہ صاحب دیکھیے دیکھیے جانے نہ پائے ذری قرولی میان ہی میں رہے۔

مرزا:۔ جناب خواجہ بدیع صاحب! آپ اپنی طرف دیکھیے درگزر کیجیے۔ بدتمیز ہے۔

خوجی: آپ لوگوں کی خاطر ہے۔ ورنہ ادھیڑ کر رکھ دیتا پاجی کو۔ اکڑ کر مجھے بھی کوئی اور سمجھا تھا؟۔ یہاں سیف اللہ کے اکھاڑے میں کشتی لڑا کیے ہیں۔ دل لگی ہے کہنے لگا دھت۔ اس وقت آپ بیچ میں نہ پڑتے تو بھرکس ہی نکال دیا ہوتا۔

مرزا: ذری غور سے دیکھیے۔ کہیں بہروپیا تو نہیں ہے۔ ہم تو جانتے ہیں وہی گیدی ہے۔

شام کے وقت مرزا صاحب کی بیگم نے آ کر کہا ''آج اس وقت کچھ چہل پہل نہیں ہے۔ قہقہے نہیں۔ کیا خوجی اس دنیا سے سدھارا؟۔ مرزا صاحب نے خوجی سے کہا کہ ''حضرت کوئی ذکر چھیڑ یے دیکھیے بیگم صاحبہ تقاضا کر رہی ہیں۔''

خوجی: واللہ وہ پھڑکتا ہوں لطیفہ سناؤں کہ لوٹ جایئے گا۔ خوشی سے پھولے نہ سمایئے گا۔

بیگم: اچھا پھر سنایئے۔ یہ زبانی داخلہ بہت سنا ہے۔

خوجی: لیکن ایک شرط ہے۔ اس کے بعد افیم پلوانی پڑے گی۔

بیگم: ہاں ہاں سناؤ تو۔ مرو گے تو پوست ہی کے کھیت میں دفنائے جاؤ گے۔ کافور کی جگہ افیم ہی ہوگی۔

خوجی: ایک خوش نویس تھے۔ حرف ان کے قلم سے ایسے نکلتے تھے جیسے سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ لیکن ایک سخت عیب ان میں یہ تھا کہ غلط ہرگز نہ لکھتے تھے۔۔۔۔

آزاد: یا رتم جیسا جانگلو دیکھا نہ سنا۔

خوجی: خدا ان لوگوں سے بچائے بھئی میرا تو ناک میں دم آ گیا ہے۔ بات پوری سنی ہی نہیں اور اعتراض جمانے کو موجود۔ خم ٹھونک کر لڑنے کو تیار۔ بات کاٹنے کو ادھار کھائے ہوئے۔ خوجی مردود کا مطلب یہ ہے کہ وہ غلط تو ہرگز نہ لکھتا تھا۔ مگر یہ عیب تھا کہ اپنی طرف سے لفظ ملا دیتے تھے۔ ایک شخص کو قرآن شریف لکھوانے کی ضرورت ہوئی۔ سوچے کہ ان سے بڑھ کر کوئی خوش نویس نہیں۔ اگر دس پانچ روپے زیادہ بھی دینے پڑیں تو بلا سے مگر لکھوائیں گے انہیں سے۔ روپے کی ایسی تیسی۔

بیگم: ارے واہ ری عقل۔ کوئی آپ ہی جیسے جانگلو ہوں گے۔ گلی گلی چھاپہ خانے ہیں۔ کوئی چھپا ہوا قرآن کیوں نہ لے لیا۔

خوجی: حضور وہ سیدھے سادے مسلمان تھے منطق نہیں پڑھے تھے۔ خیر صاحب خوش نویس کے پاس پہنچے کہا کہ حضرت جو اجرت فرمایئے گا دوں گا۔ مگر ہاتھ جوڑ کر ایک عرض ہے۔ کہیے کہوں یا نہ کہوں۔

انہوں نے کہا کہ ضرور فرمایئے۔ خدا اور خدا کا رسول آگاہ ہے کہ ایسا لکھوں گا کہ جو دیکھے پھڑک جائے وہ نسخا ہو کہ کیمیا گر بھی وجد کرنے لگے۔

ہاں حضرت یہ تو ٹھیک ہے مگر خدا کے لئے اپنی طرف سے کچھ نہ بڑھا دیجیے گا۔ اور چاہے خدائی بھر کے کام کو اصلاح دیجیے لیکن اللہ میاں کی شان میں یہ گستاخی ناجائز ہے۔

خوش نویس صاحب نے کہا کہ کیا مجال۔ یہ کلام مجید ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ اس کا ایک نقطہ بھی بدلنے پائے۔ توبہ توبہ آپ مطمئن رہیے ایسا نہ ہونے پائے گا۔

خیر حضرت وہ تو گھر گئے۔ ادھر میاں خوش نویس صاحب لکھنے بیٹھے۔ جب کتاب ختم کر چکے تو کتاب پاک لے کر چلے۔ کوئی ایک مہینہ میں قرآن لکھ ڈالا۔ لیجیے حضور۔ قرآن موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ میری محنت پر نظر ڈالیے۔ اور غور کیجیے کہ کیسا کام ہے" انھوں نے سر جھکایا اور تھوڑی دیر میں غور کر کے کہا۔ بس ایک بات صاف فرما دیجیے۔ کہیں کچھ اپنی طرف سے تو نہیں ملا دیا۔

خوش نویس نے کہا" نہ۔ لاحول ولا قوۃ۔ بدلتے یا بڑھاتے ہوئے ہاتھ کانپتے تھے۔ مگر اس میں شیطان اور ابلیس کا نام بھی تھا۔ سوچا کہ اس مقدس کتاب میں شیطان کا لفظ آنا اچھی بات نہیں۔ لہذا کہیں آپ کے باپ کا نام لکھ دیا۔ کہیں اپنے باپ کا۔

بیگم: بس یہی لطیفہ تھا۔ یہ تو بہت پرانا ہے۔

خوجی: جی حضور اس دھاندلی کی سند نہیں۔ اب افیم پلانے کا وقت آیا تو دھاندلی کرنے لگیں۔

اتنے میں مرزا صاحب نے خوجی ک وافیم کی بجائے خالی پانی پلا دیا اور اس میں ذرا سا کتھا بھی ملا دیا۔ شام کا وقت۔ خوجی کو دن کو اونٹ کی گردن تو سوجھتی نہ تھی۔ بھلا اندھیرے میں افیم اور کتھے کے رنگ میں کیا تمیز کرتے۔ آپ نے پیالے کا پیالہ چڑھا دیا مگر واہ ری افیم اور واہ رے تیرے خیال۔ پیتے ہی حضرت غین ہو گئے۔ دین و دنیا دونوں سے بے فکر۔ خبر ہی نہیں۔ جب رات بھیگی تو میاں آزاد نے اپنے بستر پر آرام فرمایا۔ اور مرزا صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے تو خوجی کلبلا کر اٹھ بیٹھے۔

خوجی: ایں۔ چوطرفہ ہو کا عالم۔ آدمی کیا جانور تک نظر نہیں آتے۔ اور نشہ ہرن۔ بھئی کچھ افیم تھی کہ گویا پی ہی نہیں۔ مگر پہلے تو بڑا زور کیا تھا۔ میں غین ہی ہو گیا تھا۔

اب ذرا خواجہ بدیع صاحب کی وحشت ملاحظہ فرمائیے۔ چنیا بیگم نے انگلیوں پر نچایا۔ جمائیوں کی ڈاک بیٹھ گئی۔ آنکھوں سے پانی جاری ہونے لگا۔ بدن سنسنا رہا ہے۔ کلیجہ بلیوں اچھل رہا ہے۔ خون خشک چہرے پر مردنی چھائی جیب سے ڈبیا نکالی کہ شاید کھرچن ورچن پڑی پڑائی ہو تو اس دم جی اٹھیں دیکھا تو صفاچٹ۔ بس سن سے جان نکل گئی۔ آدھی رات کا وقت۔ انسان کیا ہر چیز اس وقت آرام کر رہی تھی۔ اب افیم آئے کہاں سے۔ سوچے کہ بھئی چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے۔ جائیں گے اور افیم کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ ہی لائیں گے۔ دن سے چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں ایک کانسٹیبل سے ملاقات ہوئی۔

کانسٹیبل: کون

خوجی: ہم ہیں خواجہ بدیع سرکاری ملازم۔

کانسٹیبل: کہاں کام کرتے ہو؟ کس دفتر میں؟

خوجی: پولیس کے دفتر میں مانک جی بھائی جی کی جگہ پر آج سے کام کرتے ہیں۔ یار اس وقت کہیں سے ذرا سی افیم لاؤ تو بڑا احسان ہو۔ آخر استاد پالا ہمیں سے پڑے گا۔ تمہارے ہی دفتر میں ہیں۔ سیاہ و سفید کا ہمیں کو اختیار ہے۔

کانسٹیبل: ہاں ہاں۔ اسی دم۔ اور میں تو خود افیم کھاتا ہوں۔ افیم تو لو یہ ہے۔ مگر اس وقت گھولو گے کس میں۔

خوجی: واہ کانسٹیبل ہوکر ایسی باتیں کرتے ہو؟

گھر کی حکومت ۔سرکاری پیادے کو سب مانتے ہیں ۔

کانسٹیبل: اچھا چلو پلا دیں ۔

خوجی: خوش ہو کر ۔واہ رے صوبے دار صاحب بڑے برے وقت میں کام آئے ۔ہم آپ جانیے افیمی آدمی ۔شام کو افیم کھانا بھول گئے ۔آدھی رات کو یاد آیا ۔ڈبیا کھولی تو سناٹا ۔لے کہیں سے پیالی اور پانی تو دلواؤ ۔ورنہ اپنی خیر نہیں ۔اب کوئی دم کا مہمان ہوں ۔

غرض کانسٹیبل نے حضرت خواجہ صاحب کو خوب افیم پلوائی ۔اور خواجہ صاحب نے بھی خوب چسکی لگائی اب گھر کو چلے تو راستہ بھول گئے ۔جاتے کہیں ہیں اور پاؤں کہیں پڑتا ہے ۔ایک بھلے مانس کے دروازے پر پہنچے تو نشے میں سوجھی کہ یہی مرزا صاحب کا مکان ہے ۔واہ رے نشے ۔وحشت کو خدا سلامت رکھے ۔لگے دروازے کی زنجیر کھڑکھڑانے اور غل مچانے ۔کھولو ۔کھولو ۔دروازہ کھولو ۔کھولو بھئی ۔اف اب تو پاؤں ڈگمگاتے ہیں ۔کھڑا نہیں ہوا جاتا ۔کھولو دروازہ کھول دو نا ۔

اب سنیئے کہ میاں خواجہ بدیع صاحب باہر کھڑے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے ہیں ۔اور دروازہ دھم دھماتے ہیں ۔اندر مکان میں ایک میاں رہتے ہیں ۔خوجی کے بھی چچا ۔دبلے پتلے ہاتھ پاؤں ۔قد خدا نظر بد سے بچائے تین کم سوا دو انچ ۔سوائے ہڈی اور پوست کے گوشت اور چربی کا نام بھی نہیں ۔اور ان کی بیوی خاصی دیونی ۔ہٹی کٹی ۔بڑے ڈیل ڈول کی عورت ۔لمبے چوڑے ہاتھ پاؤں ۔ایک گھونسا تان

کر لگائے تو پھر کس نکال کر رکھ دے۔ دونوں میاں بیوی گھر میں میٹھی نیند سو رہے تھے کہ خوجی نے دھم دھمانا شروع کیا۔

میاں: چونک کر ایں خداوندا بچائیو۔ یہ اس اندھیری رات میں کون آیا۔ بھئی اف مارے ڈر کے روح کانپتی ہے۔ کیسا گھپ اندھیرا ہے۔ اب بیوی کو جگاؤں اور مردانہ کپڑے پہنا کر ساتھ لے جاؤں۔

خوجی: کھولو میٹھی نیند سونے والو کھولو۔ یہاں جاتے دیر نہیں ہوئی اور کواڑ جھپ سے بند کر لیے۔ کھٹیا و ٹیا سب غائب کر دی۔

میاں: سرہانے جا کر بیگم او بیگم کیا سو گئیں۔

وہاں سنتا کون ہے۔ جوانی کی نیند دل لگی ہے کیا؟ کوئی چارپائی الٹ دے تو کانوں کان خبر نہ ہو سر پر چکی چلے تو آنکھ نہ کھلے۔ میاں کی روح فنا۔ آنکھوں کو مارے ڈر کے ایک ہاتھ سے بند کیے ہوئے بیوی کے سرہانے کھڑے ہیں۔ مگر تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ ایک بار جان پر کھیل کر کچ کچا کر خوب سے شانہ ہلایا۔ او بیگم سنتی ہو کہ نہیں۔

بیگم ہاتھ جھٹک کر اے واہ شانہ اکھاڑ ڈالا۔ اللہ کرے یہ ہاتھ ٹوٹیں۔ ہماری میٹھی میٹھی نیند مارے ہچکولوں کے تلخ کر دی۔ اب کی جگایا تو تم جانو گے۔ بے غیرت چل دور ہو۔

میاں: لاحول ولا قوۃ۔ کیا پھر سو گئیں۔ جیسے نیند کے ہاتھ کوئی بک جاتا ہے۔ بیگم۔ او بیگم اٹھتی ہو کہ نہیں۔

بیگم: اے اوئی کیا ہے۔ کچھ منہ سے بھی بولو گے یا بیگم بیگم اچھی رٹ لگائی ہے۔ ڈر

لگتا ہو تو منہ لپیٹ کے سو رہو۔ایک تو آپ نہ سوئیں۔دوسرے ہماری نیند بھی حرام کریں۔

خوجی: کھڑ کھڑ کھڑ) مر گیا پکارتے۔

میاں: بھئی یہ کون ہمارا دشمن آیا ہے۔خدا ہی خیر کرے۔بیگم او بیگم۔خدا کرے بہری ہو جائے ان کی نیند سے ہماری جان عذاب میں ہے۔دیکھو تو یہ کواڑ کون توڑے ڈالتا ہے۔ بندہ تو اس اندھیرے میں جانے والا نہیں۔ذری تم ہی دروازے تک جا کر دیکھ لو۔

بیگم: جی میری جوتی اٹھتی ہے۔تمہاری تو وہی مثل ہے۔روٹی کھائے دس بارہ۔دودھ پیے مٹکا سارا کام کرنے کو ننھا بے چارہ۔پہلے تو میں عورت ذات جو ڈر گئی تو کیسی ہو۔جانے کون موا آیا ہے۔چور چکار سے بیوی کو بھڑواتے ہو۔

اے خدا کی لعنت۔مرد بنے پھرتے ہو۔بیوی سے کہتے ہو کہ باہر جا کر چور سے لڑے۔

خوجی: اجی بیگم صاحب۔خدا کی قسم افیم لانے گیا تھا۔ذرا دروازہ کھلوا دیجیے یہ آزاد صاحب اور مرزا صاحب تو میری جان کے دشمن ہیں۔

بیگم نے جو افیم کا نام سنا۔آگ بھبوکا ہو گئیں۔اٹھ کر میاں کو ایک لات لگائی۔تو اس نے لڑھکنی کھائیں بیوی نے اوپر سے کوسنا شروع کیا۔اس افیم کو آگ لگے۔پینے والوں کا ستیاناس ہو جائے۔ایک تو میرے ماں باپ نے اس نکھٹو کے پلے باندھا۔دوسرے اس کے ماں باپ نے افیم اس کی گھٹی میں ڈال دی۔چلو بس ہو چکی زندگی۔اور تم نے جو قسم کھائی تھی کہ آج سے افیم نہ پیوں گا۔نہ

تمہاری قسم کا اعتبار نہ زبان کا۔ قسم بھی کوئی مولی گاجر ہے کہ چبا گئے۔

میاں (گرد جھاڑ پونچھ کر) کیوں جی اور جو میں بھی لات جمانے کے لائق ہوتا تو پھر کیسی ٹھہرتی۔

راوی: جو ہوتے لائق تو پھر دیکھا جاتا۔ بیوی کی جوتیاں کیوں کھاتے۔ اب میاں صاحب دل ہی دل میں اپنے ماں باپ کو صلواتیں سنا رہے ہیں۔ واہ اچھے ماں باپ تھے۔ یہاں پتلے دبلے آدمی۔ بیوی لاکے بٹھا دی دیونی۔ یہاں مردے سے بدتر۔ ہاتھ پاؤں کی ہڈی ہڈی گن لیجیے۔ وہ تو بیاہ کر کے چھٹی پا گئے۔ لاتیں ہمیں کھانا پڑتی ہیں۔ میں تو سمجھا کہ اپنا کام ہی تمام ہو گیا۔ مگر تھا بے حیا کہ پھر ویسا ہی ہوں۔

بیگم: میرا تو قاعدہ یہ ہے کہ پہلے تو باتوں سے سمجھاتی ہوں۔ اور کوئی نہ سمجھے تو لاتوں سے خبر لیتی ہوں۔ میں تو اس فکر میں ہوں کہ تم کو کھلا پلا کے خاصا ہٹا کٹا بناؤں ۔ تاکہ ہمسائی طعنے نہ دے۔ اور تم پیوا فیم تو جی جلے یا نہ جلے۔

میاں: تمہاری جان کی قسم کون مردود افیم کے قریب بھی گیا ہو۔ آج تک صورت بھی دیکھی ہو۔ یوں خواہ مخواہ بدگمانی کا کیا علاج؟۔ ذری چل کے دیکھو تو سہی کون ہمارا دشمن ہے۔ کہ آن کر میاں بیوی کو لڑوا دیا۔ تم کسی کی سنتی تو ہو نہیں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ کس کر ایک لات جما دی بس۔

میاں خواجہ بدیع صاحب اس اثناء میں اونگھ گئے۔ زنجیر پکڑے نشے میں کھڑے ہیں۔ یہ میاں بیوی چلے تو اس طرح سے کہ بیوی آگے ہاتھ میں چمٹا لیے ہوئے۔ اور میاں پیچھے پیچھے ڈر کے مارے آنکھیں بند کیے ہوئے۔ راہ میں جو

بیوی کا ہاتھ ذری چھوٹ جائے تو غل مچائیں کہ ہائے مرا۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی پکڑ کر لے جائے۔ دروازہ کھولا تو خوجی گرے سر کے بل۔ اور میاں ڈر کے مارے خوف سے خوجی پر ارارا کر کے گر پڑے۔ اور بیوی نے دونوں کو دبوچا۔ مگر خواجہ صاحب اس وقت پھرتی سے نکل بھاگے تو ناک کی سیدھ پر چلے۔ نشہ تو ہرن ہو ہی گیا تھا۔ سیدھے مرزا صاحب کے مکان پر داخل۔ وہاں دیکھا کہ خدمت گار پڑا خراٹے لے رہا ہے۔ چپکے سے حضرت بھی اپنی کھٹیا پر لیٹ گئے مگر مارے ہنسی کے برا حال۔ کہ ہم تو تھے ہی لیکن یہ میاں صاحب ہمارے بھی چچا نکلے۔

بمبئی سے روانگی

میاں آزاد اور مرزا صاحب اندر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ

اتنے میں ایک شخص نے باہر سے آواز دی۔ مرزا صاحب نے زیبن سے کہا کہ جاؤ دیکھو تو کون ہے؟۔ حجام ہو تو کہنا کہ اس وقت ہم حجامت نہ کرائیں گے۔ تیسرے پہر آجایئے۔

زیبن آٹا گوندھ رہی تھی ''اچھا کہہ کر خاموش ہو گئی۔اس نے پھر باہر سے آواز دی۔ اور ساتھ ہی خدمت گار نے بھی پکارا۔ تب تو زیبن کو مجبور ہو کر اٹھنا ہی پڑا۔ مگر ناک بھوں چڑھاتی۔ بڑبڑاتی۔ اور خدمت گار کو الٹی سیدھی سناتی ہوئی اٹھی۔ بجلی پڑ جائے ایسی نوکری پر جو ہے میری جان کا دشمن ہے۔ واہ ایک کام چھوڑ دوسرے پر لپک۔ یہ مہینہ پورا ہولے تو تنخواہ لے کر اپنے گھر بیٹھ رہوں گی۔ کیا نگوڑی نوکری کا بھی کچھ کال ہے؟۔

زیبن کا قاعدہ تھا کہ کام تو سب کرتی تھی مگر بڑبڑا کے۔ ہزاروں باتیں بنا کر۔ بات بات پر تنک جانا تو گویا اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ ویسے اپنے کام میں بڑی تیز تھی۔ اس سے اس کی خاطر بھی ہوتی تھی۔ غرض منہ پھلا کر اور آٹے کو پٹک کر زیبن باہر گئی۔ پہلے تو خدمت گار کی خوب لے دے کی۔ کیا گھر بھر میں میں ہی اکیلی ہوں۔ جو بھی پکارتا ہے۔ مجھ ہی کو پکارتا ہے۔ موے الو کے منہ میں نام پڑ گیا ہے۔ زیبن خدمت گار کی جانی دشمن تھی۔ بات بات پر للکارا کرتی تھی۔ خیر خدمت گار اور زیبن میں چیخ چلا کی۔ اس کے بعد خدمت گار نے کہا کہ یہ آئے

ہیں ۔میاں سے جا کر ان کا پیغام کہہ دومگر سمجھ بوجھ کر کہنا۔سب باتیں سن لو اچھی طرح سے اور میاں سے کہہ دو کہ جی چاہے تو باہر آ کر سن لیجیے۔

زیبن اندر آئی۔

مرزا صاحب: کون ہے کون آیا ہے؟۔

زیبن: ۔وہ آیا ہے ملاح یا جانے کون

مرزا صاحب: کہتا کیا ہے؟۔

زیبن: حضور وہ کہتا ہے کہ آج جہاز روانہ ہوگا۔ابھی دس گھنٹے کی دیر ہے ۔تیار ہو رہیئے ۔

مرزا: آزاد سے) لیجیے حضرت اب کوچ کی تیاری کیجیے۔

آزاد: بسم اللہ یہاں کوئی لمبا چوڑا سامان تو کرنا نہیں ۔ایک بیگ ۔ایک دری۔ ایک لوٹا اور ایک لکڑی۔چلیے اللہ اللہ خیر صلا۔جس وقت کہیے جھپ سے موجود۔میرا سامان سب تیار ہے ۔وقت پر دن سے اٹھ کھڑا ہوں گا۔آپ کچھ فکر نہ کیجیے۔

خوجی: پردے کے پیچھے سے) یہاں بھی ایک ڈبیا ۔ایک پیالی ۔ایک چانڈو پینے کی نگالی ۔ایک گنا اور ایک دونا مٹھائی کا۔ایک چاقو۔ایک قرولی ۔بس اللہ اللہ خیر صلا۔توپ بندوق۔کٹار وہاں مول لے لیں گے ۔بندہ بھی کیل کانٹے سے درست ہے۔

اس بات پر میاں آزاد اور مرزا صاحب دونوں ہنس پڑے ۔خوب ہی کھل کھلائے ۔

خوجی: مولانا آزاد صاحب۔ کہیے اب چلنے کا وقت ہے۔ کچھ خواجہ بدیع کی بھی فکر ہے؟۔ وہ قرولی لیتے لیتے ہی رہ گئے۔ افیون کا کیا بندبست کیا ہے یار۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ افیون راہ میں نہ ملے اور ہم جیتے جی مر مٹیں۔ ذری زیبی کو بازار تک بھیج کر کوئی ساٹھ ستر گنڈے تو نازک نازک سے منگوا دیجیے۔ میرا بھائی نہیں تو میں جیتا نہ پھروں گا۔

زیبن: ہاں زیبن ہی تو گھر بھر میں فالتو ہے۔ لپک کر بازار سے لے کیوں نہیں آتے۔ کیا چوڑیاں ٹوٹ جائیں گی یا پاؤں کی مہندی چھوٹ جائے گی۔ اور افیم لینے عورت ذات کہاں جاؤں گی بھلا۔

بیگم: (آزاد سے) راستے میں خوجی کے سبب خوب چہل پہل رہے گی۔ جی تو نہ گھبرائے گا۔

آزاد: ہاں مگر دیکھیے کیا کیا حماقتیں کرتے ہیں۔ خدا ہی خیر کرے۔ لیے جاتا ہوں کہ غم غلط ہو۔ مگر خوف معلوم ہوتا ہے۔

خوجی: اچھا پھر مورچے پر ہماری کیفیت دیکھیے گا ابھی جو چاہے کہہ لیجیے۔ آپ سے سو قدم آگے ہی رہوں گا۔

مرزا: اس میں کیا شک ہے خواجہ صاحب۔ اور جو دشمن کی طرف کوئی بہروپیا ہوا تو پھر کیسی ٹھہرے گی۔

خوجی: سچ کہتا ہوں کہ اتنی قرولیاں بھونکی ہوں کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ مجھے بھی کوئی ایسا ویسا سمجھے ہیں آپ۔ دگلے والی پلٹن میں رسالدار تھا۔ بندے نے اودھ میں خدا جانے کتنی گڈھیاں فتح کیں۔

بیگم: کیا گڑھیاں فتح کر لیں؟ ارے واہ مسکرا کر گڑھیاں فتح کرنا خوب بات ہے۔

خوجی: حضور آپ تو میاں آزاد کے کہنے میں جاتی ہیں۔ اور مجھ کو خواہ مخواہ بناتی ہیں۔ گڑھی سے مطلب تھا اس کی جمع گڑھیاں ہوئیں یا نہیں ہوئیں۔ فرمایئے پھر گڑھیاں کیا معنی؟۔ ہم بھی کسی زمانے میں رسالدار بہادر تھے۔ اب پھٹے کپڑوں میں ہیں تو کیا ہوا؟۔

بیگم۔ اے رسال دار صاحب۔ آپ کی قرولی کیا ہوئی۔ مورچہ کھا گئی ہو تو ذری صاف کر لیجئے۔ ایسا نہ ہو مورچے پر میان ہی رہے۔

زیبن: کمیدان صاحب ہمارے لئے وہاں سے کیا سوغات لایئے گا۔

خوجی: اجی جیتے آ گئیں تو یہی بڑا تحفہ ہے۔ یہاں تو بدن کانپ رہا ہے۔ بلا کا سامنا ہے۔ اف خدا بچائے۔

بیگم: آزاد سے خط وط بھیجا کی جیئے گا یا نہیں؟

آزاد: ضرور بھیجوں گا۔ نہ بھیجنا کیا معنی؟

غرض چلنے کا وقت آ گیا اور میاں آزاد نے اپنا اور خوجی کا سامان باندھا۔ بگھی تیار ہوئی۔ سب سامان چوکس۔ سب لیس۔

مرزا صاحب۔ میاں آزاد اور خوجی صاحب جا کر بگھی پر بیٹھے اور ساحل کی طرف چلے۔ راستے میں خوجی نے بے ڈھب بے ڈھب سوال شروع کر دیے۔

خوجی: کوئی ہمیں نہانے کو کہے گا تو ہم قرولی ہی بھونک دیں گے۔

مرزا: لیکن جب کوئی کہے گا تب ہی نا۔

خوجی؛ہاں بس اتنا یاد رکھیے گا ذری۔

مرزا: کچھ زبردستی تو ہے نہیں۔چاہے نہایئے چاہے نہ نہایئے کسی کا اجارہ تو ہے نہیں۔

خوجی؛ دیکھیے ہم پھر جتائے دیتے ہیں کہ ہم گنا چوس چوس کر سمندر کے باپ میں پھینکیں گے اور جو کوئی بولے گا تو ہم دبوچ بیٹھیں گے۔ہاں ایسے ویسے نہیں یہاں۔

آزاد: جی اب بس زیادہ فکر نہ کیجیے۔میں نے سب بندوبست کرلیا ہے۔

خوجی؛ آپ کے انتظام کو بس دور ہی سے سلام ہے۔

مرزا: اجی نہیں گھبراتے کیوں ہو؟

خوجی؛ خدا کرے افیم روز کی روز ملتی رہے۔

آزاد: افیم منوں ٹنوں لیجیے یہ کیا بات ہے؟۔

خوجی؛ اور قرولی؟۔

آزاد: احمق ہو خاصے۔

خوجی: واہ یہ کیا شرافت ہے آپ کی۔گالیاں ہی دینے لگے واہ قبلہ۔

مرزا: اجی اب خدا کا نام لو۔یہ اول جلول باتیں نہ کرو۔

میاں آزاد جس وقت سمندر کے ساحل کے قریب گئے تو خوجی سے کہا کمر کسیے حضرت۔آپ تو کچھ ڈھیلے ڈھالے سے معلوم ہوتے ہیں۔اس وقت خوجی نے جو پانی کی صورت دیکھی اور گول گول دیدے دیدے پھاڑ کر لہروں اور ان کے تھپیڑوں پر نظر ڈالی۔تو کفن پھاڑ کر چیخ اٹھے اور کوئی پچاس قدم الٹے پاؤں

بھاگے۔وہاں پر خدا جانے کس مصلحت سے کسی نے ایک میخ گاڑی تھی۔ٹھوکر جو کھائی تو ارارادھوں۔لڑھکتے ہی حضرت نے غل مچایا کہ ''بھلا بے گیدی۔بہروپیا یہاں بھی ہماری جان کا گاہک آن ہی موجود ہوا۔اچھا بچہ ٹھہر تو جاؤ اتنا مارا ہو کہ عمر بھر یاد ہی تو کرے۔ہم جو پیٹھ کی طرف منہ اور منہ کے رخ دم کیے بھاگے جاتے تھے۔تو گیدی نے اچھی گھات پائی۔ایک پٹخنی چلتے چلتے بتا ہی دی۔

اب اوندھے پڑے بہروپیے کو للکار رہے ہیں۔مگر اٹھنے کی قسم کھائی ہے۔اتنے میں مرزا صاحب اور میاں آزاد بھی قریب جا پہنچے۔

آزاد:بس اٹھیے اٹھیے بڑی دیر سو لیا۔

خوجی: جھاڑ پونچھ کر) پہلوان بھی چت تو گرے گا ہی نہیں۔جب گرے گا پٹ گرا اور زمین پکڑ لی۔

آزاد:اب سفر کی تیاری ہے نا؟۔

خوجی:توبہ کر بندے بھائی خشکی چلو تو بندہ ساتھ ہے۔ورنہ سلام پانی کی صورت دیکھی اور جان نکل گئی۔میں راستے ہی میں ٹھٹھر کر کھنگر بن جاؤں گا۔تر کی تک جا کون سکے گا۔

یہ کہہ کر میاں خوجی بگٹٹ بھاگے۔آزاد اور مرزا صاحب بھی ساتھ ہی جھپٹے۔لینا لینا۔جانے نہ پائے۔چور چور۔راہ میں ایک شخص نے میاں خوجی کا ٹیٹوا لیا۔پہلے تو بہت ہی جھلائے اور لگے زور لگانے۔مگر آزاد اور مرزا بھی آن موجود ہوئے'' چھوڑ دو۔چھوڑ دو۔لو بھئی ہم آ گئے۔

مرزا(آزاد کے کان میں) حضرت یہ یوں نہیں جانے کے۔ان کو خوب افیم

پلوائیے اور الو بنائیے جب یہ نشے میں غین ہو جائیں تو لا دلود کر جہاز پر بٹھا دیں گے۔

آزاد: اچھی ترکیب ہے (خوجی سے) ارے میاں خوجی۔

خوجی: خواجہ صاحب نہیں کہتے۔ خوجی کی ایسی تیسی۔ خواجہ بدیع اچھا خاصا نام ہے۔ خوجی کیا معنی؟۔

آزاد: خواجہ صاحب قبلہ۔ آپ نے آج افیم تو پی ہی نہیں۔

خوجی: یہ کس طرح معلوم ہوا آپ کو؟

مرزا: آنکھوں سے جمائیوں سے۔

آزاد: کیوں صاحب آپ نے افیم پیتے دیکھا تھا انہیں؟

مرزا: جی نہیں میں تو خود ٹوکنے کو تھا۔

خوجی: ہاں حضرت کچھ نشہ تو ہم کو بھی ہلکا معلوم ہوتا ہے۔ (جمائی لے کر) بے شک افیم نہ پی ہوگی۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ تو اپنے ہوش کا حال ہے۔

آزاد: اس وقت جمائی بھی آئی آپ کو۔ لیجیے وہ دوسری بھی آئی آپ کو۔ خدا ہی خیر کرے۔

مرزا: وہ تیسری آئی۔ واللہ اس وقت تو جمائیوں کی ڈاک بیٹھ گئی ہے۔

خوجی: بھائی بندہ بے پیے اب تو بات کرنے کا نہیں۔

میاں خوجی بدیع صاحب نے پیالیاں نکالیں۔ افیم گھولی اور چسکی لگائی۔ آزاد ہشاش بشاش کہ تہہ پر تہہ جمائی۔ مرزا خوش کہ ہماری تدبیر کارگر ہوئی۔ خوجی نے افیم جو پی تو مارے لالچ کے زیادہ پی گئے۔ پیتے ہی غین۔ آنکھیں بیر بہوٹی کی

طرح لال۔ آزاد نے ایک چارپائی پر لاد کر حضرت کو کشتی پر سوار کیا۔ خوجی کو خبر ہی نہیں۔ ورنہ وہ شور مچاتے کہ توبہ۔ آزاد بھی مرزا سے رخصت ہو کر جہاز پر سوار ہوئے۔ جہاز چلا اور جب تک نظر آیا۔ مرزا صاحب کھڑے دیکھا کیے۔



جہاز پر

میاں آزاد اور خوجی بحری جہاز پر سوار اپنی منزل یعنی ترکی کو جا رہے تھے۔ جہاز میں ایک انگریز جوڑا بھی سوار تھا۔ خاوند کا نام اپلیٹن اور بیوی کا نام وینیشیا۔

اتنے میں جہاز کے ایک کونے سے آواز آئی کہ 'او گیدی نہ ہوئی قرولی'' نہ ہوا تپنچہ۔ ورنہ لاش پھڑکتی ہوتی اس وقت۔ میاں آزاد سمجھ گئے کہ حضرت خواجہ بدیع صاحب کو دورے شیطان نے انگلی دکھائی۔ وحشت سر پر سوار ہوئی۔ قرولی یاد آئی ڈرے ایسا نہ ہو کہ کسی یورپین سے لڑ پڑیں۔ افیم کی ترنگ میں بے وجہ جھگڑ پڑیں۔ قریب جا کر پوچھا کہ کس پر بگڑے کیوں چلایا۔ کون یاد آیا۔ کس پر غل مچایا''

خوجی: اجی جاؤ بھی۔ یہاں شکار ہاتھ سے جاتا رہا۔ واللہ گرفتار کر ہی لیا تھا۔ گیدی کو پاتا تو اتنی قرولیاں لگاتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔ مگر میرا پاؤں پھسل گیا۔ اور وہ نکل گیا۔

آزاد: (مسکرا کر) یار ایک انچ کی ہمیشہ کسر رہ جاتی ہے۔ خیر اب کی چوٹ غتو کرنا گیدی کو۔ مگر یہ تھا کون؟۔

خوجی: تھا کون۔ تھا کون۔ ہوتا کون؟۔ وہی بہرو پیا مردود۔۔۔ اور کس کو پڑی تھی بھلا۔۔

آزاد: بہرو پیا؟۔

خوجی: جی ہاں بہرو پیا۔ بڑا تعجب ہوا آپ کو۔

آزاد: بھئی ہاں تعجب کہیں لینے جانا ہے۔ کیا بہرو پیا بھی سوار ہولیا۔ بڑا الا گو ہے

بھئی۔

خوجی: سوا نہیں ہوا تو آیا کہاں سے۔ٹھہر جا گیدی تو خواجہ بدیع جو قرولیاں نہ بھونکیں ہوں۔(مونچھوں پر تاؤ دے کر) انشا اللہ۔

آزاد: کیا سوتے تھے خوجی یا نشے میں تھے؟۔

خوجی: خوجی کی ایسی تیسی۔مردود کی پھر تم نے خوجی کہا ہم کو۔کیوں جی؟۔

آزاد: معاف کرنا بھئی قصور ہوا۔

خوجی: واہ اچھا قصور ہوا۔کسی کو دو جوتے لگائیے اور کہیے قصور ہوا۔خواجہ بدیع تو صاف مجہ کم بخت کا نام تھا۔

آزاد:۔نام تھا۔کیا اب نہیں ہے؟۔

خوجی: جب دیکھو خوجی: خوجی: خوجی کی ایسی تیسی۔

آزاد:۔جناب خواجہ بدیع صاحب۔یہ بہروپیا کم بخت کہاں سے آ گیا۔

خوجی: ارے صاحب اب تو خواب میں بھی آنے لگا۔ابھی ابھی میں سوتا تھا آپ موجود۔میرے ہاتھ میں اس وقت افیم کی ڈبیا تھی۔پھینک کے ڈبیا اور لے کے گنا جو پیچھے جھپٹا تو وہ دو کوس نکل گیا۔مگر شامت اعمال سے ایک مقام پر ذرا سا پانی پڑا تھا۔روح فنا ہو گئی۔پھسلا تو ارار ادھوں۔

آزاد: کیا گر پڑے۔ارے توبہ۔

خوجی: کچھ نہ پوچھیے۔پھر آپ جانیے میرا گرنا۔یہ معلوم ہوا جیسے ہاتھی پہاڑ سے گرا۔دھڑام۔دھڑام۔

آزاد: اس میں کیا شک ہے۔آپ کے ہاتھ پاؤں ہی کہے دیتے ہیں۔وہ تو کہیے

خیریت گزری۔

خوجی: اور کیا اللہ نے بچالیا۔

آزاد: ۔تو کہیے کہ ہتھے پر سے اکھڑ گیا۔

خوجی: او جانا کہاں ہے گیدی نے ۔رگید کے نہ ماروں تو خواجہ بدیع نام نہیں۔ یہاں کمیدانی کر چکے ہیں۔

مسٹر اپلٹن اور رونیشیا دونوں میاں آزاد اور خوجی کی باتیں سن رہے تھے۔اپیلٹن تو اردو خوب سمجھتے تھے مگر ونیشیا ناواقف تھی۔اپیلٹن نے ترجمہ کر کے بتایا تو ونیشیا نے قہقہہ لگایا۔انچ بھر کا آدمی۔ایک ایک ماشہ کے ہاتھ پاؤں۔اور اس کے گرنے سے اتنی بڑی آواز پیدا ہوئی کہ جیسے ہاتھی گرے۔

اپیلٹن: پاگل ہے کوئی۔

ونیشیا: پکا سودائی معلوم ہوتا ہے۔

اپیلٹن: خدا جانے کیا واہی تباہی تھا۔قرولی تو بات بات پر بھونکتے ہیں۔

ونیشیا: ہا۔ہا۔ہا۔تم چپ رہو۔ہم اس جنٹلمین سے پوچھتے ہیں کہ یہ کون پاگل ہے۔ باتوں باتوں میں ہم اس کا حال بھی پوچھ لیں گے۔۔۔ہے نا۔۔۔

اپلیٹن: مگر ہندوستانی بدتمیز ہوتے ہیں۔تم گفتگو نہ کرو اس سے۔

ونیشیا: ۔اب تو اتنے دن ہم بھی ہندوستان میں رہ آئے ہیں۔ہم سے یہ باتیں نہ کرو۔چلو اچھا تم ہی پوچھو۔

اپیلٹن انگلی کے اشارے سے میاں آزاد کو بلاتا ہے۔میاں آزاد بھلا ایسی کب سننے والے تھے۔ چپ چپ کھڑے دیکھتے رہے۔مگر آگے نہیں آئے۔اپلیٹن

فوجی آدمی چہرہ مارے غصے کے لال ہوا۔خیال ہوا کہ ونیشیا قہقہے لگائے گی۔تالیاں بجائے گی۔ونیشیا نے جو یہ کیفیت دیکھی تو اٹھلاتی ہوئی میاں آزاد کی طرف گئی۔میاں آزاد نے جو ایک معزز لیڈی کو مخاطب پایا تو ادب سے ٹوپی اتار لی۔مسکرائے اور پوچھا کہ آپ کہاں تشریف لے جائیں گی۔

ونیشیا: انگلستان۔

آزاد: خوب ہندوستان میں کس قدر عرصہ رہنے کا اتفاق ہوا۔

ونیشیا: بہت ہی کم یہی کوئی ایک برس یا سوا برس۔

آزاد: درست۔

ونیشیا: یہ ذرا سے قد والا آدمی کون سا ہے؟۔

آزاد: جی ایک مسخرہ ہے۔

ونیشیا: ۔خوب باتیں کرتا ہے۔

آزاد: جی ہاں بڑا مسخرا ہے۔

ونیشیا: ۔اپنے شوہر کی طرف مخاطب ہو کر) اپیلٹن یہ کہتے ہیں کہ وہ بونا مسخرہ ہے۔(آزاد سے) یہ لیفٹیننٹ اپلیٹن ہیں میرے شوہر۔آیئے آپ سے ان کی ملاقات کرا دوں۔

آزاد: ہاتھ بڑھا کر گڈ مارننگ سر۔

اپلیٹن: ۔(ہاتھ ملا کر) گڈ مارننگ آپ کہاں جائیں گے۔

آزاد: ترکی۔

ونیشیا: ۔کوئی خاص کام ہے۔یا صرف سیر و سیاحت کے لئے۔

آزاد: ایک ضروری کام ہے۔

اپلیٹن: وہاں تو آج کل جنگ چھڑی ہوئی ہے۔

آزاد: جی ہاں میں بھی اسی لئے جاتا ہوں۔

اپلیٹن: اوہ جنگ کے واسطے۔

آزاد: جی ہاں۔

وینشیا: آپ تو ترکی کا ہاتھ بٹائیں گے۔

آزاد: جی اس میں کیا شک۔

اپلیٹن: آخاہ میاں آزاد تو آپ کا نام نہیں۔

آزاد: حیران ہو کر ہاں ہے تو یہی نام آپ کو کیوں کر معلوم ہوا؟۔

اپلیٹن: ایک اخبار میں آپ کا ذکر دیکھا تھا۔ آپ تو بڑے لائق فائق مشہور جنٹل مین ہیں۔

اتنے میں جہاز میں ایک دل لگی باز کو سوجھی کہ آؤ خوجی کو بنائیں اور خوب قہقہے لگائیں۔ دو چار اور زندہ دل ان کے ساتھ شریک ہوئے۔ جب دیکھا کہ میاں خوجی نشے میں سو گئے تو ایک شخص نے دو لال مرچیں ان کے ناک میں ڈال دیں۔ خوجی نے جو آنکھ کھولی تو اچھیں۔ آچھیں۔ آچھیں۔ آچھیں۔ آچھیں باؤلے کتے کی طرح ادھر ادھر پھرنے لگے۔ وینشیا اور اپیلٹن اور میاں آزاد اور جہاز کے مسافر ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ حضرت خواجہ بدیع صاحب بہت ہی جھلائے اور خوب ہی گرمائے۔

آزاد: بھائی خواجہ بدیع صاحب۔

خوجی: بس الگ رہیئے۔ آچھیں۔

آزاد: آخر یہ ہوا کیا کچھ تو بتاؤ؟

خوجی: چلیے آپ کو کیا۔ وہ جا ہے جو کچھ ہوا۔ آچھیں۔

آزاد: یار اسی بہروپیے کا سارا فساد ہے۔

خوجی: دیکھیے تو کتنی آچھیں)قرولیاں بھونکی ہوں مردود کو کہ آچھیں (یاد ہی تو کرے۔ آچھیں۔

آزاد: مگر تم تو گر گر پڑتے ہو۔ ایک دفعہ جی کڑا کے گرفتار ہی کر لو۔

خوجی: ہونہہ کیا ہنسی ٹھٹھہ ہے۔ گرفتار کر لینا (آچھیں)

ونیشیا: اس وقت اس نے کیا کیا؟

خوجی: ناک میں مرچیں ڈال دیں گیدی نے۔

اس پر اور بھی قہقہہ پڑا اور قہقہے کی آواز نے میاں خوجی کو اور بھی چندصیا دیا۔ پاتے تو سب کو کچا ہی کھا جاتے۔ اور بہروپیے کی تو ہڈی تک باقی نہ رہتی۔ مگر خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا۔

آزاد: اب کی آپ تاک میں بیٹھے رہیئے۔ بس آتے ہی گرفتار کر لیجیے۔ مگر ہے بڑا شریر۔ آتے ہی ناک میں دم کر دیا۔

خوجی: اف اوہ کچھ ٹھکانہ ہے۔ یہ ناک میں مرچیں جھونکنا کیا معنی۔ یہ ناک۔ کان کی دل لگی کیسی؟۔

آزاد: اور کیا صاحب یہ بڑی بے جابات ہے۔

خوجی: بے جا اور بجا کے بھروسے نہ رہیئے گا۔ میں ایک آدھ دن میں ہاتھ پاؤں

ڈھیلے کر کے رکھ دوں گا۔ کہاں کے بڑے کڑے خان ہیں آپ۔ میں نے کمیدانی کی ہے۔

ونیشیا: کیا کہتا ہے (میاں آزاد سے)

آزاد: ترجمہ کر کے کہتا ہے کہ میں فوج میں کپتان رہ چکا ہوں۔

ونیشیا: ویل۔ کپتان صاحب۔

خوجی: واہ۔ واہ۔ واہ۔

آزاد: اور کیوں بندہ پرور اس خاکسار نے کیا کیا تھا جو حضور نے لے ڈالا اس وقت۔ کہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دوں گا۔

خوجی: (آنکھیں کھول کر) ارے یہ آپ تھے۔

آزاد: اور نہیں تو کیا آپ کے باپ تھے؟۔

خوجی: بھائی معاف کرنا۔

آزاد: یار کوئی ایسی تدبیر کرو کہ بہروپیا پکڑا جائے۔

خوجی: تم بولو نہیں۔ بس دیکھتے جاؤ۔ صبح شام میں گرفتار ہی کیا چاہتا ہوں گیدی کو۔

آزاد: لیکن اب ذرا ہوشیار سوئیے گا۔ بہروپیا گیا جہنم میں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی روپے دوپے غائب کر دے۔ بے وقوف کہیں کا اے گدھے یہاں بہروپیا کہاں؟۔

خوجی: بس صاحب اب حد ہو چکی۔ ہمیں جو کہے گا سنے گا بھی۔ (بوریا بستر اٹھا کر) بندہ چلتا ہے۔ یارانہ ہو چکا اور سنیئے ہم گدھے ہیں۔ کیا جانے کتنے گدھے ہم نے بنا ڈالے؟۔

آزاد: چلیے گدھے نہیں گدھے گر (گدھے بنانے والا) سہی۔ لیکن جایئے گا کہاں

۔یہ بھی خشکی ہے کیا؟۔

خوجی:او جہاز کے کپتان۔اوناخدا جہاز روک دے۔

آزاد:ایں جہاز روک لے پھر کیا خوب

راوی:واللہ پھڑ کا دیا۔واہ میاں خوجی کیوں نہ ہو۔اپنے حساب گویا چھکڑے پر لدے ہیں۔جب چاہا روک لیا۔

ونیشیا:(زور سے قہقہہ لگا کر) کیا جہاز کرر کنے کا حکم دیتا ہے؟۔

اپیلٹن:ہاں بہت بگڑے ہیں۔

خوجی:ارے جہاز روک لو۔اوناخدا۔

اپلیٹن:وہ یوں نہ سنے گا۔دو چار ہاتھ قرولی کے لگایئے۔پھر سنے گا۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ خدمت گار نے آکر صاحب سے کہا کہ حضور حاضری (کھانا) چنی گئی ہے۔

ونیشیا:آزاد سے کہو کہ ہمارے ساتھ ہی کھانا کھائیں۔

اپیلٹن: مسٹر آزاد اس وقت ہماری خواہش ہے کہ ہم اور آپ ساتھ کھانا کھائیں۔ہم اپنے کیبن میں کھاتے ہیں۔

آزاد:کیاہرج ہے۔

ونیشیا:ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ ہی اٹھا بیٹھا کیجیے۔دو گھڑی غم ہی غلط ہوگا۔

آزاد:میں بےحد شکرگزار ہوں۔

اتنے میں ونیشیا نے میاں خوجی کو انگلی کے اشارے سے بلایا۔خواجہ بدیع بہت

اکڑتے اور اینڈتے ہوئے چلے۔ اہو۔ ہو۔ ہو۔ ذرا حضرت کے قد و قامت کو دیکھیے اور اس بوکھلاہٹ کو دیکھیے۔ اپنے نزدیک لندھور پہلوان کے بھی چچا ہیں ۔اے شاباش ہے۔ واہ کیوں نہ ہو۔ اس وقت ذرا پاؤں پھسلے تو دل لگی ہو۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ اتنا بڑا اڑوہ کا ڈوہ جب گرے گا۔ تو جہاز پانی کی سطح سے سمندر کی تہہ کی خبر لائے گا۔ اللہ تیری پہلوانی۔ خیر آپ میم صاحب کے پاس پہنچے۔

آزاد: ٹوپی اتار کر سلام کرو۔ ٹوپی اتارو خوجی۔

خوجی کا لفظ کہنا تھا کہ خواجہ بدیع صاحب کے غصے کے تھرمامیٹر کا پارہ ایک سو بیس درجے پر پہنچا۔ بس پلٹتے پڑے اور پلٹتے ہی الٹے پاؤں بھاگنے لگے۔

آزاد: او گیدی (مسکرا کر) جو پلٹ گیا نا تو اتنی قرولیاں بھونکی ہوں گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔

ونیشیا: (ہنس کر) کیا ہم سے خفا ہو گئے حضور۔ اے یہ آ کے پلٹنا کیا معنی۔ ادھر آیئے صاحب۔

آزاد: (خوجی کو روک کر) کیوں بھئی کیا شیطان نے پھر انگلی دکھا دی میاں خوجی۔

خوجی: خوجی پر خدا کی مار۔ خوجی گیدی پر شیطان کی پھٹکار۔ ایک دفعہ خوجی کہا۔ میں خون پی کے رہ گیا۔ اب پھر دہرایا۔ خدا جانے کب کا دیا اس گاڑھے وقت آڑے آتا ہے۔ ورنہ واللہ مارے قرولیوں کے بھٹا سا سر اڑا دیتا۔ لاکھ گیا گزرا ہوں تو کیا ہوا؟ عمر بھر رسالداری اور کمیدانی ہی کیا کیے ہیں۔ گھانس نہیں کھودی ۔جی ہاں۔

ونیشیا: آخاہ یہ خوجی کے لفظ پر بگڑے۔ ہم سمجھے ہم سے روٹھ گئے۔

خوجی: نہیں ایسی بات آپ فرماتی ہیں ۔میم صاحب۔

آزاد: ذرا ان سے ان کی بیوی کا حال پوچھیے ۔

ونیشیا: کیا آپ کی بیوی کے بھی آپ کے سے لمبے چوڑے ہاتھ پاؤں ہیں۔

آزاد: ان کی بیوی کا نام بوا زعفران ہے ۔دیونی ہے ۔دیونی۔

خوجی نے جو بوا زعفران کا نام سنا تو چہرہ زرد۔ رنگ فق ۔کلیجہ شق ۔اور یہ جب یاد آیا کہ خوب بے بھاؤ کی پڑی تھیں ۔تو سہم گئے ۔ایک دفعہ ہی آنکھیں بند کر لیں ۔ونیشیا سمجھی نہیں کہ کیا اسرار ہے؟ ۔مگر میاں آزاد تو واقف تھے۔ سمجھایا تو خوب کھل کھلائیں۔

طوفان

میاں آزاد اور اپلیٹن اور رونیشیا اور ایک ظریف بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ میاں خوجی لڑھکتے ہی چلے آتے ہیں۔ ایک سوکھا گنا ہاتھ میں ہے۔ ظریف نے کہا: آیئے بس آپ ہی کی کسر تھی۔"

خوجی: مجھے بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ کسی سے پوچھوں۔ یہ سمندر ہے کیا شے۔ اور کس فقیر کی دعا سے بنا ہے۔

ظریف: احمقوں کی تاریخ میں اس کا کل حال درج ہے۔

خوجی: کچھ تو فرمایئے۔

ظریف: اگلے وقتوں میں جب لوگ کپڑوں کی بجائے کھال پہنتے تھے۔ اور جنگلی جانوروں کا کچا گوشت کھاتے تھے۔ ایک ملک تھا: گھامڑنگر۔

خوجی: ذری ٹھہر جایئے گا۔ کیا وہاں افیم بھی بکتی ہے۔

ظریف: اس ملک کے باشندے بڑے جری اور سپاہی آدمی تھے۔ مگر چھوٹے قد کے۔

خوجی: مونچھوں پر تاؤ دے کر ہوں ہوں۔ چھوٹے قد والے تو جری اور بہادر ہوتے ہی ہیں۔

ظریف: لیکن کوئی باشندہ بغیر قرولی باندھے گھر سے نہیں نکلتا تھا۔ قرولی نہ ہو تو قرابینچہ سہی۔

خوجی: (اکڑ کر) کیوں میاں آزاد: وہی بات آگے آئی نا۔

ظریف:۔ایک ان لوگوں میں سخت عیب تھا۔

خوجی:۔ارے وہ کیا۔ بتاؤتو جی۔

ظریف:۔سب مرد وافیم پیتے تھے۔

خوجی:۔تیوری چڑھا کر۔او گیدی۔

ظریف:۔ہائیں۔ہائیں۔شریف یور چین۔جنٹل مین سے یہ سخت کلامی۔

خوجی:۔ہم تو سر سے پاؤں اور پاؤں سے سر تک پھنک گئے۔آپ شریف لیے پھرتے ہیں نہ ہوئی قرولی۔ورنہ ڈھیر کر دیتا او گیدی۔

ظریف:۔غرض کہ کوئی افیم کا شائق نہ تھا۔

خوجی:۔ایں۔کیا شائق نہ تھا۔

ظریف:کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں افیم نہ ہو۔دن رات افیم ہی گھلا کرتی تھی۔

خوجی:ہنس کر۔ہاں۔واہ وہ کونسا ملک تھا ہائے ہم نہ ہوئے۔

ظریف:مرد تو وہاں تھے چھوٹے قد کے۔مگر عورتیں لمبی تڑنگی۔

خوجی:یہ بری سنائی۔زعفران وہیں کی ہوگی۔

آزاد؛(ہنس کر)واللہ کیا کہی۔

ظریف:جہاں میاں ذرا بگڑے تو بیوی نے بغل میں داب کر دو تین جھٹکے دیے یا دبایا اور بازار بھر میں پھرایا۔

خوجی:(اچھل کر)اہا۔ہا۔ہا۔یار سنتے ہو۔وہ بہروپیا وہیں کا تھا۔کیوں اب تو اس گیدی کا مکان بھی مل گیا۔اچھا ٹھہر جاؤ۔چپانہ بنا کر چھوڑوں تو سہی۔

ظریف:وہاں کے باشندے کمیدانیاں کرتے تھے۔

خوجی: جھک مارتا تھا ہمارا باپ۔

آزاد: یا وحشت۔ خیر ہے میاں۔

خوجی: واللہ جھک مارتا تھا گیدی۔

خوجی: ہمارا باپ۔

آزاد: بڑے لائق بیٹے پیدا ہوئے کہ باپ کو بھی گالی سے نہ چھوڑا۔

خوجی: اجی وہ ہمارا باپ ہی نہ تھا۔ جھوٹا تھا گیدی۔

آزاد: آخر اب کیوں کر جانیں۔

خوجی: قرولیاں بھونکنے کا کام کیا کرتا تھا۔ جھک مارتا تھا۔

وینیشیا: کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

خوجی: قسم قرآن کی جھک مارتا تھا۔

آزاد: یار اتنے بگڑ گئے۔

خوجی: قسم امام حسینؓ کی جھک مارتا تھا۔

آزاد: آپ کے والد بھی تو ذرا سے تھے۔

خوجی: نہیں وہ لمبا بیوقوف تھا۔ مگر ماں البتہ موٹی تازی تھی۔ وہ اسی **ملک** کی تھیں جس کا یہ ذکر رہے ہیں۔

آزاد: کیا زندہ ہیں ابھی تک۔

خوجی: اف کوئی بیس برس ہوئے انہیں دفنائے ہوئے۔ ہاں صاحب اس **ملک** میں اور کیا کیا ہوتا تھا۔ اس **ملک** کے آدمیوں کی تصویریں بھی آپ کے پاس ہیں۔

ظریف: تجھیں تو ضرور مگر دے دیں۔ نہیں بالکل تمہارے ہی سے ہاتھ پاؤں تھے۔

کرارے جوان۔قرولیاں پاس اور گنے بہت کھاتے تھے۔

خوجی: میاں آزاد۔اب بس ہماری تمہاری نہ بنے گی۔خدا کے بندے وہاں سے تو لمبے چوڑے اقرار کر کے لائے تھے۔کہ قرولی ضرور لے دیں گے۔اب یہاں آ کے صاف مکر گئے۔اب ہمیں قرولی منگا دو تو خیریت ہے۔ورنہ ہم بگڑ جائیں گے۔واللہ کون گیدی دم بھر بھی یہاں ٹھہرے۔

آزاد: اور یہاں سے آپ جائیں گے کہاں؟ جہنم میں۔جائیے نا بسم اللہ۔

وئیشیا:۔ان کے پاس کچھ روپیہ پیسہ بھی ہے۔یا مفلس ہی ہیں۔

آزاد: جی میں ان کا خزانچی ہوں۔چاہے جس قدر روپے کی ضرورت ہو۔چٹکیوں میں حاضر کرتا ہوں۔

خوجی: نشے سے چونک کر باپ بنے تھے گیدی نامعقول کو کیا کہوں؟۔

آزاد: پھر گرمائے بھئی۔واقعی تمہارا باپ پاگل تھا۔کہ تم ایسے اس پاگل کے لڑکے ہو۔

خوجی: اجی خدا خدا کیجیے۔باپ کس کا تھا۔کس کا باپ تھا۔کس کا۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ جہاز کے کپتان نے سب کو اطلاع دی کہ ایک گھنٹے میں سخت آندھی آنے والی ہے۔تیار ہو رہو۔یہ خبر سنتے ہی سب کے ہوش و حواس غائب ہو گئے اور جہاز پر کھلبلی مچ گئی۔

وئیشیا: آندھی ہے کہاں۔ہمیں تو آندھی واندی کچھ بھی نظر نہیں آتی۔

آزاد: ہماری تو سمجھ میں ہی نہیں کہ کہا کیا۔خاصہ صاف مطلع ہے۔یہ انھوں نے بیٹھے بٹھائے اچھا شگوفہ چھوڑا۔کہنے لگے آندھی آنے ہے۔مفت میں بیٹھے

بٹھائے لوگوں کو پریشان کر دیا۔ آج اپریل کی پہلی تاریخ بھی نہیں کہ ہم سمجھیں سب کو اپریل فول بنایا ہے۔

اپیلٹن: اس کی کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہو گی۔ بیوجہ کپتان آندھی کا نام زبان پر نہ لاتا۔ مگر بظاہر آندھی کے ذرا بھی آثار نہیں پائے جاتے۔

اتنے میں چاروں طرف سے لوگوں کے شور وغل کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک بوڑھا جو بچپن سے سینکڑوں بار جہاز پر سوار ہو چکا تھا کہنے لگا یہ آندھی نہیں موت کا پیغام ہے۔ شاید دس پانچ آدمی کسی طرح بچ نکلیں۔ ورنہ اب ڈوبے اور اب ڈوبے ایک بوڑھی لیڈی نے کہا کہ "اب جہاز کی خیریت نظر نہیں آتی۔ آندھی بہت ہی سخت آنے والی ہے۔

اتنے میں کپتان نے پھر سب کو اطلاع دی کہ خبردار ہوشیار آندھی آن پہنچی۔ جہاز کا خدا حافظ۔ سب لوگ دعا کریں۔ کہ خدا اس مصیبت سے بچائے۔

خوجی: چونک کر ہائیں یہ غل کیسا ہے۔ کیا تر کی آن پہنچے۔ چلو سفر تو ختم ہوا۔ بھائی آزاد یہاں اترتے ہی پوچھنا کہ افیم کہاں بکتی ہے۔ یار اب تین چار دن کی ہی رہ گئی ہے۔

آزاد: افیم گئی جہنم میں۔ انہیں افیم کی پڑی ہے۔

خوجی: آنکھیں کھول کر) کیوں کیوں یہ کیا بات۔ آخر یہ سب کے سب چلاتے کیوں ہیں؟۔

آزاد: بہت بڑا طوفان آنے والا ہے۔ جہاز اب کسی صورت بچ نہیں سکتا۔ لوگوں کے جی چھوٹ گئے آپ کو افیم کی تلاش ہے۔

خوجی: بری سنائی۔ کہتے بھی تھے کہ ترکی ورکی جانے کا قصد نہ کرو۔ نہ مانا۔ نہ مانا لو اب بھگتو۔ خیر خدا کرے جہاز تباہ ہو تو چین میں پہنچے کہ افیم تو ملے بہت سی۔ اور حسن آرا بھی وہاں سے قریب ہی ہونگے۔

آزاد: کم بخت پھریا دولائی۔ حسن آرا نے جب ہمارے ڈوبنے کا حال سنا تو کڑھ کڑھ کر مرے گی۔ گھٹ گھٹ کر مرے گی۔

اتنے میں ہوا نے وہ زور باندھا کہ توبہ توبہ۔ جہاز کے کپتان نے صرف ایک باد بان رہنے دیا۔ باقی سب اتار لیے۔ اب جہاز راہ خدا پر چھوڑ دیا گیا۔ موجوں کی حالت تھی کہ آسمان سے باتیں کرتی تھیں۔ جہاز تھپیڑے کھا کر گیند کی طرح ادھر سے ادھر جاتا تھا۔ اور ادھر سے ادھر آتا۔ جہاز والے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جان اور مال کو رو بیٹھے تھے۔ سمندر کی ڈراونی صورت دیکھ کر بدن کانپ اٹھتا تھا۔ بچے سہم کر اپنی ماؤں سے چمٹے جاتے تھے۔

میاں آزاد سوچنے لگے خدایا یہ کس مصیبت سے دوچار کیا۔ یہاں ہماری ہڈیاں تک گل جائیں گی۔ مگر حسن آرا بیگم اس حادثے کی خبر بھی نہ پائیں گی۔ وہ بیچاری برسوں ہماری خبر سے بے خبر رہے گی۔

اب سنیے کہ جہاز بھر میں تو کہرام مچا ہوا تھا مگر خوجی افیمی نشے میں لمبی تانے سو رہے تھے۔ اس نیند پر خدا کی مار۔ اس نیند پر شیطان کی پھٹکار۔ میاں آزاد نے جگایا کہ خواجہ صاحب اٹھیے طوفان آیا ہے۔ حضرت نے لیٹے ہی لیٹے جھنجھنا کر فرمایا کہ: چپ گیدی ہم نے خواب میں بہروپیا پکڑ پایا ہے۔ تب تو میاں آزاد جھلائے۔ اور کس کر ایک لات لگائی۔ خوجی کلبلا کر اٹھ بیٹھے۔ طوفان کا عالم دیکھا

تو ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ سمندر کی بھیانک صورت دیکھی تو کانپ اٹھے۔

جس مقام پر جہاز غرق ہونا تھا۔ اس کے سامنے ایک چھوٹا اور پر فضا ٹاپو تھا۔ ''جزیرہ پیرم'' یہ جزیرہ یمن کے ساحل سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ سب دعائیں مانگ رہے تھے کہ یا الٰہی کس طرح اس جزیرے تک جہاز خیریت سے پہنچ جائے۔ تیری بندہ نوازی کے صدقے ہمیں جزیرے تک پہنچا دے۔

اتنے میں کپتان نے حکم دیا کہ سب لوگ جہاز کے عرشے پر آ جائیں۔ جہاز تین بار گھوما اور تند ہوا اسے کئی گز کے فاصلے پر لے گئی۔ پھر کپتان نے پکار کر کہا کہ:

حفاظتی کشتیاں پانی میں اتار دو''

کستیاں پانی میں اتری جانے لگیں۔ آزاد نے کشتیاں اتارنے میں بڑی مدد کی۔

اب جہاز ڈوبنے ہی کو تھا۔ دس فٹ سے زیادہ پانی جہاز میں آ گیا تھا۔ اس وقت آزاد کی پھرتی۔ ہمدردی اور سچی شجاعت کے سب جہاز والے مداح تھے۔ آزاد نے بہت سے لڑکوں اور عورتوں کو کشتی میں جگہ دی اس کام میں حالانکہ اس کی اپنی جان خطرے میں تھی مگر آزاد کی جرات اور شجاعت اعلیٰ درجے کی تھی۔ آزاد اس وقت عورتوں اور بچوں کو مدد دے رہے تھے کہ وہ جہاز سے کشتی میں کود آویں۔ اتنے میں ونیشیا نے بلند آواز سے اسے پکارا۔ آزاد سب کو چھوڑ کر ونیشیا کی طرف آئے اور ان کو کشتی میں سوار کرا دیا۔ اتنے میں اپلیشن بھی آ گیا۔

آزاد کی بہادری اس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔ لوگوں ک وشک کی جگہ یقین ہو گیا کہ یہ انسان نہیں فرشتہ آسمان سے آیا ہے۔ دوسری کشتی میں بھی آزاد کی کوشش سے بہت سے آدمی سوار ہوئے۔ جہاز کے کپتان نے اس وقت جہاز کو چھوڑا جب وہ

تین بار چکر کھا کر غرق ہونے کو تھا۔

جزیرہ پیرم کے باشندے بڑے دکھ کے ساتھ دیکھتے تھے کہ ایک جہاز ڈوب رہا ہے۔ان لوگوں نے جزیرے پر خوب تیز روشنی کی اور کئی من تیل برابر ڈالتے چلے گئے تا کہ شعلے بلند ہوں اور اگر جہاز والوں نے پریشانی کے سبب اس جزیرے کو نہ دیکھا ہو تو روشنی دیکھ کر سمجھ جائیں کہ زمین قریب ہے۔تین مختلف مقامات پر آگ جلائی گئی۔سینکڑوں آدمی اس دردناک واقعے کو دیکھنے کے لئے اپنے اپنے مکان چھوڑ کر ساحل پر آن کھڑے ہوئے تھے۔اور غل مچا رہے تھے۔اکثر آدمی پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور سچے دل سے چاہتے تھے کہ جہاز ڈوبنے سے بچ جائے۔ ہوا نے اب وہ زور باندھا کہ توبہ توبہ۔یہی معلوم ہوتا تھا کہ طوفان کو گویا ان لوگوں سے جانی دشمنی ہے۔جو جہاز پر سوار ہیں۔خوجی طوفان کو گالیاں دیتے جاتے تھے۔کہ او کم بخت او۔بے ایمان طوفان۔او بے رحم او سنگ دل طوفان! او گیدی کب کا بدلہ لیا ہے۔ہائے اسی سے تو میں پانی کی صورت سے کانپتا تھا۔اس پانی کو آگ لگے۔مار ہی تو ڈالا۔میاں آزاد کو اس وقت خیال ہی نہ رہا کہ میاں خوجی بھی ان کے ساتھ ہیں۔آزاد نے اور لوگوں کو تو کشتی میں آنے میں مدد دی مگر ان کو بالکل ہی بھول گئے۔ادھر خوجی اس وقت ایسے چندھیائے گئے کہ ایک مقام پر کھڑے ہو کر جہاز۔طوفان اور سمندر کو گالیاں دے رہے تھے۔اتنے میں ایک لہر آئی۔جہاز تہہ و بالا ہونے لگا۔وہ لہر گئی تو دوسری آئی ابھی جہاز سنبھلنے نہ پایا تھا کہ تیسری نے آفت ڈھائی۔میاں آزاد اب جہاز پر سے کودنے ہی کو تھے کہ کپتان نے میاں خوجی کو بھی بڑی مشکل سے بچایا۔آتے ہی انہوں نے غل مچایا کہ یارو

افیم کی ڈبیا تو وہیں رہ گئی۔میاں کوئی بندہ خدا۔ذری لپک کر جائے اور ہماری ڈبیا لے آئے۔آزاد کو جو دیکھا تو چمٹ گئے کہ بھائی آزاد جب اتنا بڑا جہاز نہ بچا تو یہ ننھی ننھی کشتیاں بھلا کیوں کر بچیں گی۔

آزاد نے کہا خدا مالک ہے۔جب زور سے آندھی آتی ہے۔تو تناور درخت بھی پھٹ پڑتے ہیں۔کبھی کسی نے یہ نہ دیکھا ہوگا کہ آندھی چلنے سے گھانس ٹوٹ گئی ہو۔

اب جہاز کو موج نے اس زور کا تھپیڑا دیا کہ جہاز اچھل گیا۔کپتان بھی کشتی میں آگیا تھا۔کشتیوں میں صرف تھوڑے سے آدمی آئے تھے۔باقی جہاز پر پریشان کھڑے تھے۔جہاز گھومنے لگا جس طرح پھرکی کو بچہ گھماتا ہے۔اسی طرح موجوں کے تھپیڑوں سے جہاز نے چکر کھایا۔جہاز والوں کا حال بے حد برا تھا۔ان کی بے کسی اور بے بسی دیکھی نہ جاتی تھی۔مصیبت کے مارے جہاز پر دیوانہ وار پھرتے تھے۔کہ کسی طرف بھاگ جائیں اور جان بچائیں۔

تین کشتیاں موجوں کے تھپیڑے کھاتیں جزیرے کی طرف جانے لگیں۔ان میں کل ستر آدمی تھے۔تاریکی ایسی چھائی تھی اور لہریں اس قدر بلند ہو ہو جاتی تھیں کہ جزیرہ نظر نہ آتا تھا۔مگر روشنی نے ان کو بڑی مدد دی۔

اتنے میں مخالف ہوا چلی تو دو کشتیوں کا رخ بدل گیا۔ادھر جہاز چکر کھا کر غرق ہو گیا۔بچوں۔عورتوں اور مردوں کے چیخنے چلانے کی آوازوں سے کشتی والوں کے دل دہل گئے۔جس کشتی میں وینیشیا اور اپلیٹن تھے وہ مخالف ہوا کے زور سے جزیرہ پیرم سے تھوڑے فاصلے پر بہتی چلی گئی۔ چپو ار بھی کسی اناڑی کے ہاتھ میں

تھا۔موت ہر سمت سے اپنی بھیانک صورت دکھاتی تھی۔چاروں طرف مصیبت ہی مصیبت نظر آتی تھی۔جہاز پر سے کشتی میں آئے مگر یہاں بھی مصیبت نے ساتھ نہ چھوڑا۔اتنے میں ونیشیا نے پوچھا:

ونیشیا: آزاد کس کشتی پر ہیں؟۔

پلیٹن: وہ سامنے جاتی ہے۔

ونیشیا: اب ہماری کشتی بچ بھی سکتی ہے بھلا؟۔

پلیٹن: خدا بڑا کارساز ہے۔

ونیشیا: (سرد آہ بھر کر) یا الٰہی ہمیں بچا لے۔رو کر ہائے ہم بے گناہ ہیں۔

پلیٹن: گھبراؤ نہیں خدا کی خدائی میں کسی کو دخل نہیں۔

ونیشیا: یقین نہیں آتا کہ زندہ بچیں۔

پلیٹن: لو آزاد کی کشتی بھی ادھر ہی آنے لگی۔

ونیشیا: ہاں آئی مگر وہ بھی ادھر ہی چلی آتی ہے۔ماجرا کیا ہے یا خدا۔یا خدا۔

پلیٹن: آزاد کی کشتی کا رخ بدل گیا ہے۔افسوس ایسا طوفان تو ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔یا الٰہی مدد دے۔یا خدا مدد دے۔

ایک کشتی جس پر کپتان سوار تھا۔وہ تو خیریت سے جزیرہ پیرم کے ساحل تک پہنچ گئی مگر ابھی دو کشتیاں سمندر ہی میں تھیں۔رات اور بھی اندھیری ہوتی گئی۔مگر اب طوفان کسی قدر کم ہو گیا تھا۔چنانچہ دوسری دونوں کشتیاں بھی جزیرے کی طرف چلیں۔

میاں آزاد اور خوجی ایک کشتی پر تھے۔ونیشیا اور پلیٹن دوسری پر۔اب دونوں

کشتیاں ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر جانے لگیں۔اتنے میں ایک موج نے ستم ڈھایا اور اپلیٹن والی کشتی چکر کھا کر دوسرے رخ بہتی چلی گئی۔اور بری طرح ہچکولے کھانے لگی۔جس سے تین آدمی سمندر میں جا گرے۔ان میں سے ایک اپلیٹن بھی تھے۔ادھر وینیشیا نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہوگئی۔آزاد فوراً اپنی کشتی پر سے کود پڑا اور اپلیٹن کی مدد کو چلا۔ادھر اپلیٹن کا وفادار کتا بھی آقا کے پانی میں گرتے ہی پانی میں کود پڑا۔اور سر کے بال دانتوں سے پکڑ کر اس نے اپنے آقا کو ابھارا۔میاں آزاد بھی تیرتے ہوئے جا پہنچے۔ایک تھپکی جو دیتے ہیں تو اپلیٹن ابھرے۔کشتی قریب آئی۔لوگوں نے مدد دے کر اپلیٹن کو کھینچ لیا۔یہ اس وقت ایسے گھبرائے ہوئے تھے کہ روح تک گویا لرز رہی تھی۔وینیشیا نے شوہر کو جب دوبارہ کشتی میں دیکھا تو مارے خوشی کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اپلیٹن: اس بے زبان جانور اور آزاد نے مجھے اس وقت بچا لیا۔ادھر میں گرا۔ادھر کتا کودا اور کشتی سے میاں آزاد کود پڑے۔

میاں آزاد کی مدد سے اپلیٹن تو بچ گئے مگر خود وہ بیچارے سوار نہ ہو سکے۔چنانچہ انہیں تیرتے ہوئے جانا پڑا۔جب کشتی ساحل کے بالکل قریب پہنچی تب کہیں لوگوں کو میاں آزاد نظر آئے۔آزاد ڈوبتا تیرتا جانے لگا۔کپتان نے جو دوربین کے ذریعے دیکھا تو اور بھی حوصلہ بڑھایا۔آزاد جزیرہ پیرم کے ساحل پر آئے اور آتے ہی مارے تھکاوٹ کے گر پڑے۔کپتان اور اپلیٹن نے میاں آزاد کی پیٹھ ٹھونکی وینیشیا نے میاں آزاد کا شکریہ ادا کیا۔

کپتان۔میاں آزاد۔وینیشیا اور خوجی چاروں ایک پرانے ملاح۔جو اس جزیرے

میں رہتا تھا۔اس کے مہمان ہوئے۔وہ ملاح ساحل کے قریب ایک گاؤں میں رہتا تھا۔اس غریب آدمی کے پاس اس قدر سامان تو تھا نہیں کہ و نیشیا۔اپیلٹن اور آزاد کی خاطر خواہ تواضع کرتا۔مگر جو کچھ حاضر تھا۔اس میں دریغ نہ کیا۔کھانا کھانے بیٹھے تو و نیشیا نے بے اختیار کہا۔

و نیشیا: جس قدر ذائقہ آج کھانے میں حاصل ہوا ہے۔عمر بھر نہیں حاصل ہوا تھا۔

آزاد: اس وقت جی چاہتا ہے کہ اگر بس چلے تو اپنی میزبان کو اس جزیرے کا بادشاہ کر دوں۔

و نیشیا: کیا عمدہ اور دل چسپ مقام ہے؟۔

اپلیٹن: ایسی مچھلی بھی کہیں نہ کھائی ہوگی۔

ملاح: میں نے آج صبح دیکھا کہ دو ابابیلیں پانی کی سطح کے بالکل قریب سمندر میں جا رہی ہیں۔بس میرا ماتھا ٹھنکا۔میں نے کہا خدا ہی خیر کرے۔کسی جہاز پر تباہی ضرور آئے گی۔یہ تیسری مرتبہ ہے کہ دو ابابیلوں کے پانی کی سطح کے قریب جانے سے طوفان آیا۔میں نے تین بار تجربہ کیا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد سب کے سب بڑی دیر تک بیٹھے رہے۔خوب باتیں ہوئیں۔اپلیٹن اور خوجی یوں باتیں کرنے لگے۔

اپلیٹن: بڑی بیش بہا اشیاء کل یہاں والوں کے ہاتھ آئیں گی۔

خوجی: اس میں کیا شک ہے۔دیکھیں ہماری افیم کی ڈبیا کس خوش نصیب کے ہاتھ لگتی ہے۔

اپلیٹن نے جو یہ فقرہ سنا تو کھل کھلا کر ہنس پڑا۔و نیشیا سے کہا۔و نیشیا خوجی کہتے ہیں

کہ کل ڈوبی ہوئی چیزوں میں سے اکثر قیمتی چیزیں جزیرے والوں کے ہاتھ آئیں گی ۔خدا جانے ہماری افیم کی ڈبیا کس خوش قسمت کے ہاتھ لگے۔آزاد اور ونیشیا مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئے ۔افیم کی ڈبیا کیا جواہرات کی ڈبیا تھی؟۔

دوسرے روز اتفاق سے ایک کشتی جو بمبئی سے لندن جاتی تھی۔ جزیرہ پیرم کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوئی ۔اس کشتی کے کپتان کمانڈر ولیمس نے سویز تک کا پاس ان لوگوں کو مفت دیا۔ڈوبنے والے جہاز کے کپتان مسٹر اسمتھ تو میاں آزاد کے دلی دوست ہو ہی گئے تھے ۔ولیمس سے بھی انہوں نے آزاد کی تعریف کی ۔اور کہا کہ اس بہادر آدمی کے سبب سے تیس چالیس آدمیوں کی جان بچ گئی۔دو بار یہ جوانمرد جہاز میں کودا۔ایک بار کشتی سے کود کر مسٹر اپلیٹن کی جان بچائی ۔

ونیشیا نے میاں آزاد سے کہا کل ہم کسی وقت سویز میں داخل ہوں گے۔آپ کا احسان تمام عمر نہ بھولوں گی کہ میرے شوہر کو آپ نے بچایا۔ورنہ مین بھی اسی وقت سمندر میں کود پڑتی ۔اور مارے غم کے اپنی جان دے دیتی ۔

جزیرہ مالٹا میں

صبح سویرے میاں آزاد ابھی جہاز پر سو ہی رہے تھے کہ دفعتہً مسٹر اپلیٹن نے ان کو آواز دی:

مسٹر آزاد۔ مسٹر آزاد۔ اٹھیے سویرا ہو گیا۔ ہم مالٹا پہنچ گئے۔" آزاد اٹھے تو دیکھا کہ مالٹا کے گرجوں اور مسجدوں کے سنہرے مینار اور کنگرے سورج کی کرنوں سے چمک رہے ہیں۔ اور دور سے سارے شہر کے اونچے اونچے مکان اور عمارتیں نظر آتی ہیں۔ میاں آزاد اس سفر سے بڑے لطف اندوز ہوئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ان کا جہاز مالٹا میں لنگر انداز ہوا۔ لوگ خوشی خوشی اترے۔ خوجی اور میاں آزاد مسجد میں گئے۔ مسٹر اپلیٹن اور مسٹر اسمتھ گرجا کی طرف روانہ ہوئے۔ انہوں نے ڈیڑھ گھنٹے تک گرجے میں عبادت کی اور وہاں سے چلے تو میاں آزاد کو مسجد سے ساتھ لیا۔

کپتان اسمتھ نے بتایا کہ کل ایک جہاز لندن روانہ ہو گا۔ رات کو سب مل جل کر رہے۔ صبح ک وجدائی کا وقت تھا۔ دوسرے دن جب ونیشیا اور اپلیٹن سوار ہونے لگے تو میاں آزاد کو بڑا دکھ ہوا۔ یہی حال ان دونوں میاں بیوی کا تھا۔

ونیشیا: جیسے بہن کو اپنے بھائی سے محبت ہوتی ہے۔ ویسے ہی مجھ کو تمہاری محبت ہے۔

آزاد: اب اس وقت اگر کوئی اس قدر تسلی دے دے کہ میں تم کو اور تمہارے شوہر کو پھر دیکھ سکوں گا۔ تو میں جی اٹھوں۔ میں سوچتا ہوں کہ میں دو تین دن تک یہاں

اکیلا کیسے رہ سکوں گا۔ایک ایک گھنٹہ ایک ایک سال کے برابر گزرے گا۔

وینیشیا: اب ہندوستان ہی میں ملیں گے یا شاید یورپ میں ملاقات ہو۔

آزاد: میں ہندوستان میں رہوں یا جہاں رہوں۔ملوں گا ایک مرتبہ ضرور۔

وینیشیا: یہ اقرار کرو کہ خط برابر بھیجتے جاؤ گے۔

آزاد: برابراس میں کیا فرق پڑے گا۔

غرض وینیشیا اور ایلیٹن میاں آزاد سے رخصت ہوئے اور آزاد مالٹا میں اکیلے رہ گئے۔

جزیرہ مالٹا میں مختلف ملکوں کے آدمی ہیں۔آرمینین۔عرب۔انگریز۔اسکاچ۔آئرش۔ہسپانوی۔یونانی وغیرہ وغیرہ۔مگر دو دن سے اس جزیرے میں ایک بڑے گرانڈیل جوان کا گزر ہوا ہے۔قد کوئی آدھ گز۔ہاتھ پاؤں دو دو ماشے کے ہوا ذرا تیز چلے تو پتہ ہو جائیں۔کنی لگانے کی ضرورت پڑے مگر بات بات پر تیکھے ہوئے جاتے ہیں۔کسی نے ذرا ترچھی نظر سے دیکھا اور حضرت نے قرولی سیدھی کی۔ان کو کسی بات کا خیال ہی نہ تھا۔بس افیم ہو اور کچھ چاہے ہو یا نہ ہو۔اس وحشت کے صدقے میں کہ میاں آزاد نے تو جہاز پر سے کشتی میں بلوا لیا تھا۔اب غل مچاتے ہیں کہ یارو افیم کی ڈبیا لپک کر لے آنا۔اے صل علی۔کوئی بگڑے دل ہوتے تو ڈبیا لانے کے عوض حضرت ہی کو جہاز میں پھر اچھال دیتے کہ لیجیے خواجہ بدیع صاحب افیم گھولیے۔سمندر بھرا پڑا ہے۔

آزاد نے کہا: ''بھئی تمھارا یہ فقرہ عمر بھر نہ بھولے گا کہ پیرم کے باشندے اور قیمتی چیزیں تو پاویں گے ہی۔لیکن دیکھیں ہماری افیم کی ڈبیا کس خوش قسمت کے ہاتھ

لگتی ہے۔

خوجی: پھر اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔آخر ہنسے آپ کس بات پر۔ ہماری تو جان پر بن آئی اور آپ کو دل لگی سوجھتی ہے۔ واللہ جہاز کے ڈوبنے کا کس کو رنج ہے۔مگر افیم ہائے افیم۔ چنیا بیگم کے ڈوبنے کا البتہ کمال رنج ہے۔اس وقت سے جمائیوں پر جمائیاں آتی ہیں۔وہ تو کہیے کہ ملاح بچارے نے دو دن کا سہارا کر دیا۔اب اس وقت کیا کیا جائے؟۔

آزاد: لاحول ولا قوۃ۔

خوجی نے میاں آزاد سے دو پیسے لیے اور ایک دکان پر پہنچے۔

خوجی: افیم دو افیم۔

دکان دار منہ تا کتا ہے کہ یہ کیا بک رہا ہے۔

خوجی: ہم افیم مانگتے ہیں۔ارے میاں افیون۔افیون۔دکان دار نے ہاتھ سے کہا کہ ہم سمجھتے نہیں۔

خوجی: عجیب جانگلو ہے۔ابے ہم افیم مانگتے ہیں۔

دکان دار ہنسنے لگا۔

خوجی: کیا پھٹی جوتی کی طرح دانت نکالتا ہے۔ابے گیدی نہ ہوئی قرولی ورنہ دھواں اس پار ہوتا۔

راوی: کیا خوب۔قرولی ہوتی تو دھواں اس پار ہوتا۔ ماشا اللہ۔

خوجی: لے بس اب دل لگی ہو چکی۔لاؤ افیم لاؤ۔اتنے میں میاں آزاد پہنچے۔

آزاد: ایں خوجی۔

خوجی: جھک مارتے ہیں آپ۔ خوجی مردود پر لعنت۔

آزاد: ارے غضب۔ لاحول ولا قوۃ۔ معاف فرمایئے گا خواجہ بدیع صاحب۔ خوجی: خوجی۔ اور وہ ہی کروڑ بار معاف کر چکا ہوں۔

آزاد: یہاں کیا خریداری ہوتی ہے۔

خوجی: اجی یہاں تو سب جانگلو ہی جانگلو رہتے ہیں۔ ایک گھنٹے سے افیم مانگ رہا ہوں۔ کوئی سنتا ہی نہیں۔

آزاد: پھر کہنے سے تو آپ برا مانتے ہیں۔ بھلا یہ بارود بیچتا ہے یا افیم۔ اب تم بتاؤ جانگلو وہ ہے یا تم۔

خوجی: بھئی یہاں پر تو ہم بھی قائل ہو گئے۔

اس فقرے پر میاں آزاد بے اختیار ہنس پڑے اور خوجی بہت ہی شرمندہ ہوئے۔

خوجی: لاحول ولا قوۃ۔

آزاد: عقل سے تم کام ہی نہیں لیتے۔

خوجی: ہم نے خود ہی کہہ دیا نا کہ یہاں پر ہم بھی قائل ہو گئے۔

آزاد: چلو ہم افیم دلوا دیں۔ آؤ اٹھو۔

خوجی: قربان قربان۔ واللہ مردہ تن میں پھر سے جان آ گئی۔

آزاد: پیسے باندھ رکھیے گا۔ جب ترکی سے واپس جایئے گا تو بیوی کو دے دیجیے گا۔

خوجی: ہمارا دل تو یہی گواہی دیتا ہے کہ اسکندریہ تک بھی پہنچنا محال ہے۔ جہاز کا حال تو ہم دیکھ چکے ہیں۔ اور آپ نے ٹھیکہ لیا ہے کہ دنیا بھر کو ڈوبنے سے آپ بچائیں گے۔ کوئی پانی میں گرا اور آپ جھم سے کود پڑے۔ ایک نہ ایک دن آپ کی

جان ضرور جانی ہے۔ پوچھیے کوئی مرے کوئی جیئے آپ کو کیا واسطہ ؟۔

میاں آزاد نے کہا'' بھئی اب ہمارا کہا مانو ہم کو تو ترکی جانے دو اور تم چل دو ہندوستان۔

خوجی: نے اپنا منہ پیٹ لیا۔واہ۔واہ۔واللہ میں نہ مانوں گا۔اور اب تنہا واپس کس سے جایا جائے گا۔نہ حضرت بندے کو معاف کیجیے۔اب میں ساتھ چھوڑنے والا نہیں۔بھئی افیم البتہ دلوادو۔اور میں چلا جاؤں گا تو تم لڑو گے کس کے برتے پر تو میں لڑنے جاتا ہوں نا۔

خوجی: کون قسم کھا کے کہتا ہوں۔جب سنیے گا یہی سنیے گا کہ خواجہ صاحب نے توپ میں کیل لگادی۔

آزاد: جی اس میں کیا شک؟۔

خوجی: شک وک کے بھروسے بھی نہ رہیے گا۔اکیلی لکڑی چولھے میں بھی نہیں جلتی۔دیکھیے جس وقت بدیع صاحب گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں اور اکڑ کر بیٹھتے ہیں۔اوپچی بنے ہوئے اس وقت اچھے اچھے جنڈیل اور کنڈیل (جرنیل اور کرنیل) جھک جھک کے سلام کرنے لگتے ہیں۔

آزاد: مسکرا کر: بھئی واللہ جنڈیل اور کنڈیل کی تم نے ایک ہی کہی۔مگر واسطے خدا کے میدان جنگ میں میرے ساتھ نہ جائیے گا۔بلی بخشے چوہا بے چارہ لنڈورا ہی جائے گا۔

خوجی: بہت ہی بگڑے اور اکڑ کر بولے!'' واللہ ایک کٹاری سے لشکر کے لشکر اور پرے کے پرے صاف نہ کر دیے ہوں تو خواجہ بدیع نہیں۔پھر مونچھوں کو تاؤ دے

کر کہا'' انشا اللہ دیکھتے تو جایئے۔ مگر یاراب کی جو جہاز غرق ہوا تو بس گئے ہی گزرے۔

یہ باتیں ہو ہی رہیں تھیں کہ ایک حبشی سامنے سے آ نکلا۔ ڈنڈ پیل جوان۔ مچھلیاں بھری ہوئیں۔ سینہ چوڑا۔ میاں خوجی نے جو دیکھا کہ ایک شخص اکڑتا ہوا سامنے آ رہا ہے تو حضرت بھی اینڈنے لگے۔ میاں آزاد کو بے اختیار ہنسی آئی۔ حبشی نے قریب آ کر شانے سے ذرا دھکا دیا تو میاں خوجی نے بیس لڑھکنیاں کھائیں۔ اور دھم سے منہ کے بل گرے۔

آزاد نے قہقہہ لگا کر کہا'' دیکھیے سنبھلیے میاں خوجی صاحب۔ خواجہ صاحب بے حیا تو تھے ہی جھاڑ پونچھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور حبشی کو للکار کر کہا۔

او گیدی نہ ہوئی قرولی اس وقت ورنہ بدن کو چھلنی کر دیتا۔ اتفاق سے میں اپنی زعم میں آپ ہی آ رہا۔ نہیں تو وہ پٹخنی دیتا کہ انجر پنجر ڈھیلے ہو جاتے۔

میاں آزاد نے کہا افسوس تو یہی ہے کہ آپ اپنے ہی زعم میں ہمشیہ پٹخنی کھا جاتے ہیں۔ بھلا اس حبشی سے تم تو کیا سارا گاؤں ہی مقابلہ کر کے دیکھ لے۔

خوجی: بولے اچھا لڑا کے دیکھ لو نا! چھاتی پر نہ چڑھ بیٹھوں تو خواجہ بدیع نام نہیں اور ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ کہو تو للکاروں جا کے۔

آزاد نے کہا بس جانے دیجیے۔ آپ کیوں اپنے ہاتھ پاؤں کے دشمن بنے ہوئے ہیں؟۔

میاں آزاد کو تو اب بس ایک ہی دھن تھی کہ جس طرح ممکن ہو فوراً ترکی پہنچوں۔ میدان جنگ میں تلوار کے جوہر دکھاؤں۔ سرخروئی حاصل کر کے

ہندوستان واپس آؤں اور حسن آرا بیگم کو نکاح میں لاؤں۔ پھر خیال آیا کہ قسطنطنیہ جانا اور ترکی کے فوجی افسروں تک رسائی حاصل کرنا اور میدان جنگ میں قابلیت اور بہادری کے جوہر دکھانا آسان کام نہیں ہے۔ خدا جانے ترکی والے ہم سے کس طرح پیش آئیں۔ فوج میں ہم کوئی عہدہ پائیں یا نہ پائیں۔ یہ سوچ کر ان کا دل اس قدر بھر آیا کہ بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میاں خوجی نے سمجھایا کہ دیکھو بھئی آزاد ہماری تمہاری اب ایک ہے۔ تمہیں حسن آرا بیگم اور ہمیں چنیا بیگم نے کہیں کا نہ رکھا ہے۔ دونوں کی حالت ایک ہے۔ اس وقت ذرا دل بہلاؤ۔ دو گھونٹ پانی پیو۔ کھانا کھاؤ۔ آزاد نے کہا سبحان اللہ غم غلط کرنے کی کیا خوب تدبیر بتائی ہے۔ ہماری تو جان پر بن آئی ہے۔ اور آپ فرماتے ہیں کھانا کھاؤ۔ دل بہلاؤ۔ حضرت خواجہ صاحب اس وقت دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اپنے مرنے کا رنج نہیں۔ آج نہیں کل مرے۔ کل نہیں پرسوں مرے۔ یوں نہ مرے زخم کھا کر مرے مگر افسوس تو یہ ہے کہ حسن آرا بیگم بیچاری کڑھے گی۔ اور ہمارے حال سے ان کو کوئی بھی مطلع نہ کرے گا۔ ستم تو یہ ہے کہ وہ اپنے دل میں سوچیں گی کہ آزاد ہمیں دغا دے گئے اور ترکی نہ جا سکے۔

خوجی: بھائی چاہے ملاقات ہو نہ ہو مگر یہ خیال دل سے نکال دو کہ حسن آرا تمہاری طرف سے بدگمان ہوں گی۔

آزاد: اب تو چاہے جیسی سختی پڑے جھیلیں گے ضرور۔ اگر ہم مر گئے تو تم حسن آرا کو ہماری موت کی اطلاع ضرور دو گے یا نہیں؟۔

خوجی: تم مرو گے۔ کیا طاقت۔

آزاد: یہ بھی اختیاری بات ہے کچھ؟

خوجی: کیا مجال مرنا نہ ہوا ہنسی ٹھٹھا ہوا۔ اور وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہ تھی۔

آزاد: سن تو لو۔

خوجی: غیر ممکن بات کوئی اور سنتے ہونگے۔ ثبوت دو گے کہ تم مر جاؤ گے۔

آزاد: کیا کوئی مرنے سے بھی انکار کر سکتا ہے۔

خوجی: تو مرتے ہم ایسے ہیں۔ دبلے پتلے بوڑھے افیمی نہ کہ تم ایسے ہٹے کٹے چاق چوبند۔

آزاد: اور شاید ہم ہی تم سے پہلے مر جائیں

خوجی: واہ اجی تم ہم کو مار کے مرو گے۔

آزاد: خیر۔

خوجی: خیر کیا معنی کوئی زبردستی ہے کیا۔ ہم تم کو نہ مرنے دیں گے۔ ادھر تم کو نزع کی حالت میں دیکھا اور ہم نے زہر کھالیا۔ اب فرمایئے پہلے کون مر گیا۔

آزاد: اچھا اور جو ہم ڈوب گئے۔

خوجی: سنو میاں ڈوبنے والے اور ہی ہوتے ہیں۔ ان کی ایسی صورت ہی نہیں ہوتی۔ اور ڈوبنے والے سمندر میں ڈوبنے نہیں آیا کرتے۔ ان کے لئے ایک چلو پانی ہی کافی ہے بس۔

آزاد: اگر ہم مر گئے تو حسن آرا بیگم کو ضرور اطلاع دینا۔

خوجی: کیا مجال؟۔

آزاد: نہ اطلاع دو گے۔

خوجی: ہرگز نہیں

آزاد: آخر وجہ؟۔

خوجی: اگر ہم ڈوبتے۔ترتے۔لڑھکتے۔پڑھکتے وہاں تک پہنچے تو جا کر کہیں گے کہ ایک عورت کو میاں آزاد نکاح میں لائے اور اب مزے سے ترکی میں دندناتے پھرتے ہیں۔ہم یہ نہ کہیں گے کہ آزاد مر گئے ہیں۔

آزاد: تسلیم! خوب دوستی کا حق ادا کریں گے آپ؟۔

خوجی: ہماری یہ بات بھی حکمت سے خالی نہ ہو گی۔

آزاد: اور وہ حکمت کیا ہے۔ہم بھی تو سنیں۔

خوجی: اگر آپ ک اکوئی دوست بیوقوف گھامڑ آپ کے مرنے کے بعد حسن آرا کو لکھ بھیجے کہ میاں آزاد مر گئے تو حسن آرا کی جان پر بن آئے یا نہیں۔اس بے چاری کے دل پر کیسے گزرے گی؟۔سر پٹک پٹک کر دم توڑ دے گی۔اور جو یہ سنے کہ آزاد ہیں تو جیتے جاگتے مگر ایک عورت کے ساتھ شادی کر لی۔تو قسم خدائے پاک کی تمہارے نام سے نفرت ہو جائے گی۔اور رنج تو قریب پھٹکنے نہ پائے ۔اب بولو اچھی ترکیب ہے یا نہیں

آزاد: ہاں ہے تو اچھا۔

خوجی: اکڑ کر)دیکھا بوڑھے آدمی ڈبیا میں بند کر کے رکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔سکندر اعظم جب مقدونیہ سے چلے تو حکم دیا کہ فوج کے ساتھ سب جوان ہی

جوان چلیں۔ اگر کوئی بوڑھا چلا تو قتل کر دیا جائے گا۔ ایک سپاہی نے اپنے بوڑھے باپ کو چپکے سے پٹاری میں بند کیا اور ساتھ لے چلا۔ بس حضرت سلامت۔ ایک موقع پر بوڑھے کی ضرورت ہوئی۔ اچھے اچھے حکیموں کی عقل دنگ تھی۔ آخر کار سپاہی اپنے بوڑھے باپ کو لے گیا اور کہا ''جہاں پناہ سے جان بخشی کی امان چاہتا ہوں۔ آپ کے حکم کے خلاف باپ کی محبت کی وجہ سے ساتھ لے آیا ہوں۔ سکندر نے اس کا قصور معاف کیا۔ اور بوڑھے نے جو عقل کے گھوڑے دوڑائے تو وہ بات پیدا کی کہ حکیموں تک کو پسند آئی۔ تجربہ بڑی چیز ہے۔ تم لاکھ پڑھ جاؤ۔ پھر لونڈے ہی ہو ہمارے سامنے۔

آزاد: درست ہے۔

خوجی: ہمیں آج تک معلوم نہ ہوا کہ آپ کا گھر کہاں ہے۔ وطن کہاں ہے۔ اتنا تو بتا ہی دو۔

آزاد: خانہ بدوش۔ وطن کا پتہ ہی نہیں ہے۔

خوجی: یہ کہیے۔ معلوم تو ہوا کہ رونے والا کوئی نہیں ہے۔ چلو سستے چھوٹے۔ رہیں حسن آرا ان کو ہم سمجھا دیں گے۔ وہی ترکیب کہ تمہاری غیبت کریں گے۔

خوجی: نے کہا یا تو اس قدر جوانمردی کہ حسن آرا کے اشارے کی ذرا سی دیر تھی کہ آپ جہاز پر سوار ہو گئے۔ وطن کو خیر باد کہا اور ترکی چلے۔ اور یا اب اس قدر پریشانی کہ بات کرنا دوبھر ہو رہا ہے۔ یہ کیا بات ہے۔ دل کو مضبوط رکھو۔ کوئی کتاب پڑھو۔ تم اتنے لائق آدمی ہو۔ دس بارہ دن سے ہم نے تم کو پڑھتے نہیں دیکھا۔

آزاد: ہاں سچ کہتے ہو۔بڑی ہوتو کیا ہوا؟۔مگر اس وقت ٹھکانے کی بات کہی۔

خوجی: کوئی کتاب پڑھو۔مالٹا کی خوب سیر کرو۔ارے یار اول تو ہمیں امید ہی نہیں کہ ہندوستان واپس جائین گے۔اور اگر خوش قسمتی سے زندہ بچے اور ہندوستان کی صورت دیکھی تو زمین پر قدم نہ رکھیں گے۔

آزاد: مسکرا کر زمین پر تو آپ اب بھی قدم نہیں رکھتے ہیں۔

خوجی: ہم کہیں گے تم لوگ کیا جانو کہ مالٹا کہاں ہے۔بھلا بتاؤ جزیرہ پیرم کہاں ہے؟۔

آزاد: پریم نہیں پیرم۔

خوجی: بس تم میں یہی سخت عیب ہے کہ۔۔۔وہ پریم کہا تو کیا اور پیرم کہا تو کیا۔

آزاد: ہاں اور پھر خوجی کہا تو کیا اور خواجہ بدیع صاحب کہا تو کیا؟۔

خوجی: مسکرا کر خاموش۔

آزاد: ہنسے۔ہنسے۔خوجی۔۔۔وہ توبہ توبہ۔۔۔خواجہ صاحب۔جناب خواجہ بدیع صاحب۔

خوجی: اجی تم نے ہمیں کمیدانی کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔واللہ انگلیاں اٹھتی تھیں۔جدھر سے نکل گئے۔انگلیاں اٹھنے لگیں۔

آزاد: نے کہا خواجہ صاحب! اب آپ یہاں شادی کر لیں۔اور مزے مزے سے رہیئے کہو تو کوشش کی جائے۔کسی سے کہیں سنیں۔

خوجی: نے کہا اب ترکی سے واپس آئیں تو شادی کی فکر کریں۔ابھی نہیں۔مفت میں شادی کر کے الو بنیں۔یہ پردیس ٹکا پاس نہیں۔آپ کو شادی کی دھن سمائی

ہے۔واہ واہ ۔صاحب واہ ۔ہاں ترکی سے واپس آئیں تو پھر بیاہ رچے ۔۔۔۔میاں خواجہ بدیع بھی دولہا بنیں۔

آزاد:اہو۔ہوہوہو۔مزے میں آئے میاں خوجی۔

خوجی: مسکرا کر چھیڑ خانی سے آپ باز نہیں آتے۔پھر وہی خوجی۔خوجی۔بھائی خواجہ صاحب کیوں نہیں کہتے۔خواجہ بدیع کہونا۔

آزاد:میاں آزاد۔خوجی کو لے کر ایک کوٹھی میں گئے۔وہاں قہوہ کی سوداگری ہوتی تھی۔آزاد نے اپنے دوست کو وہاں بٹھایا اور افیم منگوائی۔افیم دیکھتے ہی میاں خوجی کھل گئے۔سینکڑوں ہی دعائیں دیں۔واہ بھئی واہ۔خدا کرے چار ہی پانچ مہینے میں حسن آرا سے ملو۔

افیم ہاتھ میں لے کر ایسے خوش ہوئے کہ پھولے نہ سمائے۔ایک چینی کی پیالی لے کر دکان ہی میں افیم گھولی اور چسکی لگائی۔۔۔واہ آزاد۔کیوں نہ ہو سچے یار۔پکے محسن۔واللہ تم ہی ہو۔واللہ یہ احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔بھئی افیم پینا برا ہے۔مگر عادت کو کیا کریں۔مجبوری ہے۔قسم خدا کی افیم کی ڈبیا جس وقت جہاز میں ہم سے چھوٹ گئی۔بس یہ معلوم ہوا کہ تیر کلیجے سے پار ہو گیا۔ڈوبنے کا اس قدر رنج نہ ہوتا۔دو تین بار چاہا کہ کود پڑوں اور کود کے لاؤں مگر ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

میاں خوجی اس دکان میں مالک کی اجازت سے لیٹے۔آزاد نے کھانا کھایا اور ادھر ادھر ٹہلنے لگے تو دیکھا کہ کئی ایک کتابیں ایک کونے میں چنی ہیں۔ایک ایک کتاب کو دیکھنے لگے۔کچھ یونانی تھیں۔کچھ عربی۔مگر دیکھتے ہی دیکھتے ایک انگریزی کتاب ان کے ہاتھ میں آئی۔کرسی پر بیٹھ کر کتاب پڑھنے لگے۔مالک

دکان نے پوچھا کہ کہاں کے قصد ہیں۔ مالٹا تک ہی آئے ہو یا کہیں اور جاؤ گے؟۔

آزاد: نے نہایت ادب سے جواب دیا کہ جی نہیں۔سکندریہ جانے کا عزم ہے۔کل جہاز پر سوار ہوں گا اور وہاں سے ترکی جاؤں گا۔

مالک دکان نے کہا' وہاں بھی ہماری ایک کوٹھی ہے۔آپ اسی کوٹھی میں ٹھہریں اور اگر کسی دوست کے پاس جاتے ہیں تو خیر۔

آزاد بہت خوش ہوئے۔سوچے یہ خوب ملے۔چلو ابھی رہنے کا سہارا تو ہو گیا۔کہا آپ ایک خط لکھ دیں تو اچھا ہے۔

مالک مکان نے کہا بڑی خوشی سے۔ابھی ابھی لکھوں گا۔آپ وہاں آرام سے رہیئے گا۔میرا بیٹا وہاں آپ کو قسطنطنیہ کی سیر کرا دے گا۔لیکن آج کل تو وہاں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔آزاد سرد آہ کھینچ کر خاموش ہو گئے۔تھوڑی دیر کے بعد اخبار ٹائمز اس کوٹھی کے مالک نے ان کو پڑھنے کے لئے دیا۔اور یہ پڑھنے لگے۔

آزاد: آخاہ جنگ چھڑ گئی۔

مالک: ہاں اور کیا۔

آزاد: مگر جنگ عظیم ہو گی۔لوہے سے لوہا لڑے گا۔دیکھیے انجام کیا ہوتا ہے؟۔

مالک: جنگ کا کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور ہوتا ہے۔ترک لڑیں گے خوب اور روس کے سپاہی بھی بڑے بہادر ہیں۔لیکن روس کے پاس سامان بہت ہے۔ترکی کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ہاں افسر اگر بہادری سے لڑیں تو روس سے البتہ مقابلہ کر سکتے ہیں۔آپ تو کبھی ترکی گئے نہیں۔میں بخوبی واقف ہوں۔وہاں آپس کی نا اتفاقی

انتہا سے زیادہ ہے۔سب اپنا پنا بھلا چاہتے ہیں۔مگرایک بات ہم ضرور کہیں گے کہ ترکوں سے زیادہ بہادر اور شجاع شاید ہی کوئی قوم ہو۔

آزاد:۔بے شک ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ ہم فتح حاصل کرلیں گے۔

کوٹھی کے مالک نے جن کا نام رستم جی بھائی تھا۔میاں آزاد کو ایک نہایت لذیذ نارنج دیا اور کہا کھائیے۔یہ میرے باغ کا ہے۔آزاد نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔

آزاد:ایک سال میں کتنے پھل لگتے ہوں گے۔

رستم جی:اس کا اندازہ ذرہ مشکل ہے۔

آزاد:فینسل ایک مقام ہے سنا ہے وہاں سال بھر میں آٹھ آٹھ ہزار پھل اترتے ہیں۔

رستم جی:آپ کو خوب پتا ہے۔اس قدر تو ہم کو بھی معلوم ہے کہ 1250ء میں اٹلی میں اس کا ایک درخت تھا۔اس سے پہلے شاید یورپ میں نارنج کا درخت نہ تھا۔ایک سیاح تھا اومس۔اس نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں پانچ ہزار برس کا ایک درخت اس نے دیکھا تھا۔

آزاد:۔اور بلبہارڈی میں ایک درخت ہے جولیس سیزر کے وقت کا۔

رستم جی:جولیس سیزر حضرت عیسیٰ کے کوئی چالیس بیالیس برس پہلے کا ہے۔

آزاد:اور کیا۔

رستم جی:ایک فرانسیسی مجھ سے کہتا تھا کہ شمانیا میں ایک پیڑ ہے دوسو پچاس فٹ اونچا۔

آزاد:اللہ۔اللہ ڈھائی سوفٹ کی بلندی۔درخت کیا۔درختوں کا باپ ہوا۔

خوجی: بھئی واللہ افیمی اور چانڈو باز ناحق ہی بدنام ہیں۔ اس گپ کے قربان۔ کہنے لگے پانچ ہزار برس کا ایک پیڑ ہے۔ اور آسمان تک اس کی شاخیں پہنچ گئی ہیں۔ فرشتے ہاتھ بڑھا کر اس کا پھل توڑتے ہیں۔ اف رے جھوٹ اور کیسے کیسے معتبر آدمیوں کے نام لیے۔ فلانا سیاح آیا تھا۔ فلانا فرانسیس کہتا تھا۔ ابھی ہم جو بات کہیں تو کسی کو یقین ہی نہ آئے۔ پانچ ہزار برس کا درخت۔۔ اللہ ری گپ

۔

آزاد: آپ جی اٹھے۔

خوجی: میاں خدا کے لئے جھوٹ نہ بولا کرو۔ کچھ تو خدا کا خوف بھی ہے یا نہیں۔

آزاد: رستم جی سے آپ نے کبھی افریقہ کی سیر کی ہے؟۔

رستم جی: مرتے مرتے بچا۔

خوجی: وہ تو ہم سمجھے ہی تھے۔ کیا زمانہ ہے سچے مرتے جاتے ہیں اور ان جیسے جھوٹے مر مر کے جیتے ہیں۔

رستم جی: اریکو ایک عالم تھے۔ ان کا مقولہ ہے کہ اگر کوئی شخص مجھ سے پوچھے کہ سورج میں آبادی ہے یا نہیں تو میں جواب دوں گا کہ مجھے اس کا حال معلوم نہیں۔ لیکن اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ جس طرح ہماری زمین کی مخلوق ہے۔ اس طرح اس پر مخلوق ہوگی یا نہیں تو میں کہوں گا کہ ہاں ہوں گے۔ ہرشل کا مقولہ ہے کہ سورج میں آبادی ضرور ہے۔

آزاد: ہم اتنے بڑے عالموں کی رائے میں دخل تو نہیں دے سکتے۔ مگر اس قدر ضرور کہیں گے کہ ہمارے ناقص علم کے مطابق سورج ضرور آباد ہے۔ ممکن نہیں کہ

اتنا بڑا کرہ جناب باری نے بے وجہ بنایا ہو۔آبادی ضروری ہے۔اور جو یہ کہا جائے کہ صرف زمین کے فائدے کے لئے سورج کی ضرورت پیش آئی تو ہمارے نزدیک یہ کفر کی بات ہے۔بھلا عقل کبھی تسلیم کرسکتی ہے کہ اتنا بڑا سورج خدا نے صرف زمین کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہو۔ایک صاحب کی رائے ہے کہ چاند میں آبادی غیر ممکن ہے۔اور خیر سے اس کا سبب کتنا عمدہ بتاتے ہیں کہ چاند میں پانی نہیں ہے اور پانی کے بغیر زندگی محال ہے۔مگر یہ دلیل بھونڈی ہے۔ہم کہتے ہیں کیا یہ ضروری ہے کہ چاند کی مخلوق بھی پانی ہی کے ذریعے زندگی بسر کرے۔ممکن ہے کہ وہ پانی ہی نہ پیں۔اس کے علاوہ اکثر علماء نے ثابت کیا ہے کہ چاند میں بھی پانی ہے۔

رستم: ان میں سے اکثر باتیں فرضی ہیں۔بالکل خیالی پوچ۔ایک صاحب فرماتے ہیں کہ دوربین کے ذریعے انہوں نے ڈیڑھ ہزار ستارے گن لیے۔

آزاد: قہقہہ لگا کر۔واہیات۔

پانچویں دن میاں آزاد جہاز میں سوار ہونے کو تھے۔رستم جی نے اپنے بیٹے کے نام خط لکھ دیا۔اور آزاد کو ان کی تسلی کے لئے سنا بھی دیا۔اس میں لکھا تھا۔جس قدر ان کی خاطر کروگے۔اسی قدر تمہاری سعادت ہے۔یہ میرے معزز دوست ہیں۔تم ان کے ساتھ ادب سے پیش آنا۔اور ان کی مدد کرنا۔خط لے کر میاں آزاد اور خوجی رستم جی سے روانہ ہوئے اور سکندریہ میں داخل ہوئے۔

اختتام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حصہ دوم

خوجی کی کشتی

اب سنیئے کہ میاں آزاد کا نام دور دور تک مشہور ہو گیا تھا۔ اور اکثر لوگ ان کی ملاقات کے شائق تھے۔ سکندریہ کے ایک ہوٹل میں میاں آزاد مع خوجی کے ٹھہرے۔ کھانا کھانے کے وقت آیا تو خوجی رنگ لائے۔

خوجی: لاحول ولاقوۃ۔ یہاں کھانے والے کی اپنے حساب ایسی تیسی۔ ہم کوئی بات شرع کے خلاف نہیں کریں گے، چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ ذرا سی تکلیف کے لئے ہم اپنا مذہب نہ دیں گے۔ آپ شوق سے جائیں اور مزے سے کھائیں۔ ہم درگزر رہے۔

آزاد: اور افیم کھانا شرع کے خلاف نہیں ہے۔؟

خوجی: ہرگز نہیں اور اگر ہے تو کیا فرض ہے کہ ایک بات شرع کے خلاف کریں تو ساری باتیں ہی شرع کے خلاف کریں۔

آزاد: ابے تو نامعقول یہ کس گدھے نے تجھ سے کہا کہ یہاں کھانا شرع کے خلاف ہے۔ میز، کرسی دیکھی اور بک دیا کہ شرع کے خلاف ہے۔ اگر سور کا گوشت یا شراب ہوتو خیر ہم بھی کہیں کہ شرع کے خلاف ہے۔ لیکن اس میں کیا ہے؟ صاف ستھرا مقام۔ مسلمان پکانے والے۔ مگر خبط کا کیا علاج۔

خوجی: جی وہ خبط ہی سہی۔ آپ رہنے دیجیے ہونہہ۔ آزاد۔ ہونہہ کیا معنی۔ کھاؤ نہیں تو جہنم میں جاؤ۔

خوجی: جہنم میں وہ جائیں گے، جو یہاں کھائیں گے، ہم تو بہشت میں

دندنائیں گے۔

آزاد: جی اس میں کیا شک ہے اور وہاں افیم کہاں سے آئے گی۔

خوجی: ہم کسی نان بائی کی دکان پر کباب اور روٹی اور باقر خانی اور گوشت یا پلاؤ مول لے کے کھائیں گے مسلمانوں ہی کا تو ملک ہے۔ یہ باتیں ہو ہی رہیں تھیں کہ دو ترکی آئے اور اپنی کرسیوں پر بیٹھ کر مزے سے کھانے لگے۔

آزاد کی چڑھ بنی، پوچھا:

''کہیے خواجہ بدیع اب بول گیدی۔ یہ دو ترک مسلمان بھی یہاں بیٹھ کر کھا رہے ہیں۔ اب بھی شرمایا نہیں، مجھ سے نہ کہو، دل میں ذرا شرماؤ۔ چھٹے سے منہ ۔خوجی: نے پہلے تو کہا کہ یہ مسلمان نہیں پھر کہا شاید ہوں کوئی ایسے ویسے۔

آزاد: نے کہا، ایسے ویسے نہیں، خاص ترک ہیں اور ترکی میں سب میز کرسی پر بیٹھ کر عیسائیوں کے ساتھ کھاتے ہیں۔

خوجی: کو اس بات کا یقین نہ آیا غور سے دیکھا کیے کہا شراب ان لوگوں نے نہیں مانگی۔ اگر مسلمان ہیں تو مذہب کے خلاف کرتے ہیں ذرا ان سے بات تو کروں۔

خوجی: (ترکوں کے پاس جا کر) کیوں حضرت آپ کا نام کیا ہے؟۔

ایک ترکی: احمد آفندی۔

خوجی: دوسرے سے اور آپ کا اسم شریف۔

دوسرا ترکی: عبدالصمد۔

خوجی: دولت خانہ کہاں ہے؟۔

ایک: خاص استنبول۔

خوجی: اور آپ۔

دوسرا: میں ایڈریا نوپل کا باشندہ ہوں مگر دس بارہ برس سے سفر میں ہوں۔ ہندوستان میں دوبار رہا، کلکتہ گیا۔ بمبئی، لاہور، دہلی، چین میں رہا اور عدن میں رہا فرانس گیا، انگلستان میں چھ مہینے رہا۔

خوجی: آپ یہاں ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں۔

احمد: جی ہاں۔

خوجی: یہ شریعت کے خلاف نہیں۔

عبدالصمد: شریعت کے خلاف؟ واہ! شریعت کے خلاف کس طرح ہے؟۔

احمد: (آزاد سے) آپ کا اسم شریف؟۔

آزاد: میاں آزاد۔

احمد آفندی اور عبدالصمد دونوں اٹھ کھڑے ہوئے، ہاتھ ملایا اور کہا:

آخاہ تو آپ میاں آزاد ہیں۔

آزاد: آپ کہاں سے جانتے ہیں مجھے؟

عبدالصمد: آپ تو مشہور آدمی ہیں۔

خوجی: آہستہ سے شیطان کے بڑے بھائی یہی تو ہیں۔

احمد: آپ کا بڑا نام ہے۔

عبدالصمد: بڑی خوشی ہوئی کہ آپ سے اس وقت ملاقات ہوئی آپ بڑے جوانمرد ہیں۔

آزاد: آخر آپ سے کہا کس نے؟۔

احمد: اخبار نے۔

آزاد: ہم کون ہیں؟۔

احمد: آپ ترکیوں کی حمایت میں روسیوں سے لڑنے کے لئے ہندوستان سے یہاں آئے ہیں۔

خوجی: حیران ہوکر: آپ سے کس نے کہا؟۔

احمد: اخبار۔

عبدالصمد: آپ چل کر ہمارے ملک کے کانسل سے تو ملیے، وہ بھی آپ کے نام سے واقف ہونگے۔ضرور چلیے۔

آزاد: میں حاضر ہوں، مگر وہاں تک رسائی محال ہے۔

عبدالصمد: آپ کے لئے اور رسائی کی ضرورت۔آپ کا نام ایسا مشہور ہے کہ جہاں چاہے چلے جایئے بے جھجک ہم آپ کو لے چلیں گے۔تھوڑی دیر کے بعد آزاد نے کپڑے بدلے اور ان دونوں کے ساتھ ترکی کے کانسل سے ملنے کے لئے چلے۔

راستے میں آزاد نے کہا۔

گو میں نے ہندوستان میں ہر قسم کی تعلیم پائی ہے، اور سب باتوں کو خوب سمجھ سکتا ہوں، لیکن پھر بھی اگر کانسل سے ملنے کے خاص ادب آداب ہوں تو بتا دیجیے۔

احمد آفندی نے کہا:

کانسل بڑے سادہ مزاج آدمی ہیں، آپ چاہے سلام بھی نہ کریں، ان کو اس کی کچھ پرواہ نہیں، وہ خود ایک دن آپ کا تذکرہ کرتے تھے"۔

میاں آزاد جو وہاں پہنچے تو احمد آفندی نے جاتے ہی کہا: میاں آزاد آپ ہی ہیں۔

کانسل نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور پوچھا:

آپ عربی بول سکتے ہیں؟۔

میاں آزاد نے عربی میں جواب دیا۔

کانسل: آپ کی ملاقات سے ہم بہت خوش ہوئے۔

آزاد: عنایت ہے آپ کی۔

کانسل: جزیرہ پیرم کے پاس آپ کا جہاز غرق ہو گیا تھا۔

آزاد: جی ہاں۔

کانسل: آج ہم نے تار میں پڑھا۔

آزاد: بڑی تباہی آئی۔

کانسل: آپ کی بڑی تعریف لکھی ہے، اب آپ ترکی کب جائیں گے۔

آزاد: بہت جلد، لیکن اب جنگ کا کیا حال ہے؟۔

کانسل: اب روس نے جنگ کا اشتہار دے دیا ہے، روسی لشکر دریائے پرتھ عبور کرتا ہے، اور ہمارا توپ خانہ اکثر مقامات پر ان پر آگ برساتا ہے۔

آزاد: اف جی چاہتا ہے کہ فوراً پہنچوں۔ اب ایک منٹ کا قیام بھی مشکل لگتا ہے۔

کانسل: ہاں جلد جائیے۔

آزاد: دیکھیے جنگ کا انجام کیا ہوتا ہے؟۔

کانسل: اکثر وزیروں کو یقین ہے کہ انگلستان سے مدد ملے گی، مگر مشکل ہے ہمیں اس کی امید نہیں۔ انگلستان کا خیال یہ ہے کہ جب تک اس کا اپنا کوئی نقصان ہوتا نظر نہ آئے وہ کسی کی مدد نہیں کریں گے۔

آزاد: مگر روس بھی تو اکیلا ہے۔

کانسل: ہاں مگر فرق یہ ہے کہ وہ حملہ کرتا ہے، اور ہم حملہ روکتے ہیں۔۔۔۔

عبد الصمد: لیکن ترک جان دینے پر آمادہ ہیں، دیکھ لیجیے گا خوب لڑیں گے اور چھکے چھڑائیں گے۔

آزاد: انشا اللہ

کانسل: ہمارا ایک ایک سپاہی جان ہتھیلی پر لیے ہوئے ہے۔

آزاد: خدا ان کو مدد دے گا۔

بہت عرصہ تک کانسل، آزاد: احمد آفندی اور عبد الصمد میں ترکی کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد میاں آزاد سے کانسل نے کہا کہ آپ میرے ساتھ رہیں، آزاد نے خوشی سے قبول کرلیا۔

احمد آفندی اور عبد الصمد شام کے وقت میاں آزاد کو سکندریہ کی سیر کے لئے لے گئے، اس شہر میں میاں آزاد نے یورپ اور ایشیا کی مختلف قوموں کے لوگ دیکھے، ترکی کے اعلیٰ افسر جو وہاں تشریف رکھتے تھے، ان کی خدمت میں بھی میاں آزاد حاضر ہوئے اور جو شخص ان سے ملا تپاک ہی کے ساتھ ملا۔

حضرت خواجہ بدیع صاحب کو میاں آزاد ہوٹل ہی میں چھوڑ گئے تھے۔

خوجی نے سوچا کہ بیٹھے بیٹھے مکھیاں کب تک مارا کریں گے۔ آؤ دیکھیں کوئی ہندوستانی بھائی تو گپیں اڑیں۔ آخر کار ایک ہندوستانی سے ملاقات ہوئی، علیک سلیک کے بعد باتیں ہونے لگیں۔

خواجہ صاحب نے پوچھا؟

کیوں بھئی سکندریہ میں افیم ملتی ہے، کوئی چانڈو خانہ ہے، کہیں مدک اڑتی ہے۔ چرس کی لو آسمان کی خبر لاتی ہے یا نہیں؟۔

ایک دم سے تین چار سوال کیے اور اس بے چارے کو دم بھی نہ لینے دیا، وہ ان کے بھی استاد نکلے، کسی بات کا جواب ہی نہ دیا۔

خوجی تیکھے آدمی، ان کو بھلا یہ تاب کہاں کہ کسی سے سوال کریں اور وہ جواب نہ دے۔ بگڑ کھڑے ہوئے۔

قسم خدا پاک کی بس اس وقت لاش پھڑکتی ہوتی۔ واللہ لاش پھڑکتی ہوتی، ہونہہ خواجہ بدیع کو وہ کیا سمجھے ہیں، نہ ہوئی قرولی ورنہ تماشا دکھا دیتا۔

وہ بے چارہ سمجھا کہ پاگل ہے، اگر بولوں گا تو خدا جانے کاٹ کھائے۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ چپکے رہو، اس کی چپ سے میاں خوجی سمجھے کہ دب گیا ہے، یہ اور بھی اکڑ گئے، اس نے جو اس دیوانے کو اکڑتے دیکھا تو ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ پیچھے ہٹنا تھا کہ میاں خوجی اور بھی شیر ہوئے۔ مگر کندھے تول تول کے رہ جاتے تھے۔

پوچھا:

بھلا ٹھنڈا پانی یہاں مل سکتا ہے، مگر اس قدر سرد ہو کہ دانتوں کو لگے۔

وہ جھٹ پٹ ٹھنڈا پانی لایا، خوجی نے پیا تو آب حیات کا مزہ پایا۔

موج میں آ کر بولے:

مانگ کیا مانگتا ہے۔

اللہ اللہ اب خوجی اپنے وقت کے بادشاہ ہو گئے، کہتے ہیں مانگ کیا مانگتا ہے۔ ''اف رے تیری سخاوت'' اس آدمی کو اور یقین ہو گیا کہ اس شخص کے دماغ میں ضرور خلل ہے، اپنی حالت تو ان کی اس قدر ردی ہے، اور حاتم کی قبر پر لات مارنے کو تیار ہیں۔ اس سے مانگوں تو کیا مانگوں، ٹکا تو اس کے پلے ہے نہیں۔

خوجی نے پھر اکڑ کر کہا:

مانگ کچھ، جو چاہے سو مانگ۔

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا یہ جو ہاتھ میں ہے دے دیجیے۔

خوجی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا:

ارے غضب، ظالم، خدا تجھ سے سمجھے، جان تک مانگتا تو میں دریغ نہ کرتا، چنیا بیگم نہیں دی جاتی۔

اس کو اگر اتنا معلوم ہو جاتا کہ حضرت خواجہ صاحب کے ہاتھ میں افیم ہے اور افیم پر حضرت ہزار جان سے عاشق ہیں، تو کچھ اور مانگتا۔

خوجی نے اس شخص سے پوچھا کہ تم یہاں کب سے ہو، کیا کام کرتے ہو؟ نام کیا ہے۔ باشندے کس صوبے کے ہو؟۔

اس نے جواب دیا:

حضرت میں یہاں ہوٹل میں نوکر ہوں، میرا نام تہور خان ہے۔

امروہے کا رہنے والا ہوں۔

خوجی: اخاہ یہ امروہہ،، یہی امروہہ ہے نا۔

تہور خان: یہ کون؟۔

خوجی جھلا کر: اجی یہی۔۔۔۔۔لاحول۔۔۔۔مراد آباد کے پاس جو ہے نا۔

تہور خان جی ہاں۔

خوجی: یہاں کب سے ہو؟

تہور: ابے سینا کی لڑائی کے وقت سے۔

خوجی: بھلا اس ہوٹل میں مسلمان بھی کھانا کھاتے ہیں؟۔

تہور: کھاتے ہیں۔

خوجی: ہم تو نہ کھائیں۔

تہور: پہلے تو میں سمجھا تھا کہ آپ کوئی پاگل ہیں، مگر اب تسلی ہوئی۔

خوجی نے وہ وہ پاگل پن کی حرکتیں کیں کہ ہوٹل والوں کو دل لگی ہاتھ آئی، بگڑے دل تو ہر شہر ہر ملک میں ہوتے ہیں، دو ایک دل لگی بازوں نے صلاح کی کہ میاں خوجی کو چھیڑنا چاہیئے۔اس ہوٹل میں ایک شخص اس کام پر مقرر تھا کہ پنکھا قلیوں کی نگرانی کرے۔یہ شخص بونا تھا اور خاص قاہرہ کا رہنے والا تھا۔لوگوں نے سوچا کہ اس بونے اور خوجی میں کشتی ہو تو خوب بات ہے۔بونا بڑا شریر آدمی تھا۔پرلے سرے کا شہدا۔لوگوں نے اس سے جا کر کہا، چلو تمہاری کشتی بدی گئی ہے۔

بونا چلو چلو:

لوگ: وہ دیکھو ایک آدمی ہندوستان سے آیا ہے۔

بونا: جوڑ تو اچھی ہے۔

لوگ: پھر جٹ جاؤ۔

یہ سن کر بونا خوجی کے پاس گیا اور جھک کر سلام کیا، خوجی نے جو دیکھا کہ ایک شخص سے ہم بھی اونچے ہیں، تو اکڑ کر اور اینڈ کر آنکھوں سے سلام کا جواب دیا۔ بونے نے اپنے دل میں سوچا کہ ٹھہر جا، جاتا کہاں ہے، ادھر ادھر دیکھ کر ایک دفعہ ہی موقع جو پایا تو میاں خوجی کی ٹوپی اتار کر چٹاخ سے ایک دھول جمائی، اور ٹوپی پھینک کر بھاگا۔ مگر ذرا ذرا سے پاؤں، بھاگ کر کہاں جاتا۔ خوجی بھی جھپٹے ، آگے آگے بونا پیچھے پیچھے میاں خوجی:

اوگیدی نہ ہوئی قرولی۔ واللہ اس دم بھونک ہی دیتا، سچ سے قرولی بھونک ہی دیتا۔

تھوڑی دیر بعد بونے نے کہا اب سانس نہیں لی جاتی۔ خوجی نے لپک کر ہاتھ پکڑ لیا۔

خوجی: کیوں بے؟۔

بونا: (منہ چڑھانے لگا)

خوجی: اب بولو۔

بونا: (پھر منہ چڑھایا)

خوجی: اتنے میں خوجی کو غصہ آیا تو حضرت نے بھی ایک دھپ جڑی اور چٹاخ کی آوز گونجنے لگی۔

خوجی: اور لے گا۔

بونا: (اپنی زبان میں) چھوڑ نہیں تو مار ہی ڈالوں گا۔

خوجی: ہات تیرے کی۔

بونا: آج رات کو گلا گھونٹوں گا۔

خوجی: (دھپ جما کر) او گیدی۔

بونا: دو ہوئیں۔

خوجی: دے ماروں اٹھا کر۔

بونا: رات ہے اور تم اور میں۔

خوجی: (گھونسا دکھا کر) ہات تیرے کی۔

خوجی نے جھلا کر بونے کو اٹھا کر دے مارا، چاروں شانے چت۔

خوجی: اکڑ کر وہ مارا، اور لے گا۔ خوجی سے یہ باتیں۔

بونے کی شرارت

میاں آزاد احمد آفندی کے ساتھ ہوٹل میں آئے، اسباب لیا اور خوجی سے کہا:

"آج رات کو یہاں ٹھہرو۔ میں کانسل کے یہاں مدعو ہوں، جب جہاز پر سوار ہوں گا تو تم کو بھی بلالوں گا۔

خوجی اس وقت زمین پر قدم نہیں رکھتے تھے، عمر بھر میں آج پہلی مرتبہ انہوں نے کسی شخص کو نیچا دکھایا تھا۔

خوجی: اس وقت ایک کشتی اور نکالی۔

آزاد: کشتی کیسی؟۔

خوجی: کشتی کیسی، کیا معنی کیسی ہوتی ہے؟۔ کشتی؟۔

آزاد: معلوم ہوتا ہے پٹے ہو۔

خوجی: اس پٹنے والے کی ایسی تیسی اور کہنے والے کو کیا کہوں؟۔

آزاد: کشتی نکالی۔

خوجی: (تہور سے) ارے میاں بولتے کیوں نہیں۔

تہور: ہاں حضور یہ سچ کہتے ہیں۔

خوجی: لو۔

آزاد: تہور سے کیا ہوا کیا؟۔

تہور: جی یہاں ایک بونا ہے، اس نے ایک دھول لگائی تھی۔

آزاد: دیکھا نا میں تو سمجھا ہی تھا کہ پٹے ہوں گے۔

خوجی: سن تو لو۔

تہور: بس ڈھول کھا کر یہ لیکچے، اس کو کئی چپتیں لگائیں اور اٹھا کر دے پٹخا۔

خوجی: وہ پٹخنی بتائی ہے کہ یاد ہی تو کرتا ہوگا، دو مہینے تک کھٹیا سے نہ اٹھ سکے گا۔

خوجی: ہوا تو چلنے دو۔ غرض آزاد اسباب لے کر احمد آفندی کے ساتھ کانسل کے ہاں گئے۔

رات کو میاں خوجی ہوٹل میں سوئے، کوئی نو بجے رات کو اٹھے، تو دیکھا لیمپ گل ہو گیا ہے۔

انھوں نے پکارا:

کوئی ہے پانی پلاؤ۔

ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ پانی دیا، گلاس لے کر خوجی نے پیا اور لیٹ رہے، اتنے میں کمرے میں چٹاخ کی آواز گونجی، ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ آواز کیسی تھی۔ یہ میاں خوجی کی کھوپڑی پر ڈھول لگی تھی۔ آگ بھبھوکا ہو کر خوجی اٹھے تو دیکھا کہ ایک بونا بھاگا جاتا ہے۔

خوجی: ارے لاحول۔ یہ وہی بونا معلوم ہوتا ہے۔ پانی اسی نے پلایا تھا۔ اور چپت بھی اسی نے جڑی، او گیدی۔ کیا تڑ کا نہ ہوگا، ذبح کر کے نہ رکھ دوں تو سہی۔

یہ کہہ کر خوجی کمرے میں آئے تھوڑی دیر میں ایک شخص نے جس کے ہاتھ میں قیمتی لال ٹین تھی۔ خوجی کے کمرے کا دروازہ کھولا، خوجی اٹھ بیٹھے۔

خوجی: او گیدی پھر آیا؟۔

اس شخص نے تہور خان اور دو تین اور ساتھیوں سے پوچھا کہ:

یہ کون ہیں؟۔

لوگوں نے بیان کیا کہ:

کوئی پاگل سا معلوم ہوتا ہے۔

خوجی نے اشارے سے بتایا کہ وہ بونا مجھ کو تنگ کرتا ہے۔ تہور خان کو اس شخص نے حکم دیا کہ جو کچھ یہ کہتا ہے، اس کا ترجمہ کرکے ہمیں بتاؤ۔ یہ شخص ہوٹل کا منیجر تھا غل کی جو آواز سنی تو آیا کہ دیکھوں کیا ماجرا ہے؟۔ بونا بلوایا گیا، اسے آتے ہی منیجر نے اپنے ہاتھ سے ایک تھپڑ لگایا۔

اب سنیئے ادھر تو منیجر آیا اور ادھر خواجہ بدیع کو دست آنے شروع ہوگئے، وجہ یہ کہ پانی میں بونے نے جمال گوٹا ملا دیا تھا۔ ہوٹل کے نوکروں نے منیجر کو جگایا۔

منیجر: کیا ہے؟۔

نوکر: ایک آدمی بیمار ہو گیا ہے۔

منیجر: کیا ہیضہ ہوا ہے؟۔

نوکر: جی نہیں دست آتے ہیں، اب تک کوئی گیارہ دفعہ گیا ہے۔

منیجر: وقت کیا ہے؟۔

نوکر: دو بجے ہیں۔

منیجر: تم لوگ برطرف کرنے کے قابل ہو۔ اب تک اطلاع کیوں نہ دی۔

نوکر: اس دن جگایا۔

منیجر: چپ، سور۔ کلرک سے کہو، ڈاکٹر صاحب کے نام خط لکھے۔ کلرک نے

ڈاکٹر صاحب کے نام خط لکھا۔ایک گھنٹے میں تشریف لائے۔

ڈاکٹر: اس کو کسی نے جمال گوٹا دے دیا ہے، برا حال ہے، دست بہت آئے۔

مینجر: پھر اب۔

ڈاکٹر نے نسخہ لکھا اور حکم دیا کہ ابھی دوا لاؤ اور پلاؤ۔

ترکی کے کانسل کے یہاں میاں آزاد ایک صاف شفاف اور وسیع کمرے میں آرام کر رہے تھے کہ اچانک ایک گھنٹی اس زور سے بجی کہ میاں آزاد کی آنکھ کھل گئی۔اور انھوں نے سنا کہ کوئی انھیں کمرے کے باہر بلاتا ہے۔

پوچھا: کون ہے؟۔

کہا:

حضور کا خادم ہے۔ہوٹل سے ایک آدمی آیا ہے اور آپ کو بلاتا ہے۔

میاں آزاد نے کہا، لاحول ولاقوۃ:۔مدت کے بعد آرام سے سونا نصیب ہوا تھا۔اس خوجی کے سبب سونے نہ پائے۔بلاؤ صاحب بلاؤ۔وہاں پھر جھگڑے ہوں گے۔عجب پاگل ہے نالائق خدا سمجھے اس سے۔

میاں آزاد اٹھ کر باہر گئے تو دیکھا کہ دو آدمی کھڑے ہیں، ایک کانسل کا نوکر جسے اس نے میاں آزاد کی خدمت کے لئے مقرر کیا تھا۔اور دوسرا کوئی اجنبی جس کو میاں آزاد نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

آزاد: اپنے دل میں ہم تو سمجھے تھے کہ میاں خوجی ہوں گے۔

اجنبی: ہوٹل سے آیا ہوں مینجر نے بھیجا ہے۔اور یہ چٹھی دی ہے۔

آزاد نے خط پڑھا تو رنگ فق ہو گیا لکھا تھا:

مسٹر آزاد:

جس شخص کو آپ یہاں چھوڑ گئے تھے۔وہ گیارہ بجے رات بیمار ہو گئے ہیں۔اب تک چودہ دست آ چکے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ اگر دو چار دست اور آئے تو یہ مر جائیں گے۔آپ آئیے ،آپ کے دوست کی بھی یہی خواہش ہے۔ہمارے نزدیک اب یہ بڈھا آدمی دو ہی چار گھنٹے کا مہمان ہے۔

آپ کا دوست

مینجر ہوٹل۔

آزاد: اپنے دل میں اور سنیئے،اچھا رنگ لائے چلتے چلاتے دغا دے گئے۔اب نہ بچیں گے۔جب ڈاکٹر نے جواب دے دیا تو اب کیا ہو سکتا ہے ۔افسوس،

نوکر: حضور گاڑی بھی لیتا آیا ہوں۔

آزاد: ہم کپڑے پہن لیں تو ابھی چلتے ہیں،کپڑے پہن کر آزاد گاڑی پر سوار ہوئے،گھوڑے ہوا ہوئے،اور دن سے ہوٹل میں داخل،میاں آزاد نے دیکھا کہ خوجی لیٹے ہیں اور مینجر اور ڈاکٹر سرہانے کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔

آزاد کو دیکھ کر خوجی نے سلام کیا اور کہا:

الوداع،،،،،،خدا کرے تم ترکی سے سرخرو آؤ،حسن آرا بیگم کو نکاح میں لاؤ۔

پھر تین بار کلمہ پڑھا۔لا اللہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

آزاد: ڈاکٹر سے (انگریزی میں) بچنے کی امید ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر: بہت کم۔

آزاد: مرض کیا ہے، ہیضہ ہے، اچانک ہوا کیا؟۔

ڈاکٹر: کسی نے جمال گوٹا دے دیا ہے۔

مینجر: جی نہیں دست آگئے کسی وجہ سے، مگر بچنا محال ہے۔

آزاد: افسوس کہاں پر ساتھ چھوٹا۔

خوجی نے آزاد سے منت سماجت کر کے کہا:

اس وقت کسی سے سورہ یاسین پڑھوایئے۔

آزاد نے مینجر سے کہا:

کسی حافظ کو بلوایئے۔

چنانچہ ایک شخص یمن کا باشندہ ملا فرقان بلوائے گئے۔ خوجی کے قریب بیٹھ کر انہوں نے سورۃ یاسین قرات کے ساتھ پڑھنی شروع کی،

آزاد: لاکھوں عیب اس شخص میں ہیں مگر اپنے مذہب کا پکا، شرع کا پابند، روزہ دار۔ مگر افسوس،،،، (خوجی سے گھبراؤ نہیں) اجی تم دو دن میں اچھے ہو جاؤ گے سمجھے۔

خوجی: اجی میں مروں یا جہنم میں جاؤں، مگر بھائی خدا کے واسطے ذرا اپنی جان کا خیال رکھنا، ایسا نہ ہو کہ کوئی جلتا ہوا ور تم آگ میں کود پڑو۔ خدا تمہارا حافظ و ناصر ہے، ہم تو اب چلتے ہیں، خطا معاف، اب تک ہنسی خوشی تمہارا ساتھ دیا۔ اب مجبوری ہے۔

صبح کے وقت میاں آزاد خوجی کو کانسل کے ہاں لے گئے اور کہا کہ:

یہ شخص میرا پرانا دوست ہے۔ جب میں ہندوستان سے چلا تو اس نے میرا

ساتھ دیا۔ اب یہاں آ کر سخت بیمار ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر کی رائے ہے کہ اگر دو چار روز میں بچ گیا تو خیر، ورنہ اس کے مرجانے میں شک نہیں، اگر آپ کو تکلیف نہ ہو اور اجازت دیں تو اس کو یہاں چھوڑ جاؤں۔ اگر صحت پائے تو آپ اسے جہاز پر واپس ہندوستان بھیجے گا، بے حد شکرگزار رہوں گا۔

کانسل نے کہا۔ یہ بات کتنی بڑی ہے، جو آپ اس قدر منت سماجت کرتے ہیں۔ آپ ان کو یہاں چھوڑ جایئے، دو آدمی ان کی خدمت کے لئے رہیں گے۔ ڈاکٹروں کی کمی نہیں، ہر طرح کے آرام کے ساتھ باقی عمر بسر کریں گے۔ آپ مطمئن رہیئے۔ اب آپ کے لئے بہتر یہی ہے کہ آپ جلد جایئے، اور ضرور جایئے۔ دریائے پرتھ کو روسی لشکر عبور کرنے کو ہے۔ بڑی سخت جنگ ہوگی خدا خیر کرے۔ دیکھیے کیا انجام ہوتا ہے۔

آزاد نے خوجی کو سمجھایا کہ اب مجبور ہو کر ہم کو تمھارا ساتھ چھوڑنا پڑ رہا ہے۔ کل صبح کو جہاز روانہ ہوگا، تم یہاں رہو اور چین کرو۔ دو آدمی تمہاری خدمت کے لئے مقرر ہونگے۔ ڈاکٹر صبح شام آ کر دیکھیں گے تمہارا نقصان ہی کیا ہے؟۔

خوجی: مجبوراً رہنا ہی پڑے گا۔ اگر نہ رہوں تو کیا کروں؟۔ آج مرا کل دوسرا دن، یہ تو بے حیائی کا جینا ہے۔ ایسے جینے پر خدا کی لعنت، یہاں چاہے دس خدمت گار رہوں، چاہے نہیں، بے کار ہیں مگر آب و دانہ کی بات ہے۔ ہم کو یہاں کی مٹی گھسیٹ لائی ہے۔

آزاد: اجی نہیں۔

خوجی: نہیں کیا معنی؟

آزاد: آج کے چوتھے روز دندناؤ گے۔ دیکھ لینا ڈنڑ پیلتے ہو گے۔

خوجی: خدا کے اختیار میں ہے۔

آزاد: تمہارا مکان کہاں ہے خواجہ صاحب؟۔

خوجی: میں اصل باشندہ گجرات کا ہوں، مگر لکھنو، کان پور، آگرہ اس طرف رہنے کا زیادہ اتفاق ہوا ہے۔

آزاد: ارے یار دیکھیے کب ملاقات ہوتی ہے؟۔

خوجی: ایک بات یاد رکھنا کہ ترکی میں سب سے مل جل کر رہنا، شکر رنجی نہ ہونے پائے، واسطے خدا کے اتفاق سے رہنا، لڑائی جھگڑے کا کوئی فائدہ نہیں اور کبھی خواجہ بدیع کو بھی یاد کر لینا۔ ہائے افسوس یار یہ جدائی ایسی شاق گزر رہی ہے کہ بس کیا بیان کروں؟۔

آزاد: جب بیماری سے صحت پاؤ تو ہندوستان چلے جانا۔

خوجی: ارے میاں دم کا بھروسا نہیں ہے۔ خوجی سے رخصت ہونے کے بعد میاں آزاد روانہ ہونے کو تھے کہ خوجی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہا کہ:

صحت پانے کے بعد میں کیا کروں گا؟۔

کانسل نے تسلی دی اور کہا کہ آپ گھبرائیے نہیں ہم آپ کے لئے ہر قسم کا بندوبست کر لیں گے، آپ مسٹر آزاد سے کچھ نہ کہیئے، اگر آپ اچھے ہو گئے تو ہم آپ کو آپ کے وطن آرام کے ساتھ بھیج دیں گے خوجی کو اس بات سے بڑی خوشی ہوئی۔ آزاد سے ہاتھ ملایا اور روتے روتے کہا کہ اب رخصت کے وقت دو باتیں اور سن لیجیے:

ایک یہ کہ وہاں سب کے ساتھ مل جل کر رہنا۔

دوسرے یہ کہ اپنی جان بلاوجہ خطرے میں نہ ڈالنا۔

آزاد رخصت ہو کر جہاز پر سوار ہوئے اتنے عرصے بعد خواجہ صاحب کی جدائی ان کو سخت شاق گزری، تنہائی میں طرح طرح کے خیالات دل میں جگہ پاتے تھے، سوچا کہ ترکی میں پہنچ ہی جائیں گے اور کانسل نے جو بڑے خطوط بڑے بڑے افسروں اور امیروں کے نام لکھ دیے ہیں، ان کے ذریعے سے کوئی نہ کوئی عہدہ بھی ضرور پائیں گے۔ مگر یقین نہیں آتا کہ حسن آرا سے شادی ہو سکے گی۔ چنے کے برابر ایک گولی کام تمام کر دے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد اٹھے اور پھر سو رہے۔ پھر اٹھے، ادھر ادھر کی سیر کی، صبح ہوئی، شام ہوئی، ایک مرتبہ سوئے تو خواب میں دیکھا کہ حسن آرا بیگم کے دروازے پر یہ پہنچے، اچانک کسی نے توپ داغی، اور ان کی آنکھ کھل گئی۔

جہاز کے کپتان نے کہا لیجیے قسطنطیہ پہنچ گئے۔

آزاد قسطنطیہ کے نام سے ایسے خوش ہوئے کہ پھولے نہ سمائے، خدا کا شکر بجا لائے کہ قسطنطیہ تک زندہ تو آئے۔

میڈا کی سازش

آزاد خدا خدا کرکے قسطنطنیہ میں پہنچے تو مالٹا کے تاجر (جس نے انہیں رقعہ دیا تھا) کے بیٹے ہرمز جی بھائی ہرمز جی بھائی کی کوٹھی کا پتا پوچھتے چلے۔ یہ لیجیے ہرمز جی کا مکان آیا، یہ سامنے والی کوٹھی انھیں کی ہے، میاں آزاد گاڑی پر سے اترے اور ہرمز جی کے بھائی کے پاس ایک آدمی کے ذریعے سے اپنا کارڈ بھیجا، کارڈ دیکھ کر ہرمز بھائی جی نے انہیں بلوالیا۔ ہاتھ ملایا اور بڑے تپاک سے بٹھایا۔

آزاد نے جاتے ہی ان کے والد کی چٹھی دی، پڑھ کر ہرمز جی بھائی اور بھی تپاک سے پیش آئے۔

بولے:۔

آپ کا گھر ہے۔ میں آپ کا خادم ہوں؛

خدمت گار کو حکم دیا کہ:

پانچ کمرے آپ کے واسطے آراستہ کردو۔ ایک ڈرائنگ روم، بیٹھنے اور ملاقات کے لئے، ایک سونے کا کمرہ، ایک باتھ روم غسل کے واسطے، ایک سٹڈی روم پڑھنے کے لئے اور ایک کمرہ گودام کے لئے۔

خدمت گار نے پانچوں کمرے آدھ گھنٹے میں آراستہ کردیے۔

ہرمز جی بھائی نے میاں آزاد کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ:

آپ بڑے اہم کام کے لئے آئے ہیں، ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ آپ کی دلی مراد بر آئے گی، آپ تمغہ پائیں گے۔ اور سرخرو ہو کر میدان جنگ سے

ہندوستان واپس جائیں گے، آپ کو جس شے کی ضرورت ہو مجھ سے فرمایئے، جس بات میں صلاح کی ضرورت ہو بے تکلف زبان پر لایئے۔ میرے والد صاحب آپ کے بے حد مداح ہیں۔ میرے پاس کل ان کا ایک خط آیا تھا، اس میں بھی آپ کا ذکر تھا، مگر نام نہ درج تھا، ورنہ کارڈ دیکھتے ہی میں حاضر ہو جاتا۔

اس نوجوان پارسی سوداگر نے اپنے باپ کی مرضی اور حکم کے مطابق میاں آزاد کی بڑی خاطر کی، رات کو آزاد بڑے آرام کے ساتھ سوئے۔ صبح اٹھ کر غسل کیا، کپڑے پہنے اور باغ میں ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگے۔

اس باغ میں آزاد کی ملاقات ایک خوب صورت خاتون سے ہوئی، جس کا نام میڈا ہے۔ وہاں کے ایک بڑے باعزت گھرانے کی بیٹی ہے، میڈا کا باپ ترکی کے وزیر جنگ کا خاص دوست ہے۔ اس لیے میڈا بھی وزیر جنگ سے بڑی اچھی طرح واقف ہے۔ چند ایک بار کی ملاقاتوں کے بعد میڈا آزاد سے کہتی ہے کہ وہ اس سے شادی کر لے، مگر آزاد ٹال جاتا ہے۔ اس بات پر میڈا آزاد سے ناراض ہو جاتی ہے اور اس کو دھمکی دے جاتی ہے کہ تم پچھتاؤ گے۔)

دوسرے روز میاں آزاد نے جنگی وردی پہنی، شمشیر کمر سے لگائی، اور پارسی سوداگر کے خوب صورت گھوڑے پر بیٹھ کر حضرت حمید پاشا وزیر جنگ سے ملنے کے لئے چلے۔ راہ میں ہر شخص میاں آزاد پر نظر ڈالتا تھا، جو دیکھتا تھا گھنٹوں تعریف کرتا تھا۔

ایک شخص: بھئی کیا گبھرو جوان ہے۔ خدا ہر آفت سے بچائے۔

دوسرا: آمین۔

تیسرا: گھوڑے پر کیا خوب سوار ہوتا ہے، معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے میخ گاڑ دی ہو۔

چوتھا: کتنا خوش رو جوان ہے، یہ تو کسی فوج کا کپتان معلوم ہوتا ہے۔

پانچواں: گھوڑا تو گھوڑ اسوار بھی عجب سج دھج کا ہے۔

چھٹا: ۔اجی یہ وہی میاں آزاد ہیں، جن کا حال اخبار الجوائب میں درج ہے۔

ساتواں: سچ کہا واقعی یہ وہی نوجوان ہے، خدا کرے جنگ میں کام یاب ہو۔

آٹھواں: خدا کرے خدا کرے۔

نواں: آمین۔

میاں آزاد وزیر جنگ کے دفتر پہنچے تو جو خط ترکی کے کانسل نے سکندریہ میں ان کو دیا تھا، وہ انھوں نے بھیج دیا اور کہا کہ:

عرض کرو وہ بھی حاضر ہے۔

حمید پاشا نے خط پڑھا اور میاں آزاد کو بلوایا۔آزاد نے جا کر آداب عرض کیا، اور ادب کے ساتھ خاموش کھڑے رہے۔

حمید پاشا: آپ ہی ہندوستان سے آئے ہیں، جن کی کانسل نے بڑی تعریف کی ہے، بیٹھیے!

آزاد: ہاں حضور فدوی کا نام ہی آزاد ہے۔

حمید پاشا: جہاز والے واقعہ نے آپ کو اور بھی مشہور کر دیا۔

آزاد: حضور میں نے تو صرف وہ کام کیا، جو ہر ایک انسان کو لازم ہے۔

حمید پاشا: مگر ہر ایک انسان انسان نہیں ہے۔بعض آدمی جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔آپ سچے ہمدرد ہیں۔

آزاد: آداب بجالا کر) حضور کی نوازش ہے۔

حمید پاشا: تو آپ یہاں کیا چاہتے ہیں، نوکری؟۔

آزاد: حضور میری دلی خواہش ہے کہ مجھے محکمہ جنگ کا کوئی عہدہ ملے۔

حمید پاشا: تمھاری شکل وصورت اور گفتگو سے پایا جاتا ہے کہ تم ایک تربیت یافتہ، بلند ارادہ اور حوصلہ مند جوان ہو۔اور بہادر اور عالی خاندان ہو۔ جنگ کی کیفیت یہ ہے کہ روسیوں نے جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔اور یہ تو ہم پہلے سے ہی جانتے ہیں، کئی مہینوں سے معلوم تھا کہ روسی ضرور لڑیں گے، میں غور کروں گا کہ تمہارے لائق کون سا عہدہ ہے؟۔جنگی امور سے واقف ہو؟۔

آزاد: ہاں حضور کئی کتابیں پڑھی ہیں۔جنرل والٹر کو میں عربی پڑھاتا تھا اور وہ مجھ کو جنگی علم کے رسالے پڑھاتے تھے۔مصنوعی جنگ میں کئی بار شریک ہو چکا ہوں۔یہ جنرل والٹر کا سرٹیفکیٹ ہے۔

حمید پاشا نے سرٹیفکیٹ لے کر پڑھا اور کہا:

کافی ہے، ہم آپ کو عہدہ دیں گے۔دو ایک روز میں آپ آئیں۔

آزاد آداب بجالائے اور پھر گھوڑے پر سوار ہو کر چلے۔ہندوستان سے روانہ ہوتے وقت آزاد کو اندیشہ تھا کہ ہوسکتا ہے ترکی میں کوئی عہدہ نہ ملے۔مگر جنرل والٹر کے سرٹیفکیٹ اور ان کی ڈنڈ بل، شجاعت، بہادری اور عالی خاندانی کی وجہ سے وزیر جنگ اتنے متاثر ہوئے کہ فوراً عہدہ دینے کا اقرار کرلیا۔

اسی رات جب اندھیرا چھا گیا تو ایک عورت برقع پہنے ہوئے وزیر جنگ کے پاس آئی۔

وزیر فرمایئے۔

عورت: ہندوستان سے کوئی شخص آزاد نام کا آیا ہے۔

وزیر: ہاں یاد آیا، بے شک آیا ہے، بڑا خوب صورت، بہادر اور لائق آدمی ہے۔

عورت:۔وہ یہاں کس غرض سے آیا ہے بھلا؟۔

وزیر: اسلام کی محبت اسے یہاں لائی ہے، وہ جنگ میں شریک ہونا چاہتا ہے۔

عورت: آپ اس کو کوئی فوجی عہدہ دیں گے؟۔

وزیر: ضرور بالضرور اور بہت جلد۔

عورت: میں یہ کہنے آئی ہوں کہ اسے کوئی عہدہ نہ ملے۔

وزیر جنگ حیران ہو کر کہ یا خدایا یہ کون برقع پوش عورت ہے اور کیا چاہتی ہے ۔اور کیوں کہتی ہے کہ میاں آزاد کو کوئی عہدہ نہ ملے، سمجھے کہ دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔

وزیر جنگ نے کہا کہ:

محترم خاتون: تمھاری وضع اور بول چال سے اور پوشاک سے صاف ظاہر ہے کہ تم ایک معزز اور عالی خاندان سے تعلق رکھتی ہو، مگر اس پوشیدہ طرز پر تم نے مجھ سے ملاقات کیوں کی؟۔اور آزاد کے تم خلاف کیوں ہو؟۔اگر وہ مسلمان نہیں

ہے اور روسیوں کی طرف سے سازش کر کے آیا ہے،تو صاف صاف بتادو۔

لیڈی نے کہا:

یہ شخص خاص یورپین ہے۔وارسا کا رہنے والا ہے۔اس کا باپ سوداگر تھا،مگر کارخانے میں آگ لگ گئی،اور لاکھوں روپے کا مال جل بھن کر خاک سیاہ ہو گیا۔اس شخص کو گورنمنت روس نے ہندوستان بھیجا۔وہاں یہ پانچ سال تک رہا، اس کے بعد ایران میں تین سال تک فارسی سیکھی،عرب میں بھی کئی سال قیام رہا،فرانسیسی خوب بولتا ہے اور عالم آدمی ہے۔میں نے خبر پائی ہے کہ گورنمنٹ روس نے جن آدمیوں کو اس لئے بھیجا ہے کہ ترکی کے حالات دریافت کر کے لکھ بھیجیں،ان میں سے یہ بھی ایک ہے۔یہ شخص اس قابل نہیں کہ یک دم آزادی کے ساتھ رہنے پائے۔

وزیر جنگ بڑے استقلال کے ساتھ ساری داستان جو لیڈی نے اس وقت کھڑے کھڑی تھی،سنتے رہے،جب وہ کہہ چکی تو وزیر جنگ نے کہا:

آپ ایک معزز خاتون معلوم ہوتی ہیں،میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ غلط کہتی ہیں،مگر چونکہ یہ سیاسی امور ہیں،لہذا اس قدر کہنا ضروری ہے کہ جب تک کسی اور معتبر آدمی کے ذریعے اس خبر کی تصدیق نہ ہو جائے مجھے ہرگز یقین نہیں آسکتا کہ آزاد اس قسم کا آدمی ہو؟۔

یہ سن کر وہ خاتون کھڑی ہوگئی اور قہقہہ لگا کر چہرے سے نقاب الٹ دیا۔

وزیر:میڈا۔

میڈا:اب یقین آیا کہ نہیں؟۔

وزیر: وہ روسی ٹھہرا کہاں ہے؟۔

میڈا: عزیز بھائی کی کوٹھی میں۔

وزیر: اچھا اب تم جاؤ، میں تمہارا شکر گزار ہوں۔تمہارے باپ سے میری بڑی دوستی ہے۔یہ داستان تم سے کس نے بیان کی ہے۔

میڈا: جس شخص نے مجھ سے کہی وہ آزاد کا بڑا رازدان ہے، نام نہ بتاؤں گی۔

وزیر: اس قدر تسلی دے دو کہ وہ شخص معتبر ہے۔

میڈا: نہایت معتبر۔

وزیر: تمہارا ذمہ۔

میڈا: بے شک۔

میڈا وزیر جنگ کو پٹی پڑھا کے رخصت ہوئی، دل میں سوچتی جاتی تھی کہ اب میں نے اپنا بدلہ لے لیا ہے۔اسے سمجھا دیا تھا کہ دیکھو کہا مانو، ورنہ پچھتاؤ گے مگر وہ نہ مانے تو ہم کیا کریں؟۔

گرفتاری

گو میڈا نے میاں آزاد کی تباہی میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی مگر بار بار سوچتی کہ برا کیا، بہت ہی برا کیا۔ایک بے گناہ بے چارے کو مفت میں ضرر پہنچایا۔ ہندوستان میں اس قدر دور دراز ملک سے آیا ہے، کہ ترکوں کی طرف سے لڑے ،جان جائے یا رہے۔ایسے شخص کے ساتھ میں ایسی بے رحمی سے پیش آئی، بار بار میڈا کے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ وہ جا کر وزیر جنگ سے کہہ دے کہ آزاد بے گناہ ہے۔مگر پھر سوچتی کہ وزیر جنگ سے صاف صاف کہہ دیا تو بڑی بدنامی ہوگی۔

میاں آزاد بے چارے ہرمزجی کی کوٹھی میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے، انہیں کیا خبر تھی کہ میڈا نے ستم ڈھایا ہے، بہتان کا طوفان باندھا ہے۔وہ بے حد خوش وخرم تھے کہ اب عہدہ پایا، یوں لڑیں گے اور یوں مقابلہ کریں گے۔اور دشمن کو نیچا دکھائیں گے،اور تمغے لٹکائیں گے، ہندوستان تک نام ہوگا۔

میاں آزاد یہ سوچ ہی رہے تھے کہ چند افسر ہرمزجی کی کوٹھی پر آئے اور دریافت کیا کہ یہاں آزاد نام کا کوئی شخص آیا ہے؟۔آزاد نے جو اپنا نام سنا تو باہر نکل آئے۔دیکھا کہ چند جنٹل میں کوٹھی کے احاطے میں زینے کے پاس کھڑے ہیں۔

آزاد: جی آزاد میرا ہی نام ہے۔

افسر: وہ جو ہندوستان سے آئے ہیں۔

آزاد: جی ہاں میں وہی ہوں۔آپ صاحبوں کا گورنمنٹ سے کوئی تعلق ہے؟۔

افسر: بالکل نہیں اور آپ کا۔

آزاد: میں تو نیا نیا ہی آیا ہوں، حضرت وزیر جنگ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا تھا۔خیال ہے کہ کوئی عہدہ عنقریب مل جائے گا،

ان میں سے ایک نوجوان ترکی افسر نے سر ہلایا جس کے معنی یہ تھے کہ مل چکا، جاسوسوں کو عہدے نہیں ملا کرتے ۔

افسر: آپ نے حمید پاشا سے جو کچھ کہا تھا، اس کا ثبوت دے سکتے ہیں ۔

آزاد: ثبوت کیسا؟۔

افسر: کسی برٹش (برطانوی) گورنمنٹ یا کسی اور یورپین گورنمنٹ کی نوکری کی ہے؟۔

آزاد: کبھی نہیں ۔افسر چلے گئے ۔

میاں آزاد کوٹھی کے ایک کمرے میں بیٹھے تھے کہ دفعتہً وہی افسر جن سے ابھی ابھی گفتگو ہوئی تھی، آئے اور ایک افسر نے آزاد سے کہا کہ

تم قیدی ہو۔

آزاد: چونک کر کیا؟۔

افسر: آپ قید کر دیئے گئے ۔

آزاد: کیا؟۔

افسر: قید۔

آزاد: قید۔

افسر: ہاں

آزاد: وجہ؟۔

افسر: حکم

آزاد: کس کا۔

افسر: گورنمنٹ ترکی کا۔

آزاد: ایں!

افسر نے دو آدمیوں کو بلایا اور کہا: اس جنٹل مین کے ساتھ جاؤ۔

آدھ گھنٹے کے عرصے میں بے چارے میاں آزاد قید خانے میں تھے۔ آزاد نے افسروں سے لاکھ لاکھ پوچھا کہ:

آخر میرا جرم کیا ہے؟۔

مگر افسروں نے کہا۔ ہمیں اجازت نہیں، ورنہ ضرور بتا دیتے۔

میاں آزاد اپنے دل میں سوچنے لگے کہ آخر ہم سے کون سا ایسا جرم ہوا، جس کے بدلے یہ مصیبت سہی۔ گھنٹوں سوچا کیے، مگر کوئی جرم ہوتا تو یاد آتا۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟۔ کون سی خطا ہوئی، میدان جنگ کے عوض قید خانہ نصیب ہوا، پردیس کا واسطہ، پرایا ملک، اپنا نہ بیگانہ صلاح کس سے لیں اور مشورہ کون دے، افسوس آئے تھے اس لئے کہ ان لوگوں کو مدد دیں مگر دل کی دل ہی میں رہی۔ الٹی قید سہی، اب حسن آرا سے کیوں کر ملیں گے۔ کوئی اتنا بھی تو نہیں کہ ان تک ہماری ناکامی کی خبر پہنچا دے۔

اتنے میں ہرمزجی بھائی لمبی ٹوپی پہنے ہوئے آئے۔

ہرمزجی: مسٹر آزاد!

آزاد: یہ بتایئے میرا جرم کیا ہے؟۔

ہرمزجی: ایں میں تو آپ سے دریافت کرنے آیا ہوں۔

آزاد: مجھے خاک نہیں معلوم۔

ہرمزجی: غور کیجئے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے

آزاد: کچھ سمجھ میں نہیں آتا، حیرت ہے انتہا کی حیرت۔

ہرمز: کسی دشمن کا کام ہے۔

آزاد: یہاں تو مجھے کوئی جانتا ہی نہیں، دشمن کون پیدا ہو گیا۔

ہرمز: پتا چل جائے گا۔

آزاد: اب میں کیا فکر کروں۔

ہرمز: پہلا سوال تو یہ ہے کہ آپ کا جرم کیا ہے؟۔آج کل جنگ کے سبب طرح طرح کی کاروائیاں ہو رہی ہیں۔مگر واقعی حیرت ہے کہ آپ کے ساتھ اور گورنمنٹ ترکی اس طرح پیش آئے۔

آزاد: افسوس کہ ترکوں کی حمایت کے لئے وطن چھوڑا اور یہاں آئے مگر،،،،،

ہرمز: کوئی بات پوشیدہ طور پر ہوئی ہے کہ حکام نے مجبور ہو کر آپ کو قید کرلیا، اب میں رخصت ہوتا ہوں، مگر دل مضبوط رکھیے میں پھر آؤں گا۔

آزاد: آپ کی ذات کے سوا میرا یہاں کوئی دوست نہیں، اور آپ سے بھی دو

دن کی ملاقات ہے، کسی قسم کا دعویٰ نہیں۔

ہرمز: مجھے اپنا پکا اور پرانا دوست سمجھیے۔

ہرمز جی رخصت ہوکر اپنے گھر آئے ،میاں آزاد دل میں اس پارسی جنٹیل مین کے بڑے شکر گزار ہوئے۔

تین دن اسی طرح گزر گئے۔میاں آزاد قید خانے میں رہے،کبھی حسن آرا کی باتیں یاد آتیں اور کبھی ویٹیا اور ایپلٹن کی،کبھی ناول پڑھتے تھے،کبھی ٹھنڈی سانسیں بھرتے تھے۔

چوتھے روز میاں آزاد کو وزیر جنگ کے ہاں طلب کیا گیا۔

وزیر جنگ کے سیکرٹری نے کہا کہ:

میاں آزاد تم نے غلط بیان کیا کہ تم ہندوستانی ہو،تمھارے بارے میں اطلاع ہے کہ تم روسی جاسوس ہو اور روس سے خاص اس غرض سے آئے ہو۔جو کہ ترکی کے حالات اور میدان جنگ کی کاروائی سے اپنی گورنمنٹ کو اطلاع دو،اور جہاں کہیں موقع پاؤ،ہمیں شکست دلوادو،یہ بہت بڑا جرم ہے،تم کسی طرح رہا نہیں ہو سکتے۔

آزاد: یہ الزام بالکل غلط ہے،کسی دشمن نے تہمت تراشی کی ہے،میں بڑے ادب کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میں ایسے جرم کا مرتکب نہیں ہوں،میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں۔کشمیری ہوں روسی نہیں ہوں۔میں سوچتا تھا کہ یا خدا میں کس جرم کا نادانستہ مرتکب ہوا کہ گرفتار کیا گیا،لیکن اب مجھے ذرا بھی خوف نہیں،اب مجھے یہ بتائیے کہ یہ کس شخص نے بیان کیا ہے۔

وزیر جنگ پر فرض تھا کہ اس نام سے میاں آزاد کو اطلاع دیں کہا، میڈا۔

میڈا کا نام سنتے ہی آزاد خاموش ہو گئے مگر ان کی خاموشی اور چہرے سے پتا چلتا تھا کہ ان کے دل کو ٹھیس پہنچی ہے۔

وزیر: اب کیا آپ کہتے ہیں۔

آزاد: خاموش۔

وزیر: اچھا اب آپ وہیں جائیں، پرسوں پھر بلوائے جایئے گا۔ مجھے ابھی اس معاملے میں بہت سی باتوں کی تحقیقات کرنی ہے۔

میاں آزاد پھر قید خانے میں آ گئے۔

ہرمزجی ایک روز پھر ان کے پاس آئے، اور تسلی آمیز باتوں سے ان کو سمجھایا کہ گھبرایئے نہیں، رہائی کی کوئی نہ کوئی صورت جلد پیدا ہونے والی ہے۔

آزاد: رہائی کی تو اب کوئی امید نہیں، اور جنگ کے بعد رہائی ہوئی بھی تو کیا فائدہ؟۔

ہرمز: نہیں نہیں جلد رہائی ہوگی۔

آزاد: آج پورے پندرہ روز سے یہاں ہوں۔

ہرمز: جرم تو آپ کو بخوبی معلوم ہو گیا ہوگا۔

آزاد: بخوبی۔

ہرمز: میرا ارادہ ہے کہ خود وزیر جنگ کے سیکرٹری کی خدمت میں ایک عرضداشت بھیجوں کہ میاں آزاد کے ہندی ہونے اور ہندوستان سے آنے کا یہی ثبوت کافی ہے کہ میرے والد نے اپنے خط کے ذریعے ان کو میرے پاس بھیجا۔

آزاد: اور جنی ڈینس جہاز پر آئے، لیفٹیننٹ اپلیٹن کے ساتھ بمبئی سے روانہ ہوا۔ جہاز کے کپتان مسٹر اسمتھ مجھے خوب جانتے ہیں۔

ہرمز: بہتر ہے۔

آزاد: درخواست کب بھیجے گا؟۔

ہرمز: پرسوں ذرا احباب سے مشورہ کرلوں۔

آزاد: نوازش، عنایت۔

ہرمز: آپ تو بھائی ہیں۔

آزاد: قیدی اور مجرم کو بھائی نہ بنایئے۔

اس گفتگو کے بعد ہرمز جی رخصت ہوئے۔

بے گناہ قیدی

وزیر جنگ نے آزاد کو کوئی ڈیڑھ مہینے بعد طلب فرمایا، جب ان سے سوال کیے گئے تو میڈا اور قید کا نام سن کر مارے غصے کے جواب نہ دے سکے۔

لہذا وزیر جنگ نے ان کو قید خانہ واپس بھیجا اور کہا:

ہم برطانوی سفیر جو قسطنطنیہ میں ہے، کے ذریعے تمہارے چال چلن کا کا حال گورنمنٹ ہندوستان سے دریافت کریں گے، اگر تم اصل میں ہندوستانی ہو تو فوراً رہا کیے جاؤ گے۔

میاں آزاد کا فوٹو لیا گیا اور وہ گورنر جنرل ہند کی خدمت میں بھیجا گیا۔

میاں آزاد نے بیان کیا کہ:

ہندوستان میں فلاں صاحب سے میرا حال دریافت کیا جائے، اس کے علاوہ کپتان اسمتھ اور لیفٹیننٹ اپلیٹن کے پاس بھی ان کے فوٹو بھیجے گئے۔

گورنمنٹ ہند نے جواب دیا، جس سے ظاہر ہوا کہ آزاد روسی جاسوس نہیں ہیں، ساٹھ ستر معزز آدمیوں نے گواہی دی، ہم ان صاحب سے خوب واقف ہیں۔ ان اصحاب میں بمبئی کے علماء اور وہ نواب صاحب بھی شامل تھے، جن کا بٹیر صف شکن علی شاہ اڑ گیا تھا۔ اب سب نے دستخط کر دیے تھے۔

لیفٹیننٹ اپلیٹن نے جواب لکھا کہ:

یہ تصویر ایک کشمیری مسلمان کی ہے، جو ہندوستان کے حصے اودھ میں رہتے ہیں۔ یہ صاحب ہمارے ساتھ بمبئی سے جہاز میں سوار ہوئے، جنی ڈینس جہاز کا

نام تھا، جہاز جزیرہ پیرم کے قریب ڈوب گیا تھا۔اس جواں مرد نے اکثر کی جان بچائی، مالٹا تک ہمارا ان کا ساتھ رہا۔وہاں سے ہم روانہ ہو گئے انگلستان کی طرف اور وہ سکندریہ گئے۔

کپتان اسمتھ نے لکھا:

میں جنی ڈینس جہاز کا کپتان تھا۔بمبئی سے یہ شخص جہاز میں سوار ہوا۔نہایت لائق اور جوان مرد ہے۔مالٹا سے میرا ان کا ساتھ چھوٹا، جہاز ڈوبنے کے وقت میاں آزاد نے ہماری بڑی مدد کی۔یہ شخص روسی جاسوس نہیں ہے۔ہرگز نہیں ہے۔

ہرمزجی نے آ کر یوں بیان کیا:

''میاں آزاد میرے والد کا خط لے کر آئے ہیں اور میرے مہمان ہیں۔ میں ان کو اچھا سمجھتا ہوں اور قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ روسی نہیں ہیں، ہندوستانی ہیں''۔

میاں آزاد نے بیان کیا کہ:

میں ہندوستان کا رہنے والا کشمیری مسلمان ہوں، روسی جاسوس جس نے مجھے کہا ہے، اس نے جھوٹ بولا ہے۔میں اسلام کا خادم ہوں اور خاص اسی غرض سے آیا ہوں، کہ جنگ میں شریک ہو کر ترکوں کی مدد کروں۔مگر قسمت نے مجھے قید خانہ دکھایا۔گورنمنٹ ہند نے مجھے بری کیا، میری تعریف لکھی۔مختلف مقامات کے لوگوں نے مجھے پہچانا۔ایک انگریزی اور فوجی لیفٹیننٹ اپلیٹن نے میری نسبت یہ لکھا کہ یہ شخص بمبئی سے ہمارے ساتھ جہاز پر سوار ہوا۔خود کپتان اسمتھ نے اس کی تصدیق کی، ہرمزجی بھائی سوداگر نے گواہی دی۔اب بھی بری نہ ہوں تو

اندھیر ہے۔

وزیر: بے شک، آپ کی نسبت اب جرم کسی طرح پر ثابت نہیں ہو سکتا۔ مگر آپ دو چار روز اور ٹھہر جایئے تو آخری حکم سناؤں۔ آپ قید خانے اس وقت تشریف لے جایئے۔

آزاد نے جھک کر سلام کیا، اور چلے گئے۔ راستے میں سوچتے جاتے تھے کہ شاید اب رہائی ہو جائے، کیونکہ میڈا کوئی ثبوت میرے روسی ہونے کا پیش نہیں کر سکتی، اور میں نے ثابت کیا ہے کہ اس نے صرف تہمت تراشی ہے۔

وزیر جنگ نے میڈا کو بلوایا اور کہا:

افسوس ہے کہ تمہارا بیان غلط نکلا، میاں آزاد روسی جاسوس نہیں ہیں۔ ہندوستان سے خاص اسی لیے آئے ہیں، کہ ہماری فوج کی طرف سے روسیوں کا مقابلہ کریں۔ بہت سے ثبوت دیے ہیں۔ گورنمنٹ ہند نے لکھا ہے کہ پوری تحقیقات کے بعد معلوم ہوا ہے کہ میاں آزاد کا چال چلن یہاں اچھا تھا۔

یہ فقرہ سنتے ہی میڈا کا رنگ فق ہو گیا۔ بات کرنا محال تھا۔

وزیر جنگ نے پھر کہا کہ:

اگر آزاد کو رہا کر دیا گیا تو تمہارے حق میں اچھا نہ ہو گا۔ انصاف اسی کا تقاضا کرتا ہے کہ جو بدنامی اور پریشانی اور ناکامی آزاد کو نصیب ہوئی ہے اس کا معاوضہ کسی نہ کسی سے لیا جائے اور اس میں شبہ بھی نہیں کہ وہ ضرور آزاد ہو جائیں گے۔

پھر میڈا سے کہا کہ:

اب آپ جائیں"۔

میڈا نے وزیر جنگ کو سلام کیا۔اور رخصت ہوئی ،لیکن اس کے چہرے پر ایک مایوسی تھی ،اسے کمال افسوس تھا کہ یہ میں نے کیا کیا ہے۔ یہ بات اب پورے ترکی میں مشہور ہو جائے گی ،اور میری سخت بدنامی ہو گی۔



میاں خواجہ بدیع صاحب

خواجہ بدیع سکندریہ میں چین سے رہے۔ترکی کے کانسل نے جو سکندریہ میں تھے،ان کی بڑی خاطر کی۔خوجی تیسرے چوتھے روز سلام کر لیتے تھے۔پندرہ روز میں خواجہ بدیع خاصے بھلے چنگے ہو گئے۔سکندریہ کی حضرت نے خوب سیر کی،جب کئی روز تک حضرت اچھے رہے۔بیماری نے بالکل پیچھا چھوڑ دیا تو ایک دن کانسل کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ:

اب یہ فدوی بالکل اچھا ہو گیا ہے۔امید ہے کہ اجازت دی جائے''

دریافت کیا گیا کہ کس بات کی اجازت چاہتا ہے''

کہا''

صرف یہ چاہتا ہوں کہ میاں آزاد کے پاس بھیج دیا جائے۔

کانسل نے حکم دیا کہ:

جو جہاز قسطنطنیہ جاتا ہو،اس پر خوجی بھیج دیے جائیں۔سفر خرچ کے علاوہ نقد روپے اور کپڑا ابھی ان کو دیا جائے۔

ایک دن خواجہ بدیع صاحب لڑھکتے پڑھکتے چلے جاتے تھے کہ مالٹا کی ایک عورت نے انہیں دیکھا۔دو ماشے کا قد اور دبلے پتلے ہاتھ پاؤں دیکھ کر مسکرائی۔

میاں خوجی اور بھی تن گئے اب اکڑے ہی جاتے ہیں۔زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے،سمجھے کہ یہ عورت ہم پر ریجھ گئی ہے۔دل ہی دل میں سوچتے جاتے تھے کہ واللہ واہ رے ہم جس ملک میں جاتے ہیں انگلیاں اٹھتی ہیں۔چھوٹے بڑے سب

ہمیں کو دیکھتے ہیں۔ وہ عورت اور بھی غور سے دیکھنے لگی۔ حضرت کے اکڑنے پر خوب کھل کھلائی۔

میاں خوجی نے قریب اور منہ بنا کر غور سے دیکھا۔ عورت کو اور بھی ہنسی آئی۔

اس پر میاں خوجی اکڑ کر بولے۔

نہ ہوئے میاں آزاد ورنہ حسن آرا تک بھول جاتے۔ واہ کیا پری ہے اور مجھ گھبرو کو دیکھ کر کھلی جاتی ہے۔

اتنے میں دس پندرہ راہ رو بھی جمع ہو گئے میاں خوجی کی انوکھی قطع اور قدو قامت اور راکڑنا اور مسکرانا وا اینڈنا جو دیکھتا تھا، ہنس دیتا تھا۔ میاں خوجی کو یقین ہو گیا تھا کہ ہمارے حسن پر نظر ڈال کر یہ لوگ خوش ہو رہے ہیں۔ اب میاں خوجی ایسے مزے میں آئے کہ حاضرین کو ڈپٹنے لگے۔

ایک سے کہا:

تو یہاں کیوں کھڑا ہے بے"

دوسرے کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

"چلا جا یہاں سے"

تیسرے سے خطاب کر کے بولے:

"او گیدی جاتا ہے یا نکالوں قرولی"

چوتھے سے کہا:

یہاں کیا تماشا ہے کچھ۔

اردگرد کے لوگ سمجھے کہ مسخرہ ہے کوئی، بعض کو گمان ہوا کہ دیوانہ ہے۔ جوں

جوں میاں خوجی بگڑتے تھے لوگ اور بھی بناتے اور کھل کھلاتے تھے۔

آپ نے عورت کی طرف مخاطب ہو کر اشارے سے کہا:

''چلو ہم تم اس طرف چلیں''

اس پر اور بھی قہقہہ پڑا۔

اب تو میاں خوجی تماشا بن گئے، بار بار اکڑنا اور بھی تماشا دکھاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس عورت نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ خوجی مسکرائے۔ مسکرانا تھا کہ اس عورت نے ایک دھول جمائی۔ ہاتھ چھڑانے ہی کو تھے کہ پیچھے سے کسی نے ایک اور چپت جمائی۔ تیسرے نے چپکے سے دھپ لگائی۔ ادھر دیکھتے ہیں تو ادھر سے پڑتی ہے اور ادھر نظر اٹھاتے ہیں تو ادھر تڑ اتڑ کی آواز آتی ہے۔

اچانک خواجہ بدیع صاحب کو خیال آیا کہ افیم کھانے کا وقت آن پہنچا۔ اگر گھر جاتے ہیں تو یہ عورت چھوٹتی ہے۔ اگر یہاں پینے کی خواہش کریں تو پانی نہیں ہے۔

اشارے سے حضرت نے پانی مانگا۔

کٹوری میں دیا گیا۔ افیم گھولی، پی اور بلند آواز میں عورت کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

چلو ہم تو کسی اور طرف چل کھڑے ہوں۔

اتنے میں پیچھے سے کسی نے چٹکی لی تو خواجہ صاحب پلٹ پڑے۔ دیکھا تو دو بونے ایک وہی ذات شریف جس نے ان کو ہوٹل میں جمال گوٹا پلا دیا تھا۔ دوسرے ان کے کوئی یار تھے۔ خوجی نے اپنے پرانے دوست کو دیکھا تو اور تن

گئے۔

کیوں بچو تم اپنی شرارت سے باز نہیں آتے۔

ابھی ایک کشتی نکال چکا ہوں۔اب آج پھر سر کھجلایا، ہڈیاں چل چلانے لگیں۔میرے بھی ہاتھ میں کھجلی ہو آتی ہے، جھپٹ کر میاں خوجی نے ایک چپت جڑی۔

دونوں بونے چمٹ گئے۔

خوجی نے کہا:

ہائیں ہائیں۔ایک ایک، ایک ایک۔

مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔

خوجی جھلا گئے ایک بونے کی گردن دبائی اور زور سے پٹخنی دی۔چاروں شانے چت۔

''وہ مارا''

وہ مارا کہہ چکے تھے کہ دوسرے بونے نے ٹانگ پکڑ کر کھینچ لیا۔لڑکھڑا کر خوجی گرے مگر بونا بھی ساتھ ہی گرا۔لوگ خوب ہنسے۔قہقہے پر قہقہہ پڑا اور خوجی زمین سے اٹھ کر خوب ہی اکڑے۔

ہات تیرے گیدی کی۔ابے ہم تو نہتے لڑتے ہیں اور جو کہیں قرولی ہوتی تو توبہ ہی بھلی۔

خوجی:عورت سے سچ کہنا کیسی آنٹی دی ہے۔

عورت (اشارے دے) بڑے پہلوان ہو۔

خوجی: پھر اب بھی ہماری شادی نہ ہو تو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

(دونوں بونے منہ چڑھانے لگے)

خوجی: جاؤ جوتے خورے۔ زمانے بھر کے بے حیا۔۔ نامعقول۔

(بونوں نے دور جا کر خوجی پر ڈھیلے پھینکے)

لوگوں نے جا کر حضرت کانسل سے بھی جڑ دی کہ میاں خوجی کوئی مسخرے ہیں۔ شہر میں جس طرف جاتے ہیں، انگلیاں اٹھتی ہیں۔ آدمی کیا تماشا ہیں؟۔

کانسل نے ان کو بلوایا۔

خوجی: سات بار سلام کرکے۔ حاضر ہے غلام۔

کانسل: اب کیا چاہتے ہو اور ہندوستان جانے کا ارادہ ہے نا؟۔

خوجی: جی حضور۔

کانسل: اچھا ہم جلدی بھیج دیں گے، اچھا رخصت۔

خوجی: آداب حضور۔

شام کو خوجی نے سوچا کہ میں نے ہندوستان جانے کی درخواست کیوں دی۔ آزاد بے چارے اکیلے کو تنہا چھوڑ دینا وضع کے خلاف ہے۔ گو آدمی لائق ہیں مگر کم سن اور ناتجربہ کار ہیں۔

سوچ کر ایک عرضی فارسی زبان میں لکھی۔ عرضی ایسی کہ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔

عرضی پڑھ کر کانسل کو یقین ہو گیا کہ یا تو سڑی ہے یا مسخرہ۔

کانسل: عرضی کون لایا ہے۔

خدمت گار: حضور یہ نوری لایا ہے۔

کانسل: تم لائے ہو؟۔

نوری: ہاں خداوند۔

کانسل: کس نے دی؟۔

نوری: حضور وہی جو بیمار تھے۔

کانسل: سلام دو اور کہو اچھا۔

نوری جھک کر آداب بجالایا اور خوجی سے جا کر کہا: کہا ہے اچھا۔

خوجی: اچھا۔ اچھا کیا معنی؟۔

نوری: اب یہ آپ جانیں۔

خوجی: عرضی پڑھی بھی تھی۔

نوری: ہاں پڑھ لی تھی۔

خوجی: تو سمجھے نہ ہونگے۔ ہرگز نہ سمجھیں ہوں گے۔

نوری: اب یہ میں نہیں جانتا کہ سمجھے یا نہیں سمجھے۔

خوجی: ہرگز نہیں سمجھتے تو انعام ضرور دیتے۔

تیسرے روز جانسل نے میاں خوجی کو طلب کیا اور کہا:

آپ کیا چاہتے ہیں۔

خوجی جھک کر آداب بجالایا اور کہا:

خداوند۔ بس اب حضور کی پرورش چاہتا ہوں"

"کیا پرورش چاہتے ہو معلوم تو ہو"

''وہی جو عرضی میں عرض کر چکا ہوں۔''

عرضی تو کسی کی سمجھ میں نہیں آئی

''ہاں دیکھا نا۔ میں تو سمجھا تھا کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔'' (ہنس کر) واللہ واہ رے میں۔ ہم نے جو کام کیا کمال کا درجہ حاصل کیے بغیر نہ چھوڑا۔ کشتی لڑے تو ایسی ہی۔ اس گرانڈیل لڑنیتے پہلوان کو ہوٹل میں مارا۔ ابھی کل ہی کی بات ہے۔ کہ دو پہلوانوں کو چٹکیوں میں لڑا دیا۔ افیم کھائی تو ایسی کہ صبح شام نشے ہی میں رہے۔ کچھ دین دنیا کی خبر ہی نہیں۔ جہاز ڈوبنے کا غم نہیں، البتہ افیم کی ڈبیا جانے کا خیال فوراً آیا۔ فارسی پڑھی تو ایسی کہ یہ خود مان گئے کہ عرضی کا مطلب سمجھ میں نہ آیا۔ اور کیوں کر سمجھیں سمجھنا کیا ہنسی ٹھٹھا ہے؟۔

''بولو اب کیا چاہتے ہو''

وہی جو عرضی میں لکھا ہے۔ ذرا عرضی کھولو، پڑھوتو۔ نوری سے میں نے اسی دم کہا کہ سمجھے نہ ہوں گے۔ وہ گدھا کہے کہ سمجھے ہوں گے۔ منشیوں کی تحریر منشی ہی سمجھ سکتا ہے۔ ایسے ویسے کیا سمجھیں۔ ہائے نہ ہوئے آزاد اس وقت وہی داد دیتے۔ بس ایک وہ منشی ہے دوسرے خواجہ بدیع۔

آزاد کے پاس جانا چاہتے ہو؟۔

''چاہتے وہی ہیں جو عرضی میں لکھا ہے بس کہہ دیا۔''

ہم کچھ نہیں سمجھتے کہ تم کیا بک رہے ہو؟۔

تم سے امید بھی نہیں کہ خواجہ بدیع کی بات سمجھ لو۔

''آزاد کے پاس جاؤ تو کل بھیج دیں۔''

بس وہی خواہش ہے، جو کچھ عرضی میں ظاہر کی، واہ کیا کیا فقرے لکھے ہیں۔ واہ رے میں۔ خواجہ بدیع اپنی مثال نہیں رکھتا۔ یہ لوگ بھلا کیا سمجھیں گے؟۔

کانسل: تم سڑی ہو، بس چل دو جاؤ یہاں سے۔

جس وقت ہندوستانی نے ان کو سمجھایا کہ کانسل خفا ہو گئے ہیں، اور حکم دیتے ہیں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ تم سڑی ہو تو خوجی کی آنکھیں کبوتر کے خون کی سی سرخ ہو گئیں، اور جھلا کر کہا کہ:

افسوس کیسے نا قدر دانوں میں آن پھنسے۔ واہ واللہ وہ عرضی لکھی کہ پھڑک جاؤ۔ واہ رے ہم۔

ہندوستانی: اے یہ سب تو ہوا ہی کرے گا۔ یہ تو بتاؤ کہ اب کانسل صاحب کو کیا جواب دو گے۔

خوجی: وہی جو عرضی میں لکھا ہے۔

ہندوستانی: احمق ہو۔

خوجی: او گیدی اتنی قرولیاں بھونکی ہوں گی کہ۔۔۔۔۔

ہندوستانی سامنے سے ہٹ گیا، کانسل سے کہا کہ:

خداوند یہ سڑی ہے پکا سودائی ہے۔ اس کو یہاں سے ہٹائیے۔ خوجی سمجھے کہ ہم نے جو یہاں کشتیاں نکالیں تو ہوا بندھ گئی، لوگ اب ہم سے ڈرنے لگے۔ خیر دیکھو آزاد سے کہوں گا کہ وہ عرضی لکھی کہ کوئی سمجھ نہ سکا۔

غرض کانسل نے دو آدمی مقرر کیے کہ جو جہاز سکندریہ سے قسطنطنیہ جائے اس

پر ان کو سوار کرا دو اور چھ مہینے کے لئے کھانے کو دے دو۔ نقد اور کپڑا۔

خوجی: کیا کہتے ہیں یہ؟۔

ہندوستانی: دو آدمی انہوں نے مقرر کیے ہیں کہ آپ کو آزاد کے پاس بھیج دیں۔

خوجی: بہت اچھی بات ہے۔

ہندوستانی: اب آپ وہیں جائیں جہاں آپ ٹکے ہیں۔

خوجی: اچھا سلام کر لوں۔ (کانسل کے قریب جا کر حضور آداب عرض ہے) کچھ دن ہم سے پڑھ لو تو فارسی لکھنا آ جائے۔ ایسے نیک آدمی اور فارسی ذرا بھی نہ سمجھ سکے۔ ہائے افسوس۔ وائے افسوس۔

ہندوستانی: چلو اب بکو نہ بہت، بے ہودہ، بے تکا آدمی۔

خوجی: کیا؟۔

ہندوستانی: بھائی صاحب ہمارے وطن کے ہو لڑو نہ ہم سے۔

خوجی: اچھا اچھا یار ہم کیدانی کر چکے ہیں نا، فوج میں رہ چکے ہیں، وہ سپہ گری کی بو نہیں جاتی مجبور ہیں۔

ہندوستانی: بجا ارشاد ہے۔

خوجی: اچھا حضور رخصت ہوتا ہوں۔

کانسل: جاؤ پرسوں جہاز جائے گا۔

آزاد کی رہائی

آزاد کو قید ہوئے اب کافی دن ہو چکے تھے، ایک تو وزیر جنگ کے احساس دلانے سے اور دوسرے اپنے ضمیر کی آواز سے متاثر ہو کر میڈا خود آزاد سے ملنے گئی۔ اور اس سے اپنی زیادتی پر شرمسار ہو کر معافی مانگی۔ آزاد نے جو اسے اس قدر شرمندہ دیکھا تو کھلے دل سے معاف کر دیا۔

اتنے عرصے تک قید میں رہ کر میاں آزاد نہایت ہی پریشان ہوئے، ایک روز انہوں نے وزیر جنگ کے نام خط لکھا:

جناب عالی!

میں قید خانے میں بیٹھا ہوں، جس کی وجہ سے میں قید ہوا تھا، اب وہ بھی میرے خلاف نہیں، مگر قسمت کی خرابی کو کوئی کیا کرے؟۔

میں صاف صاف لکھوں گا کہ حضور نے مکمل تحقیقات نہیں کی اور یہاں تک اس معاملے میں غفلت برتی ہے کہ اب تک میری خبر ہی نہیں لی ہے۔ جرم تو مجھ پر یہی عائد ہوا تھا نا کہ میں بھارتی جاسوس ہوں۔ مگر ہندوستان، انگلستان اور مالٹا تک سے خطوط آئے، کہ یہ شخص روسی جاسوس نہیں، ہندوستانی ہے۔ لیکن اس پر بھی قید خانے سے نجات نہ ملی۔

مس میڈا جنہوں نے مجھے روسی جاسوس بتایا تھا وہ خود تسلیم کرتی ہیں کہ ان سے غلطی ہوئی، مگر ہم قید خانے ہی میں ہیں۔ افسوس، حیرت اور حسرت کی انتہا نہیں، اب یا تو میرے قتل کا حکم ہو جائے یا پھر رہائی کا۔ کیونکہ اگر رہائی نہ ہوئی تو

پھر جینے سے کیا فائدہ؟۔ ہندوستان سے آئے تھے کہ ترکوں کی طرف سے لڑیں گے مگر افسوس دل کی آرزو دل ہی میں رہی۔

فدوی

آزاد

آزاد نے یہ خط وزیر جنگ کو بھیجا، انھوں نے پڑھا اور اس پر لکھ دیا کہ جلد رہائی ہوگی۔ میاں آزاد کے پاس یہ جواب بھیج دیا گیا، پڑھ کر خاموش ہو رہے۔

اب سنیے کہ دوسرے روز قید خانے میں ایک اور قیدی آیا، میاں آزاد نے دیکھا کہ ایک سرخ و سپید آدمی ہے، نہایت ہی حسین، دونوں کے درمیان یوں گفتگو ہونے لگی۔

آزاد: آپ کس ملک کے باشندے ہیں؟

دوسرا قیدی: میں فرانس کا رہنے والا ہوں اور آپ؟

آزاد: میں ہندوستانی ہوں۔

دوسرا قیدی: یہاں کب سے ہیں آپ؟۔

آزاد: اب چند ہی روز ہوئے ہیں۔

فرانسیسی: کس جرم میں جیل آنا ہوا؟۔

آزاد: کیا عرض کروں، افسوس ہے۔

فرانسیسی: ہمارے متعلق مشہور کیا گیا ہے کہ روسی جاسوس ہیں۔ کیا آپ پر بھی یہی جرم عائد ہوا ہے؟۔

آزاد: جی ہاں۔

فرانسیسی: اندھیر ہے، اندھیر۔

آزاد: جنگ کا زمانہ ہے نا لوگ جاسوس کے نام سے بھڑ کتے ہی ہیں۔

فرانسیسی: یہ سچ ہے مگر انتظام بھی ٹھیک نہیں ہے۔

آزاد: ابھی میں اس بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

فرانسیسی: ہاں واقف نہیں ہیں اچھی طرح آپ

میاں آزاد نے اس فرانسیسی سے پوچھا:

آپ روسی زبان سے بھی واقف ہیں؟۔

اس نے کہا:

ہاں خوب واقف ہوں، ترکی، فرانسیسی، روسی تینوں زبانیں بول سکتا ہوں۔

دو دن آزاد اور فرانسیسی مل جل کر رہے تھے کہ فرانسیسی نے کہا:

حضرت اب ہم اور آپ رازدان ہو جائیں۔

آزاد: رازدان ہو جائیں اس کے کیا معنی؟۔

فرانسیسی: ہم آپ سے راز کی باتیں کہیں اور آپ ہم سے۔

آزاد: بہتر۔

فرانسیسی: ہم روسی جاسوس تو نہیں مگر جب سے قید ہوئے ترکوں کے خلاف ہو گئے۔

آزاد: بے حد افسوس ہے۔

فرانسیسی: افسوس کا ہے کا ہماری طبیعت۔

آزاد: ترک بڑے پاک باز اور سچے آدمی ہیں۔

فرانسیسی: آپ ابھی واقف نہیں، ہم سے پوچھیے۔

آزاد: ہم ترکوں کے عاشق ہیں۔

فرانسیسی: اس حالت میں بھی۔

آزاد: بے شک۔

فرانسیسی: آپ کو بے وجہ قید کر دیا۔

آزاد: بالکل ٹھیک کیا جنگ کا وقت ہے نا۔

فرانسیسی: بڑا برا کیا۔

آزاد: اور کسی ملک میں ہوتے تو اب تک مار ڈالے گئے ہوتے۔

فرانسیسی: فرانس میں ایسا نہ ہوتا، جو ہمارا ملک ہے۔

آزاد: جی ہاں۔ وطن کی محبت کا یہی تقاضا ہے، جو آپ نے فرمایا۔

فرانسیسی: آپ جب یہاں سال چھ مہینے رہیں گے تو کیفیت معلوم ہو گی۔

آزاد: مگر ہاں آدمی اچھے ہیں۔

فرانسیسی: اور گورنمنٹ۔

آزاد: ابھی رائے نہیں دی جا سکتی۔

فرانسیسی: آپ آئے کس غرض کے لئے تھے؟۔

آزاد: جنگ میں شریک ہونے کے لئے۔

فرانسیسی: آپ کی حالت افسوسناک ہے۔

آزاد: آئے تو تھے میدان جنگ میں تلوار کے جوہر دکھائیں گے، مگر یہ معلوم نہ تھا کہ قید خانے جائیں گے۔

فرانسیسی: آزاد نام کا ایک شخص بھی آیا تھا۔

آزاد: آیا ہوگا۔

فرانسیسی: آپ ہی کے ملک کے تو ہیں۔

آزاد: ہوں گے۔

فرانسیسی: کیا آپ کی ان سے ملاقات نہیں ہے؟۔

آزاد: چار آنکھیں کبھی نہیں ہوئیں۔

فرانسیسی: سنا ہے ایک بیگم نے ان کو بھیجا ہے۔

آزاد: ہو سکتا ہے۔

فرانسیسی: جنگ کے فنون سے آپ واقف ہیں۔

آزاد: جی ہاں واقف ہوں۔

فرانسیسی: مجھے بھولیے گا نہیں۔

آزاد: نہیں ایسی کیا بات ہے بھلا۔

رات کو قیدی کا کوئی پتا نہ چلا، میاں آزاد نے ادھر ادھر جستجو کی، مگر بے سود۔ لوگوں سے پوچھا مگر بے کار۔ حیرت تھی کہ یا الٰہی کیا اسرار ہے۔ معلوم ہوتا ہے قیدی بھاگ گیا۔

صبح کو وزیر جنگ کے پاس ایک شخص عرضی لے کر گیا، جس کا یہ مضمون تھا:

حضور والا!

آپ کے حکم کے مطابق میں دو دن جیل میں رہا، اور میاں آزاد نامی قیدی سے ملاقات کی، آدمی نہایت شریف اور پڑھا لکھا ہے، روسی جاسوس کہنا اس پر تہمت لگانا ہے۔ وہ بے حد افسردہ اور اداس ہے، خود میں نے کئی بار ترکوں کی

شکایت کی مگر آزاد نے مجھ سے اتفاق نہ کیا۔ یہ شخص ترکوں کا عاشق اور ترکی کا جاں نثار ہے ۔نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ہم ایسے دوست کے ساتھ ہم لوگ اس طرح پیش آئیں ۔حضور مہربانی فرما کر اسی وقت اس کی رہائی کا حکم دے دیں ۔ورنہ وہ کڑھ کڑھ کرمر جائے گا۔اور ہماری بڑی بدنامی ہوگی ،کہ ایسے جوان مرد کو قید کر کے مار ڈالا اور وہ بھی بے گناہ کو۔

یہ عرضی پڑھ کر وزیر جنگ نے حکم دیا کہ:

تم خود جا کر میاں آزاد کو رہا کرو اور کہو کہ پرسوں ہم سے ملاقات کریں ۔

اصل میں یہ صاحب قید خانے کے اعلیٰ افسر تھے،اور وزیر جنگ کے حکم کے مطابق میاں آزاد کے پاس قیدیوں کی طرح رہے ۔تا کہ اس بہانے سے ان کے تمام حالات دریافت کریں ۔

تھوڑی دیر میں قید خانے کے افسر صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر قید خانے کے پھاٹک پر پہنچے۔

حکم دیا کہ:

میاں آزاد کو طلب کرو۔

میاں آزاد آئے دیکھا کہ جو صاحب کل شام کو قیدی تھے،وہ اس وقت حاکم بنے،گھوڑے پر سوار سامنے کھڑے ہیں۔

آزاد: کل تو آپ ہمارے ہمدرد بنے تھے، بھلے کو کوئی بات ترکی کے خلاف زبان سے نہ نکلی،اور نکل بھی کس طرح سکتی تھی؟۔

افسر:اب آپ رخصت ہوں۔

آزاد: قید خانے کو سلام ہے۔

افسر: ہم بہت خوش ہوئے کہ آپ نے رہائی پائی، مگر افسوس ہے کہ اس قدر عرصے تک آپ کو مفت میں مصیبت سہنا پڑی۔ میاں آزاد خوش خوش قید خانہ سے چلے، ہرمزجی بھائی کی کوٹھی پر پہنچے۔

ہرمزجی بھائی نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ اور کہا۔

''میڈا ابھی یہاں سے گئی ہے، وزیر جنگ نے ان کو بلوایا تھا۔'' میاں آزاد اور ہرمزجی بھائی نے کھانا کھایا اور آرام کیا۔

شام کو مس میڈا تشریف لائیں، اور بہت جھک کر میاں آزاد کو سلام کیا۔

آزاد نے مسکرا کر جواب دیا۔

میڈا: آپ سے اب اقرار ہو گیا کہ گزری باتوں کو بالکل بھول جائیں گے۔ میں اپنی غلطی اور حماقت پر خود شرمسار ہوں۔ آزاد میں نے تم کو سخت مصیبت میں مبتلا کیا۔ مجھے اس کا بڑا افسوس ہے۔ مگر تم مطمئن رہو۔ میں اس کے جواب میں ایسا سلوک کروں گی کہ تم عمر بھر یاد کرو گے۔ وزیر جنگ نے مجھے کل بلوایا تھا، میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ میرا قصور معاف کیجیے۔ اور ایک عرض قبول کیجیے۔ کہا ہم نے قصور معاف کیا۔ میں نے کہا آزاد کو کوئی معزز جنگی عہدہ دیجیے۔ یہ کہہ کر میں بے اختیار رونے لگی، انھوں نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ تین چار دن میں ہم ان کو ایک افسری کا عہدہ دیں گے۔ تم اپنے ساتھ لاؤ، ان کو پرسوں۔ وعدہ ہے آپ میرے ساتھ چلیے گا۔ ضرور چلیے گا۔

آزاد: ضرور ایسی بات ہے بھلا۔

خوجی بھی آن پہنچے

میاں آزاد ہرمزجی بھائی کی کوٹھی میں آرام سے بیٹھے ناول پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص نے دفعتۂ غل مچا کر کہا:

''او گیدی نہ ہوئی قرولی''

آزاد کے کان کھڑے ہوئے۔

ایں یہ کس کی آواز تھی بھئی ہقرولی اور گیدی۔۔۔۔میاں آزاد سخت حیران ہوئے۔

اٹھنے کو تھے کہ پھر آواز آئی۔

قسم خدا کی گنا کھینچ ماروں گا او گیدی۔

آزاد: کوئی ہے۔

چپراسی: حکم حاضر ہوں۔

آزاد: باہر کیا غل مچ رہا ہے۔

چپراسی: ایک بونا سا آدمی ہے کہتا ہے کوٹھی کے اندر جانے دو۔

آزاد: آنے دو۔

چپراسی: نے اس آدمی سے جا کر کہا:

اچھا چلیے اندر چلیے۔تشریف لائے تو آزاد نے ہنس کر کہا: اخاہ خوجی ہیں۔آؤ بھائی خوب آئے۔

خوجی: شکر ہے تم کو صحیح وتندرست پایا۔

آزاد: سخت مصیبت میں مبتلا ہوئے تھے۔

آزاد نے مختصر طور پر سب حال بیان کیا کہ اتنے عرصے تک قید خانے میں رہے۔ چھ چھ دفعہ تحقیقات ہوئیں، جرم کچھ ثابت نہ ہوا، مگر بدقسمتی سے رہائی نہ ہوئی۔ آخر کار وزیر جنگ کی خدمت میں عرضی بھیجی، اب خدا خدا کر کے رہائی پائی۔

خوجی نے استقلال سے ساری داستان سنی اور کہا:

سچ کہنا اس وقت ہوش ٹھکانے ہیں یا نہیں۔

آزاد نے قسم کھائی تو خوجی کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔ پوچھا:

صاف صاف بتاؤ کس جرم میں قید ہوئے تھے، بتاؤ کل حال ٹھیک ٹھیک کہنا۔

(آزاد نے میڈا والا سارا واقعہ سنا دیا۔)

خوجی نے تھوڑی دیر غور کر کے میاں آزاد سے پوچھا:

ہاں یہ بتاؤ قید کیوں کر ہوئے، یہ تو کوئی جرم نہیں کہ آپ نے شادی کرنا قبول نہ کیا۔

میاں آزاد نے ساری داستان بیان کی تو خوجی نیلے پیلے ہوئے۔

خوجی: سنا میاں ہم تمہارا بدلہ لیں گے سب بات ہم سمجھ گئے، یہ اس عورت کا کام نہیں، کسی نے اسے ورغلایا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ کسی کی سکھی پڑھائی تھی، مگر اس مردود سے انشاء اللہ ہم کھڑے کھڑے بدلہ لیں گے۔ اخوہ اتنے دن قید خانے میں بھی رہے۔ بڑا رنج ہوا۔ واللہ اس وقت بڑا افسوس ہوا۔

آزاد: چلیے اب افسوس نہ کیجیے، جو ہوا سو ہوا۔

خوجی نے کہا:

ہم خوب بن ٹھن کے بیٹھتے ہیں، شام کو ہمیں ان کے پاس لے چلیے۔ دیکھتے ہی عاشق نہ ہو جائے تو سہی، مگر استاد شرط یہ ہے کہ قرولی ہمارے پاس ضرور ہو، ورنہ بے قرولی کے ہم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔

آزاد نے کہا:

لڑیے گا۔

بولے:

نہیں صاحب لڑنا کیسا۔ بے قرولی کے جوبن نہیں آئے گی، ہم تو اوپچی بن کے جانا چاہتے ہیں۔ آپ یہ باتیں کیا جانیں۔ اب اتفاق دیکھیے کہ مییڈا خود ہی وہاں تشریف لے آئیں۔

آزاد: لو وہ خود آ گئیں۔

خوجی: ارے غضب ہو گیا۔

آزاد: یہ کیوں؟

خوجی: ابھی تو ہم بنے ٹھنے ہی نہیں تھے۔ حضرت نے وحشت میں آن کر ہوٹل کی میز کا کپڑا اوڑھ لیا، اور تولیہ سر میں باندھا اور ایک چھری (فورک) ہاتھ میں لے کر اکڑفوں بن کے کھڑے ہوئے۔

آزاد نے کھڑے ہو کر مییڈا سے ہاتھ ملایا اور کوجی گھورا کیے۔ اتنے میں مییڈا نے جوان پر نظر ڈالی، تو عجیب طرح کا آدمی دیکھ کر مسکرا دی۔ خوجی بے حد خوش ہوئے۔

خوجی کیوں میاں آزاد سچ کہنا، ہماری طرف دیکھتے ہی کھل گئی نا۔ واہ رے ہم کوج وعورت دیکھتی ہے گھنٹوں گھورا کرتی ہے۔ میڈا نے آزاد سے پوچھا کہ یہ کون ہے۔

آزاد نے کہا:

یہ ایک پاگل ہے، اس کو یہ خبط ہے کہ جو عورت مجھے دیکھتی ہے ریجھ جاتی ہے، تم ذرا اس کو بناؤ، اس وقت۔

میڈا شوخ تو تھی ہی، اتنی شہ پاتے ہی خوجی کو خوب بنایا، اشارے سے اپنے قریب بلایا، خوجی مسکراتے ہوئے گئے، اور قریب جا کر کرسی پر جاڈٹے۔

میڈا: ہاتھ میں ہاتھ دے کر آپ کا نام کیا ہے؟۔

خوجی: آزاد سے سمجھاتے جاؤ جی، آزاد نے سمجھانا شروع کیا، یہ جو کچھ کہتی تھی، ان کو سمجھاتے تھے، اور وہ جو کچھ کہتے، ان کو سمجھاتے تھے۔

خوجی: آپ کی ملاقات سے بہت خوش ہوا۔

میڈا: مسکرا کر کل آپ کی دعوت ہے۔

خوجی: (توند پر ہاتھ پھیر کر) منظور۔

میڈا: آپ شراب پیتے ہیں۔

خوجی: ہاں، نہیں، مگر اچھا نہیں نہیں۔ آزاد: مرد آدمی ایک بات کہو تو میں سمجھا دوں یہ نہیں اور ہاں اور مگر اور اچھا کیا معنی؟۔

خوجی: کہو کہ افیم پیتا ہوں۔

میڈا: یہ آپ کا گلاب سا چہرہ کملا جائے گا۔ افیم نہ پینا چاہیئے۔ آپ کا نام کیا

ہے؟۔نام بتائیے۔

آزاد: اردو میں ان کا نام خوجی ہے۔

خوجی: بگڑ کر کس مردود کا نام خوجی ہے۔لوگ خواجہ بدیع صاحب کہتے ہیں۔

میڈا: اوہو ہو، کیا پیارا نام ہے؟۔

خوجی: آزاد سے کیوں اتنی تعریف کی ہے نام کی، اور جو خوجی کہتے تو نظروں سے گر جاتے۔

میڈا: آپ کچھ تھوڑا تھوڑا گانا بھی جانتے ہیں۔

آزاد: انکار نہ کرنا، کہو ہاں جانتا ہوں ضرور۔

خوجی: اور ہاں میں ناچنا بھی جانتا ہوں۔

میڈا: اوہو ہو ہو۔تو پھر ناچو۔

خوجی نے ناچنا شروع کیا، میڈا اور آزاد کی یہ کیفیت کہ مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔

میڈا تھوڑی دیر بعد ہوٹل سے گئیں تو میاں آزاد کے دماغ عرش بریں پر تھے۔زمین پر قدم ہی نہ رکھتے تھے۔

میاں آزاد نے کہا:

خواجہ صاحب ذرا یہاں تشریف لائیے۔

فرمایا:

ہشت:

پھر آزاد نے کہا:

قبلہ ذرا اس طرف مخاطب ہو جائیے۔

آپ نے کہا کہ وحشت۔

آزاد: اب ایک کام کیجیے کہ خوب بن ٹھن کر جائیے۔ خون نکھر کر کہ ذرا وہ بھی مان جائے کہ ہاں ایسا جوان دیکھا۔

خوجی: ہونہہ خدا کی شان آپ اور ہم کو سکھائیں۔ افسوس کہ تم نے ہمیں ابھی پہچانا ہی نہیں۔ کمال افسوس کا مقام ہے۔

آزاد: اجی ہم نے آپ کی ذات تک پہچان لی ہے۔

خوجی: کوسو گالیاں دو۔

آزاد: افوہ۔ میں تم کو ایسا نہیں جانتا تھا۔ خوجی اپنے دل میں نہایت ہی خوش تھے، پھولے نہیں سماتے تھے۔

اور میاں آزاد دل ہی دل میں سوچتے تھے کہ اچھا الو پھنسا یہ معلوم ہی نہیں کہ مئیڈا اسے بنا رہی ہے۔

تھوڑی دیر میں مئیڈا کا خط آیا۔ آدمی نے آن کر خوجی کو دیا اور کہا:

آپ کے نام ہے۔

آزاد بولے: جناب خواجہ صاحب ہم کو تو ذرا خط دکھائیے۔

خوجی: بس بس۔ چلیے الگ ہٹیے۔

آزاد: لاؤ ہم پڑھ دیں۔ تم سے بھلا کیا پڑھا جائے گا۔

خوجی: خط لانے والے سے تم ذرا باہر ٹھہرو۔

خط والا: بہت اچھا۔

خوجی: آزاد سے عجیب آدمی ہیں آپ، میں نے تو ایسا آدمی ہی نہیں دیکھا۔صاف دیکھتے ہیں کہ مینڈا کا نوکر جو خط لایا ہے۔وہ کھڑا سن رہا ہے اور کہنے لگے کہ تم سے بھلا کیا پڑھا جائے گا۔بڑے عالم کے وہ بن کے آئے ہیں وہاں سے۔لاحول ولاقوۃ۔

آزاد: اچھا اب تو دکھادو۔

خوجی نے خط میاں آزاد کو دے دیا۔آزاد نے پڑھا تو یوں لکھا تھا:

خواجہ صاحب!

تمھارا سرو سا قد اور تمہاری سارس کی سی گردن اور بیل کے سے گول گول دیدے اور بندر کی سی حرکتیں جب یاد آتی ہیں۔تو میں اچھل اچھل پڑتی ہوں۔اب یہ بتاؤ کہ آج کس وقت آؤ گے۔ایسا نہ ہو کہ نہ آؤ۔یہ خط اپنے دوست آزاد کو نہ دکھانا، اور وعدے پر ضرور آنا۔

مینڈا

میاں آزاد نے یہ خط پڑھ کر خواجہ بدیع صاحب کو سنایا تو بہت خوش ہوئے۔

خوجی: افسوس ہے کہ تم کو کل حالات معلوم ہو گئے، مگر اب اس سے نہ کہہ دینا۔

آزاد: ضرور کہوں گا۔

خوجی: (ہاتھ مل کر) ارے غضب بڑی بری بات ہوئی۔

آزاد: میں تو جا کر شکایت کروں گا کہ ہم سے کیوں بھید رکھا۔واہ کیا دل لگی ہے۔

خوجی: (سر پیٹ کر) لاحول لاحول۔

آزاد: میں ابھی ابھی ایک چٹھی بھیجتا ہوں آپ گھبرایئے نہیں۔

خوجی: ارے ہائے افسوس۔اور مجھ سے کہتے ہو گھبرایئے نہیں۔

آزاد: بھائی سنو ہم کو تو حسد ہوتا ہے۔

خوجی: پھر چاہے جو ہو۔لے جایئے، کہہ دیجیے، تم ایسے ہزار لگی لپٹی باتیں کریں، ہوگا کیا۔اے تو یہ آپ کی حقیقت ہی کیا ہے۔لاحول ولاقوۃ۔

آزاد: اپنے دل میں خوب ہی ہنسے مگر خواجہ بدیع صاحب کو شک کی جگہ یقین تھا بلکہ ایمان تھا کہ میڈا ہم پر جان دیتی ہیں۔آزاد اور بھی شہہ دیتے جاتے تھے۔آزاد: یار اب ہم تمہارے ساتھ نہ رہیں گے۔

خوجی: وجہ؟

آزاد: بس سمجھ گئے اب ساتھ نہ ہوگا۔

خوجی: آخر وجہ بتایئے۔

آزاد: غضب خدا کا میڈا ہمارے سامنے تم سے پیار کرتی ہے۔

خوجی: کھل کھلا کر ہنس پڑے)ہاہاہاہا۔اب سمجھے، ہم جوان ہی ایسے ہیں۔اس کو کوئی کیا کرے۔لیکن تم اگر خلاف ہو گئے تو واللہ میں میڈا سے بات تک نہ کروں۔مجھ کو جان تک سے زیادہ تم عزیز ہو۔قسم خدا کی اب دنیا میں تمھارے سوا اور کوئی میرا نہیں ہے۔جو کچھ ہو تم ہو فقط تم ہو۔اور کوئی نہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ ہم گھبرو جوان ہیں۔

آزاد: ہاں وہ تو میں خود جانتا ہوں۔

خوجی: ہاں بس اس پر جو شک کرے وہ کافر۔

آزاد: یار کمال کر دیا تو نے تو،

خوجی: (اکڑ کر) اجی سکندریہ میں تم نہ تھے۔ وہاں بھی ایک گرانڈیل عورت ہم پر ریجھ گئی تھی۔ مگر خرابی کیا تھی۔ ہم نہ اس کی بات سمجھیں، نہ وہ ہماری سمجھ سکے۔ اشاروں سے البتہ خوب باتیں ہوئیں۔

خوجی نے میاں آزاد سے پوچھا:

"کیوں میاں بھلا فارسی میں خط لکھیں تو کیسا رہے۔"

آزاد: نے کہا: فارسی یہاں کوئی کیا جانے بھلا۔ اردو میں لکھو تو سب سمجھ جائیں

خوجی: نے میڈا کے نام خط کا جواب اس طرح بھیجا:

میڈا کو بعد سلام کے یہ واضع ہو کہ تمھارا خط مورخہ تاریخ آج کا، واسطے اس کے کہ میں آؤں گا یا نہیں بیان کر دوں، میں نے پایا۔ خط میں نے بغور پڑھا۔ اچھا لکھا ہے۔ میں وقت مقررہ سے پہلے ہی آؤں گا۔ تم پر جان دیتا ہوں۔ ہر روز صبح اٹھ کر نام لیتا ہوں۔

خوجی: کیوں بھئی گل دستہ کی اردو کیا ہے؟

آزاد: پھل ہتھی۔

خوجی: یہ آگرے کے ایک محلے کا نام ہے۔

آزاد: اجی گل، پھول، دستہ، ہتھی۔

خوجی: ٹھیک ہے ہم پھل ہتھا لکھیں گے۔ دستی تھوڑا ہی ہے کچھ۔ میاں خوجی دو سطریں لکھتے تھے اور دس منٹ تک ٹہلتے تھے۔ دو سطریں لکھیں اور اٹھ کر اکڑ نے

لگے۔

آدمی نے دیکھا کہ حضرت کے مزاج کا تھل بیڑا ہی نہیں بڑھ کر کہا:

،صاحب جواب دیجیے گا یا میں جاؤں؟

خوجی نے کہا ہوں ہوں جانا کیسا بیٹھ،

پھر یوں لکھنا شروع کیا۔

مدتیں ہو گئیں کہ غم سے دل دوچار ہے۔از راہ کرم مہربانی کر کے اجازت دی جائے کہ آج ہی بارات لے کر آؤں۔ڈھول اور نقارے کی آواز بلند ہو،پھر کیا پوچھنا ہے۔بڑی دل لگی ہو۔واللہ اگر اجازت دو تو دولہا بن کر آؤں،اور تم کو بیاہ لے جاؤں۔مگر شرط یہ ہے کہ بعد خرچ کرنے کے اس قدر رقم کے میں مطلب کو پہنچوں۔آگے جو رائے ہو۔بندہ رائے کا ہوں۔بندہ صلاح کا ہوں اور باقی کچھ نہیں۔

خواجہ صاحب نے خط لکھ کر مس میڈا کے آدمی کو دیا اور اکڑ کر آزاد سے کہا:

کیوں قبلہ کہیے۔اب بولیے،سمجھے تھے کہ ایک ہم بڑے خوب رو جوان ہیں،مس میڈا نے ہمیں دیکھا اور سوچا کہ اس کو چھوڑ کے اور کس کے ساتھ شادی کروں۔چلیے تڑ سے خط لکھ بھیجا۔

آزاد نے کہا:

اس میں کیا شک ہے۔آپ ایک خوبصورت جوان ہیں۔بھلا آپ پر نہ ریجھتی تو پھر کس پر ریجھتی۔مگر خط تو گھٹوالو،میاں خلیفہ کو بلواؤ۔

حجام آیا خط بننے لگا۔

خوجی (گال پر ہاتھ رکھ کر) گھوٹو، گھوٹو ابھی گھوٹے ہی جاؤ۔ ابھی کھونٹی باقی ہے۔ خوب گھوٹو۔

حجام نے پھر استرا پھیرا۔

خوجی نے پھر ٹٹول کر کہا:

اور گھوٹو ابھی باقی ہے۔

خلیفہ نے پھر استرا پھیرا۔

خواجہ صاحب نے جھلا کر کہا:

تم کچھ بھی نہیں جانتے، کھونٹی کیوں رہ گئی، چلو گھوٹو۔

آزاد: گھوٹو نا بھئی۔

حجام: تو حضور کب تک گھوٹا کروں۔

خوجی: دونی مزدوری دیں گے ہم

حجام: مانا مگر کوئی حد بھی ہے۔

خوجی: تم کو اس سے مطلب۔

حجام: پیرومرشد! خون نکلنے لگے گا۔

آزاد: اور بھی اچھا ہے، لوگ کہیں گے کہ دولہا کے چہرے سے خون برستا ہے۔

خوجی: ہاں۔ واللہ، خوب سوچے۔ گھوٹو

حجام: اب کسی اور نائی سے گھٹوایئے۔

آزاد: اچھا اچھا پٹے تو کترتے جاؤ۔

خوجی: پر قینچ کردو، حجام نے جھلا کر آدھے بال کتر ڈالے، ایک طرف کی آدھی مونچھ اڑا دی۔ داڑھی کے سفید سفید بال رہنے دیے، کالے صاف کر دیے۔ خوجی ایک تو یوں ہی بڑے حسین تھے۔ حجام نے کتر کترا کے اور بھی ٹھیک بنا دیا۔

آزاد: خواجہ صاحب کے اور کل اعضا سانچے میں ڈھلے ہیں مگر ناک ذرا بے ڈول ہے، ہے کہ نہیں۔

خوجی: چلیے بس رہنے دیجیے۔

حجام: ہاں ہے تو بے ڈول، کہیے تو کتر لوں ذرا سی ناک بھی۔

خوجی نے جو آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو مونچھ نہیں لنڈورے بنے ہوئے ہیں۔

جھلا کر کہا:

او گیدی یہ کیا کیا؟۔

میاں خلیفہ ہوا ہو گئے کہ کہیں خواجہ صاحب مار نہ بیٹھیں، جھلے آدمی تو ہیں ہی۔

آزاد: کیوں، کیوں خفا کیوں بھئی۔

خوجی: دیکھتے ہیں آپ کیا قطع بنائی ہے۔ نہ ہوئی قرولی سامنے ورنہ آنتوں کا ڈھیر ہوتا سامنے، اور آپ نے بھی نہ روکا۔

آزاد: آپ کو تو خبط ہے۔ بندہ خبطی نہیں ہے۔

خوجی: کیوں خبط کیسا، بچے اول جلول کترے اور آپ نے ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم پر عمل کیا۔ واہ سبحان اللہ، یہ تو وہی مثل ہوئی کہ،،،،

آزاد نے کہا:

میں سچ کہتا ہوں آپ اس وقت انتہا کے حسین معلوم ہوتے ہیں اور وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہ تھی۔

خوجی: کیوں صاحب سہرے کی تو فکر کیجیے۔

آزاد: ہاں ہاں گھبراتے کیوں ہو۔

خوجی: ہم کو یاد آتا ہے کہ دولہا کے سامنے چھوٹے چھوٹے لڑکے غزلیں پڑھتے ہیں۔ دو ایک لونڈے کرایہ پر منگوا لیجیے تو ان کو غزلیں رٹا دیں۔

آزاد: بہت خوب یہ تو عمدہ تجویز ہے واللہ۔

دو ایک لونڈے بارہ بارہ برس کے کرایہ پر منگوائے گئے، اور میاں خوجی ان کو غزلیں زبانی یاد کرانے لگے۔ ایک غزل تو میاں آزاد نے یہ بتائی۔

لاحول ولاقوۃ یہ کون بشر ہے

سب صورت لنگور فقط دم کی کسر ہے

خوجی: چلیے بس اب دل لگی رہنے دیجیے، ہونہہ اچھے ملے۔

آزاد: اچھا سنیے اور سنیے:

پری رو آدمی کا دل نہ ہو کس طرح دیوانہ

تری بہکی ہیں باتیں اور تری چالیں مستانہ

خوجی نے یہ غزل لکھ لی اور دونوں لڑکوں کو رٹانے لگے، دو گھنٹے کے بعد پوچھا:

کہو کیا یاد کیا، پہلا شعر تو پڑھو،

ایک نے یوں پڑھا:

پری رو نہ ہو طرح ادانہ

ترا بہک چاہیں آستانہ

خوجی: (جھلا کر) لاحول لاحول، (دوسرے سے) تم پڑھو۔ دوسرا (بہت اکڑ کر)

پری رو ماؤ ما دیو شانہ

بہک بات اور مست مردانہ

آزاد: یار یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔

خوجی: کچھ پوچھو نہ بھائی۔ لاحول ولاقوۃ۔ رٹاتے رٹاتے ناک میں دم آ گیا، مگر کتے کی دم بارہ برس زمین میں گاڑھی ٹیڑھی ہی نکلی۔

آزاد: تو بہ تو بہ

خوجی: ہاں خوب یاد آیا۔ آپ ذرا باجے والوں کی فکر تو کیجیے، ہاتھی، گھوڑا، ہوا دار فنس، پالکی، جھنڈی بردار، چوب دار، نوبت والے شہنائی والے کے بغیر شادی کیسی۔ مگر ہمارے لیے جو گھوڑا منگوائیے گا ذرا شائستہ ہو، گور سالداری اور کمیدانی کی حالت میں برسوں گھوڑے پر سوار ہوئے مگر اب وہ بات نہیں ہے۔

آزاد: دیکھیے سب فکر ہوئی جاتی ہے۔ بھلا گھوڑا نہ ملے تو خچر کیسا رہے گا؟۔

خوجی: واہ آپ نے مجھے کوئی گدھا مقرر کیا ہے؟۔

آزاد: تو حضرت دریافت کر لینے میں کیا ہرج ہے۔

میاں آزاد نے ہرمزجی سے کہا کہ:

یہ شخص مسخرہ ہے مگر سمجھتا ہے کہ مجھ سے بڑھ کر حسین شخص کوئی دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔

مس میڈا کے بیاہنے کا شوق چرایا ہے۔ میں نے میڈا سے کہہ دیا، ذرا بناؤ

۔وہ تو آپ جانتے ہیں ایک ہی شوخ ہیں۔ان کا ہاتھ چوم لیا۔بس پھر کیا تھا تب سے اینڈتے پھرتے ہیں۔اب سنیئے کہ میڈا نے گھر سے آپ کے نام کو خط بھیجا کہ میرے ساتھ شادی منظور ہو تو آج شام کو آؤ۔نائی کو بلوا کر خط بنوایا ہے۔ذرا قطع چل کر دیکھ لیجیے۔اب کہتے ہیں کہ جس طرح سے ہندوستان سے بارات نکلتی ہے،اسی طرح یہاں بھی ہاتھی اور گھوڑے اور باجے لے کر میڈا کو بیاہنے جائیں گے۔

ہرمزجی: آپ کہہ دیجیے کہ یہاں بالکل شرع کے مطابق شادی ہوتی ہے۔

آزاد: چلیے آپ بھی چلیے۔

ہرمز: اچھا مگر مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکے گی۔

میاں آزاد نے جا کر کہا کہ:

ہرمزجی صاحب کہتے ہیں کہ یہاں شرع کے مطابق شادی ہوتی ہے،باجا لے کے نہیں جاتے۔

ہرمزجی نے کہا:

مبارک۔میڈا اسی حسین عورت واقعی آپ ہی کے قابل ہے۔مگر باجا لے کے جایئے گا تو لوگ آپ پر ہنسیں گے۔ہاں ایک بات ہو سکتی ہے پھول کے برتن دس پانچ آدمیوں کو دے دیجیے،بانس کی چھڑیوں سے وہ بجاتے جائیں گے۔آواز کی آواز۔باجے کا باجا۔

خوجی نے اس رائے کو بہت پسند کیا۔

خوجی: میاں آزاد کی رائے لیجیے۔

آزاد: بالکل ٹھیک ہے۔

خوجی: تو پھر بندوبست کیجیے۔ اب وقت تھوڑا ہے اور سواری کی فکر کیجیے۔

ہرمز: ہمارے نزدیک تو پیدل جایئے یا جس طرح یہاں امیر لوگ جاتے ہیں اس طرح جایئے۔ مگر آپ شاید پسند نہ کریں آدمی کی گود میں۔

خوجی: منظور مگر ہم کو اٹھا سکے گا کوئی۔

آزاد: یہی تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔

ہرمز: ہم اس کا بندوبست کردیں گے آپ گھبرایئے نہیں۔

خوجی: اجی تو اب پھر کب بندوبست کیجیے گا ایسا نہ ہو وقت پر پھر جگت ہنسائی ہو مفت میں۔

ہرمز: (ایک نوکر سے) کوئی جنازہ اٹھانے والوں میں سے دو ایک ہٹے کٹے آدمیوں کو لے آؤ، مگر خوب مضبوط ہوں۔ بڑی دیر تک یہی گفتگو رہی۔ دو گھڑی دن رہے ہوٹل سے خوجی کی بارات چلی۔ تین مزدور پھول کے برتن کو لکڑی سے بجاتے جاتے تھے۔ دو لونڈے آگے پیچھے، خوجی ایک مزدور کی گود میں گیروے کپڑے پہنے ہوئے سر پر سیاہ پگڑی اور سہرا لٹکا ہوا۔ راہ میں جس طرف نکل جاتے ہیں۔ لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ قہقہے پر قہقہہ پڑتا ہے۔ خوجی اکڑے بیٹھے ہیں اور دل ہی دل میں سوچتے ہیں کہ لوگ ہمیں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ایسا خوب صورت جوان کبھی کسی نے کاہے کو دیکھا تھا۔

لڑکوں سے پوچھا:

کہو غزل یاد ہے؟ ہاں کہو پری رو آدمی۔ بولو۔

اب وہ بولیں تو کیا بولیں۔ بولیں تو تب جب کچھ سمجھیں۔

میاں خوجی نے ان کو خوب للکارا، مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

خوجی: اہاہاہاہا۔ ارے رے۔ لاحول ولا قوۃ۔ روک لو، روک، برات روک لو۔ پنشانے والے کہاں ہیں۔ ہائیں کوئی بولتا ہی نہیں۔ پردیس میں بھی انسان پر کیا مصیبت پڑتی ہے۔ افسوس اب میں دولہا بن کر رہوں یا انتظام کروں یا جلوس کا بندوبست کروں، کروں تو کیا کروں۔ یہ دونوں گیدی نرے جانگلو نکلے۔ تو بہ ہی بھلی۔

پھر یاد آیا کہ ہاتھی تو ہے ہی نہیں، اتنے میں ایک جمائی آئی، پھر ایک جماہی آئی۔ ارے اوہوہو۔ افیم پینا بھول گئے۔ مارے خوشی کے یاد ہی نہ رہا۔ کہ افیم ابھی نہیں کھائی، اب کیا کیا جائے۔ پھر یاد آیا کہ قرولی تو پاس ہے ہی نہیں۔ اف غضب ہوگیا، حکم دیا کہ لوٹا دو برات، چلو ہرمز جی کی کوٹھی میں، چلیے برات ہرمز جی کی کوٹھی میں داخل ہوگئی۔

آزاد: یہ کیا، واپس کیوں آئے بھائی، بولو بھائی۔

خوجی: کیا بولیں میاں نشان کا ہاتھی تو تھا ہی نہیں۔

آزاد: بس اسی وجہ سے واپس ہوئے؟۔

خوجی: قرولی تو پاس تھی ہی نہیں۔

آزاد: عجب آدمی ہو بھئی، آپ جنگ کے میدان میں جاتے ہیں یا شادی کرنے، پھر قرولی سے کیا واسطہ۔

خوجی: جس میں بانکے معلوم ہوں۔

آزاد: واہ کیا کہنے بانکے معلوم ہوں۔

خوجی: ہاتھی منگوائیے۔

آزاد: بھائی یہاں ہاتھی کہاں، یہ بھی کوئی ہندوستان ہے کچھ، ہاں ایک بات ہوسکتی ہے کہ خچر پر ایک جھنڈی رکھوادیں یا تم خود ہی ایک جھنڈی ہاتھ میں لے لو۔

خوجی: کیا مصیبت ہے بھئی۔ دولہا بھی ہمیں بنیں۔ جھنڈی بردار بھی ہمیں بنیں۔ لاحول ولاقوۃ۔

اتنے میں مس میڈا بھی آ گئیں۔

آزاد نے کہا لو وہ تو خود ہی یہاں آ گئیں۔

مس میڈا نے ہنستے ہوئے کہا:

ہم نے ان کو بازار میں دیکھا تھا۔ ایک مزدور کی گود میں بہت اکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ اور خدا جانے کون سی دو چیز دو ایک آدمی بجاتے تھے۔

خوجی نے جھک کر میڈا کو سلام کیا۔ اور مسکرا کے میڈا نے سلام کا جواب دیا اور کہا:

واہ آپ خوب آئے''

آزاد نے خوجی کو میڈا کا مطلب سمجھا دیا۔

خوجی: بے حد شرمندگی ہے اس وقت۔ وجہ یہ ہوئی کہ جب برات آدھی دور نکل گئی تو یاد آیا کہ ہاتھی نہیں ہے۔ پھر دس قدم پر جما ہی آ گئی، یاد آیا کہ افیم نہیں کھائی اور تھوڑی دور چلا تھا کہ قرولی یاد آئی۔ لہذا راستے سے لوٹ آیا۔ اب فرمائیے کیا رائے ہے آپ کی؟۔

میڈا: اب اس وقت تو جانے دیجیے کل سمجھا جائے گا۔

میڈا نے خوجی سے کہا:

چلو باہر چاندنی میں سیر کریں۔

خوجی نے کہا

چلیے

میاں آزاد کو بھی ساتھ لیا اور تینوں سیر چمن کرنے لگے۔

میڈا نے کہا:

ہم آپ کا نام بھول گئے۔

خوجی بولے کہ:

خواجہ بدیع صاحب میرا نام ہے۔

میڈا: یہاں ایک فرانسیسی افسر ہے۔وہ مجھے عرصے سے چاہتا ہے۔ پہلے تم اس سے لڑو، پھر ہماری شادی ہو۔

ایک مرتبہ میاں آزاد نے جان بوجھ کر کہا:

ارے میاں خوجی ذرا ایک بات تو سنو"

خوجی کے غصے کا پارہ ایک سو بیس درجے پر تھا۔

بولے:

خوجی پر خدا کرے آسمان پھٹ پڑے۔خوجی مردود ہے کون، مرے خوجی، اسی دم خوجی گدھے سور کا جنازہ نکلے۔خوجی مردود کی ایسی کی تیسی۔خوجی خوجی، ماں باپ نے خواجہ بدیع نام رکھا، یاروں دوستوں نے خواجہ

صاحب، خواجہ صاحب کہا۔ آپ خوجی بنائے دیتے ہیں۔

آزاد: معاف کیجیے۔

خوجی: پھنک گیا، پھنک گیا۔ سر سے پیر تک پھنک گیا، خوجی کہہ کر معافی مانگنا جلے کو اور جلانا ہے۔

آزاد: اچھا پھر اب تو معاف کر دو۔

خوجی: اور کروں گا۔ آخر معاف کرنے کے سوا اور کیا ہے، رنگ پھیکا کر دیا۔

میڈا نے کہا:

کہیئے پھر اس افسر سے کس دن لڑائی ہو گی؟۔

خوجی: نے کہا:

ہم حاضر ہیں، پچاس افسروں سے جنگ کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہم کمیدانی کر چکے ہیں۔ رسال دار رہ چکے ہیں، دگلے والی پلٹن نے وہ نام کیا کہ کیا کسی نے کیا ہوگا۔ ایسی لڑی، ایسی لڑی کہ واہ ہے۔ اور ہم نے دگلے والی پلٹن کی وہ رسال داری کی کہ دھوم ہے۔ کوئی پلٹن ایسی نہ تھی، اختری، نادری، جنگی افسر جیسے وہ تھے، ویسے ہم تھے۔ دونوں فوجی افسر جب لڑیں گے تو خوب لڑیں گے۔ مگر شرط یہ ہے کہ میاں آزاد ہم کو ایک قرولی خرید دیں۔

میاں آزاد، اور مس میڈا اور ہرمزجی نے باہم مشورہ کیا اور مشورہ کر کے خوجی سے کہا کہ:

کل صبح کو آپ تیار ہو کر رہیئے گا۔

خواجہ صاحب نے کہا:

اجی ہم تیار ہیں۔

سویرے منہ اندھیرے میاں خوجی اٹھے، منہ ہاتھ دھویا۔ جوڑی کے کئی ہاتھ ملائے۔ کوئی تین چار، جی اور نہیں تو کیا۔ تھوڑی دیر میں مس میڈا بھی آ گئیں اور خوجی کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

خوجی: واہ رے میں۔

میڈا نے دیکھا اور کھل گئیں۔

آزاد نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ:

"عبید اللہ اس کمرے میں بیٹھے ہیں ذرا ان کو بلا لاؤ۔"

عبید اللہ ایک مشہور و معروف ترکی پہلوان تھے، جیسے ہی وہ سامنے آئے۔

میاں آزاد نے کہا:

لیجیئے یہی وہ افسر ہیں۔

خوجی کے ہوش اڑ گئے کہ یا الٰہی یہ آدمی ہے یا دیو۔

دنیا بھر کے آدمیوں سے دو مٹھی اونچا، اس سے جیتنا محال ہے۔ آج ذلیل ہوئے مگر خیر شاید ڈپٹ میں آ جائے۔

ترکی پہلوان نے جو سکھایا پڑھایا ہوا تھا۔ قہر آلود نظر ڈالی تو خوجی کے رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے۔

دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ:

آج ہڈی پسلی ٹوٹی۔ یہ تو کچا ہی کھا جائے گا، ایک چپت دے تو ہم زمین میں دھنس جائیں، مقابلہ اس سے کون کرے گا بھلا۔

ترکی پہلوان نے پھر ان کی طرف قہر کی نظر سے دیکھا، خوجی مارے ڈر کے ذرا دور ہٹ بیٹھے۔

مئیڈا نے کہا:

آپ تو ابھی سے ڈرنے لگے۔

خوجی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک دفعہ بیٹھ گئے اور کہا:

یارو ذرا ڈاکٹر کو بلاؤ۔ اس طرح کا درد ہو رہا ہے کہ کچھ نہ پوچھو، ایک دفعہ جب ہم دگلے والی پلٹن میں نوکر تھے، تب بھی ہوا تھا اور اب بھی ہو رہا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس وقت بھی ہم اپنی پہلوانی کے جوہر نہ دکھا سکے۔ واللہ ہے اٹھا کے ایسی پٹخنی دیتا کہ توبہ ہی بھلی۔

اتنے میں ترکی پہلوان نے ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکا دیا تو میاں خوجی کرسی پر سے دس قدم کے فاصلے پر جا گرے اور پینترے بدل کر کہا:

او گیدی نہ ہوئی قرولی، ورنہ ڈھیر کر دیتا۔

آخر کار اس بات پر فیصلہ ہوا کہ

خوجی کا درد رفع ہو جائے تو پھر کسی روز زور آزمائی ہو گی۔

آزاد پاشا ترکی فوج کے جونئیر افسر

اگلے دن نور کے تڑکے میاں آزاد اٹھے، اور ہرمز جی کے گھوڑے پر سوار ہو کر سمندر کے کنارے گئے کہ ادھر ادھر ہوا کھا آئیں۔ دو گھڑی دل بہلائیں۔

سیر کر کے میاں آزاد خوش خوش ہرمز جی کی کوٹھی پر واپس آئے، ہرمز جی کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد دونوں میں باتیں ہونے لگیں۔

آزاد: خدا کرے کہیں تقرری کا حکم نامہ آئے۔

ہرمز: گھبرایئے نہیں آتا ہو گا، صبح یا شام آیا ہی چاہتا ہے۔ دل گواہی دیتا ہے، دو ہی دن میں دیکھیں گے کہ میاں آزاد وردی پہنے مورچے پر جا رہے ہیں۔

آزاد: خدا وہ دن جلد دکھائے، ہم کو تو ناامیدی سی ہو گئی ہے۔

ہرمز: یہ کیوں مایوسی کیسی، کل تک حکم نامہ ضرور آئے گا۔

آزاد: سچ کہوں یقین نہیں آتا۔ خیر دو دن اور سہی دنیا امید پر قائم ہے۔ مگر اب ایک ایک دن ایک ایک برس کے برابر ہے۔ کب تک انتظار کیا جائے۔

یہ گفتگو ہوتی ہی تھی کہ ایک آدمی نے پوچھا:

میاں آزاد یہاں پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔

ہرمز جی نے اس آدمی کو غور سے دیکھا اور کہا:

آپ اپنا مطلب کہیئے۔

اس نے کہا۔

ان کے نام ایک خط لایا ہوں۔

ہرمز جی نے کہا:

میاں آزاد یہ بیٹھے ہیں، خط ان کو دیجیے۔

میاں آزاد نے خط لیا۔ کھولا۔ ۔پڑھا تو اچھل پڑے اور کہا۔

لیجیے حضرت فوجی عہدہ تو خدا کے فضل سے مل گیا۔

ہرمز: ہاں شکر ہے۔ شکر ہے۔ کیوں میں نے کیا کہا تھا صبح شام حکم نامہ آیا ہی چاہتا ہے۔ مبارک ہو۔ اب آپ تیاری کیجیئے۔ خدا آپ کو اسی طرح کام یاب کرے۔

آزاد: رسالے میں جونیئر کمیشن ملی۔ مگر خوشی یہ ہے کہ رسالے کی افسری عطا ہوئی۔

ہرمز: ہاں اس میں کیا شک۔ ہم بھی رسالے ہی کو پسند کرتے ہیں۔

آزاد نے خط پڑھ کر سنایا:

حضور وزیر جنگ کے حکم سے آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ آپ ترکی کی افواج میں جونیئر کمیشنڈ افسر مقرر ہوئے ہیں۔ آپ کو رسالے کی جونیئر افسری عطا کی گئی ہے۔

ہرمز: اس وقت جامے میں پھولے نہیں سماتا۔

آزاد: امید ہی آپ سے ایسی تھی، آپ میرے سچے دوست ہیں۔

ہرمز: اب دعا یہ ہے کہ آپ کام یاب ہو کر آئیں اور جنگ کے میدان میں آپ کا نام ہو۔

آزاد: آمین۔ انشا اللہ۔ یوں تو ناکامی اور خوش نصیبی اتفاق پر منحصر ہے۔ مگر میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑوں گا۔ باقی سب اختیار خدا کے ہاتھ میں ہے۔

ہرمز: میاں خوجی سے تو خوش خبری کہیے، وہ ہیں کہاں اس وقت۔

آزاد: ہاں خوب یاد آیا۔ ان کو تو بھول ہی گئے تھے ہم۔ بلوایئے۔ بلوایئے۔

ہرمز: ایک آدمی ادھر آؤ۔ ان کے ساتھ جو صاحب آئے ہیں۔ ان کو بلا لاؤ۔

اب سنیئے کہ خواجہ صاحب کو آدمی نے کوٹھی بھر میں ڈھونڈ مارا۔ ہوٹل میں تلاش کیا، چوطرفہ دیکھا مگر ان کا پتا ہی نہ تھا۔ جب تھک گیا تو آ کر کہا۔

حضور وہ تو کہیں ملتے ہی نہیں۔

ہرمز جی نے مسکرا کر کہا۔

کہیں مس میڈا کی تلاش میں تو نہیں گئے۔

میاں آزاد اٹھے کہ ہم ڈھونڈیں گے۔ ہرمز جی اور دو چار آدمی چلے۔ اس کمرے میں دیکھا۔ اس کمرے میں دیکھا۔ ادھر ڈھونڈا، ادھر ڈھونڈا، کہیں پتا ہی نہیں۔

ہرمز: کہیں میڈا کے پھیر میں تو نہیں گئے ہیں صبح صبح۔

آزاد: جناب ان سے کسی بات کا تعجب نہیں، عجب بے تکا آدمی ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔

ہرمز: یہ چلے کہاں گئے۔ دال میں کالا ضرور ہے۔

آزاد: خدا جانے لڑ بیٹھا کسی سے یا کسی کو گالی دے بیٹھا۔ خدا کی مار اس پر۔

ہرمز: یہ آپ ان کو ساتھ کیوں لائے۔ آپ بھی دل لگی باز ہیں، یہ باتیں ہوتی ہی تھیں کہ ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا، مسکرا کر کہا:

حضور آیئے میں بتا دوں کہاں ہیں۔ مگر جلد آیئے۔

میاں آزاد اور ہرمزجی اس کے ساتھ چلے تو دیکھا کہ ایک کوٹھری میں انگیٹھی کے قریب سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ایک ہاتھ میں چمٹا ہے، دوسرے میں چلم۔دونوں کو بے اختیار ہنسی آئی، کھل کھلا کر ہنس پڑے مگر وہ نشے ہی میں رہے۔

میاں آزاد نے لکڑی سے سر کو سہلانا شروع کیا تو یوں منمنا کر بولے:

اوگیدی بھونک دوں قرولی"

آزاد جھلائے ہوئے تو تھے ہی۔ایک چپت جمائی، چپت کھاتے ہی خوجی آگ بگولہ ہو گئے۔آنکھ کھولی تو دیکھا ادھر انگیٹھی، ادھر چلم اور چمٹا زمین پر۔اور میاں آزاد سات آٹھ آدمیوں کو لیے کھڑے ہیں۔نہایت شرمندہ ہوئے۔

میاں آزاد خوجی کو کوٹھی میں لائے۔

ہرمزجی نے کہا:

خواجہ صاحب مبارک ہو۔آپ کے میاں آزاد نے فوجی عہدہ پایا۔

خوجی کی باچھیں کھل گئیں، اچھل پڑے، ہرمزجی کے قدموں پر ٹوپی رکھ دی اور کہا۔

دیکھیے اور چاہے جس بات میں ہنسی مذاق کیجیے مگر اس میں نہیں، اب سچ سچ بتائیے کیا واقعی حکم آ گیا ہے۔

میاں آزاد نے وہ حکم نامہ دکھایا، خوجی نے چھین لیا۔اور دس مرتبہ اس کو چوما اور رو رو کر کہا:

آزاد: جس عنایت سے تم ہمارے ساتھ پیش آئے۔اس کا شکریہ ہم ادا نہیں کر سکتے۔بس اب ہم چاہے زندہ رہیں یا مر جائیں کچھ پرواہ نہیں، اور تو ہم کسی

مصرف کے ہیں نہیں سائیسی کریں گے۔

اس پر میاں آزاد اور ہرمزجی مسکرائے۔تو خواجہ بدیع صاحب بہت جھلائے۔ کچھ تمیز بھی ہے۔بس ہنس دیئے۔سائیسی علم دریاؤ ہے۔کچھ دل لگی نہیں برسوں میں انسان کھر پالینا سیکھتا ہے۔

آزاد:سوچ لوں تو جواب دوں،جلدی کیا ہے؟۔

میاں آزاد کمرے میں جا کر پلنگ پر لیٹ گئے،کمرے کے دروازے سب بند کردیے،اور سوچنے لگے،ٹکا تو ہمارے پاس نہیں اور ہم رسالے کے افسر مقرر ہوئے،جب دس ہزار روپیہ ہوتو کہیں مناسب انتظام عمل میں آئے۔دس ہزار کے بغیر تیاری محال ہے۔اور دس ہزار روپیہ ملنا غیر ممکن۔مردہ چاہے جی اٹھے مگر دس ہزار روپیہ ہم کو کوئی نہ دے گا۔اجنبی آدمی،پرایا ملک۔دس ہزار روپیہ مل جانا کوئی خالہ جی کا گھر تھوڑا ہی ہے۔گورنمنٹ ترکی سے پیشگی قرض کے طور پر مانگنا نا مناسب ہے۔ ہرمزجی گو بڑے سچے دوست ہیں،مگر ان سے اس قدر بڑی رقم کیوں کر مانگیں،ممکن نہیں کہ دو دن کی ملاقات میں دس ہزار روپیہ کوئی دے دے۔مفت میں بات کھونا فضول ہے۔اب روپیہ آئے تو کہاں سے آئے۔اس خیال نے میاں آزاد کو پریشان کردیا۔یہاں تک کہ مایوس ہو گئے،اور سوچا کہ بس بچے پڑھانے سے جو کچھ ملے اسی پر بسر کرو۔ہندوستان جانے کا نام زبان پر مت لاؤ۔حسن آرا بے وفا سمجھیں گی مگر مجبوری ہے۔اپنی حالت پر میاں آزاد کو بے حد افسوس ہوا۔سوچا کہ ہم آئے کس لیے تھے،اس لئے کہ جنگی عہدہ پائیں اور سرخرو ہوں۔حسن آرا بیگم کو بیاہیں،مگر افسوس ہزار خرابی کے بعد یہاں پہنچ کر عہدہ بھی پایا

لیکن بے سود۔ بدنصیبی یہاں بھی ساتھ آئی۔ میاں آزاد کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

بڑی دیر تک میاں آزاد اسی خیال میں آہ بھرا کیے۔ یقین ہوگیا کہ میدان جنگ میں جانا نصیب نہ ہوگا۔ سوچا کہ رنج وغم کرنا فضول ہے۔ مگر ہندوستان واپس نہ جائیں گے۔ اتنے میں ہرمزجی نے پکارا:

میاں آزاد: میاں آپ بہت سوئے ہیں آج"

آزاد چپ چاپ سنا کیے، تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھولا۔ باہر آئے اور میاں آزاد، خوجی اور ہرمزجی نے چائے پی۔

ہرمزجی نے کہا:

اس وقت میاں آزاد کچھ افسردہ پائے جاتے ہیں، وہ لطف وہ لطیفہ گوئی نہیں ہے۔ بلبل کی طرح چہکتے ہوتے تھے۔ اس وقت مگر شاید جو اتنی دیر سوئے تو طبیعت سست ہوگئی۔

آزاد: جی ہاں اس وقت سر میں درد ہے اور طبیعت بھی پریشان ہے۔

چائے پی کر ہرمزجی اپنے ایک دوست کے پاس چلے گئے۔

اتنے میں میڈا آئیں، اٹھلاتی ہوئی کمرے میں تشریف لائیں۔ آزاد کو دیکھا کہ ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے ہیں۔ قریب کی ایک کرسی پر بیٹھیں، جس تپاک کے ساتھ آزاد پیش آیا کرتے تھے، وہ منزلوں دور تھا۔ ماتھا ٹھنکا۔

میڈا: کیوں طبیعت کیسی ہے۔ اس وقت چہرہ اترا ہوا ہے۔ اور اداس معلوم

ہوتے ہو۔کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔عہدہ ملنے کی خبر پاتے ہی ہم آئے کہ مبارک باد دیں،تم کواس وقت خوش ہونا چاہیئے یا مغموم۔یہ الٹی بات کیسی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

آزاد: کچھ نہیں طبیعت ہی تو ہے۔اچھا ہوں۔

میڈا : کوئی وجہ ضرور ہے ۔بلا سبب انسان مغموم نہیں ہوتا ،وجہ بیان کیجیے ۔تعجب ہے کہ عہدہ پاتے ہی آپ افسردہ ہو گئے،اس کا کیا سبب ہے۔

آزاد نے کہا: میڈا تم سچ کہتی ہو۔میں واقعی پریشان ہوں۔میرے چہرے سے رنج اور غم ظاہر ہوتا ہوگا۔اور مجھے اس قدر رنج ہے کہ عمر بھر کبھی نہیں ہوا ہوگا۔ مگر دردلا دوا ہے۔علاج ممکن نہیں۔

میڈا نے کہا:

آخر کچھ تو معلوم ہو۔اگر دردلا دوا ہے تو مجبوری ہے۔مگر سنیں تو سہی۔

آزاد نے کہا:

تم سے میں نے کوئی بات نہیں چھپائی،سب کچھ صاف صاف بیان کر دیا ہے۔اب میں بڑی شرمندگی کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھے جونیر افسری رسالے کی ملی ہے۔لیکن ٹکا پاس نہیں اور کم سے کم دس ہزار روپیہ پاس ہو تو کام نکلے۔یہاں یہ کیفیت ہے کہ دس ہزار روپیہ کیا معنی دوسو کا بھی کہیں سہارا نہیں۔حسن آرا بڑی مال دار ہیں۔ایک ذرا سے اشارے پر ہزارہا بھیج دیں۔مگر حسن آرا سے روپیہ منگوایا تو عزت خاک میں مل جائے گی۔

میڈا نے کہا:

اب اس کی تم کچھ فکر نہ کرو۔ہم سمجھ لیں گے۔دس ہزار روپیہ ہی ہے نا۔پھر یہ

کون سی بات ہے، میں ابھی آتی ہوں"

میڈا ان سے رخصت ہوئیں اور آن کے میاں آزاد کو ایک لفافہ دیا اور کہا، اس وقت جاتی ہوں، کل آؤں گی۔

اب ادھر میڈا رخصت ہوئیں ادھر میاں آزاد نے لفافہ کھولا تو اچھل پڑے، استنبول بنک کے نام بیس ہزار کا چیک پایا۔

آزاد وزیر جنگ کی ملاقات کو گئے، جھک کر آداب بجالائے اور کہا:

میں تیار ہوں کہ اپنے لشکر میں شامل ہوں، جس روز حکم دیجیے۔حاضر خدمت ہوں۔

وزیر جنگ بڑی عنایت اور مہربانی سے پیش آئے اور فرمایا:

ہم تم سے نہایت خوش ہیں، دو تین دن میں تم ہمارا حکم پاؤ گے۔یہ کہہ کر آزاد کو ایک بیش قیمت تلوار دی اور کہا: خدا کرے تم اس شمشیر سے بڑے بڑے کام کرو۔

وزیر جنگ سے رخصت ہو کر آزاد پاشا بنک گئے اور چیک دیا اور ترکی کے چمکتے دمکتے سکے گنوائے۔بنک کے ایک ملازم سے پوچھا کہ ہندوستانی سکے کے مطابق یہ کس قدر روپیہ ہوا۔

اس نے کہا۔

بیس ہزار۔

گھوڑے پر سوار ہو کر ہرمز جی بھائی کی کوٹھی میں داخل ہوئے۔

دوسرے دن صبح کو میڈا آئی اور آزاد میاں کو نہایت خوش پایا۔آزاد نے کھڑے ہو کر تعظیم کی اور قریب کی کرسی پر بٹھایا۔

آزاد: بس اب ایک بات اور باقی ہے۔ صرف ایک ہی بات:

میڈا: کہو کہو اس قدر اصرار کیوں کرتے ہو؟۔

آزاد: تم خوب جانتی ہو میڈا کہ میں تمھارا بڑا مشکور ہوں اور ممنون ہوں۔

میڈا: ۔ ایسی باتیں ہم سننا ہی نہیں چاہتے۔ صاف مطلب کہیے۔

آزاد: اس درجہ احسان کر کے زبان پر نہ لانا بڑے عالی ظرفوں کا کام ہے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ آزاد کے نام وزیر جنگ کا خط آیا۔ جس کے لفافے پر یہ لکھا تھا:

آزاد پاشا جونیر کیولری افسر کو ملے۔

اس میں وہی حکم نامہ تھا جس کے بھیجنے کا وزیر جنگ صاحب نے آزاد سے وعدہ کیا تھا۔

آزاد تر کی فوج میں

میاں آزاد ہرمزجی بھائی کی کوٹھی سے رخصت ہو کر اپنی رجمنٹ میں شریک ہونے گئے کہ تھوڑی دیر میں گھڑ گھڑاہٹ کی آواز آئی۔

خوجی نے چونک کر کہا:

یہ کیا ہے؟۔ یہ آواز کیسی ہے۔افوہ کس قدر گھڑ گھڑاہٹ ہے کہ خدا کی پناہ۔اب ہم سمجھ گئے کہ زلزلہ آنے والا ہے۔

ہرمزجی زلزلہ کے معنی نہیں سمجھے مگر خوجی کو شک نہیں پورا یقین تھا کہ ضرور زلزلہ آنے والا ہے۔ایک مرتبہ میاں آزاد سے سن چکے تھے کہ جب زلزلہ آتا ہے تو اکثر مقامات پر زمین کے اندر سے ایک قسم کی آواز آنے لگتی ہے۔اور معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی شخص زمین کے اندر بندوقیں داغ رہا ہے یا چاند ماری ہوتی ہے۔

اتنے میں ہرمزجی کے آدمی نے کہا:

حضور فوج جاتی ہے۔

ہرمزجی اور مِیڈا اور میاں خواجہ بدیع صاحب کوٹھے پر گئے۔دیکھا فوج سامنے آرہی ہے۔پہلے توپ خانہ دیکھا یہ اس کی گھڑ گھڑاہٹ تھی۔اس کے بعد فوج کے دستے آنے شروع ہوئے۔دیکھتے ہی دیکھتے مس مِیڈا کی نظر میاں آزاد پر پڑی۔بائیں ہاتھ سے گھوڑے کی باگیں اٹھائے یہ جا وہ جا۔خوجی کی سنیئے کوٹھے پر سے پکارتے ہیں:

میاں آزاد،میاں آزاد۔ہوت،ارے میاں ادھر:

ہرمز جی: ہائیں خاموش رہو جی بھلا یہ کوئی موقع ہے کسی کو پکارنے کا۔

خوجی: واہ خدا جانے کیا گالیاں دے رہے ہیں سنتا اور سمجھتا کون ہے؟۔

ہرمز جی نے ایک اردو دان کو بلوایا اور کہا:

ان کو سمجھادو کہ جب فوج جاتی ہےتو اس طرح بے دھڑک نہ پکارا کریں۔اس وقت غل مچا کر میاں آزاد، میاں آزاد پکارا کیے۔عجیب وحشی ہیں اور ہم سمجھاتے ہیں تو جواب ہی نہیں دیتے۔

اردو دان ہندوستانی آدمی تھے۔وہ خوجی سے کہتے ہوئے کس قدر ڈرے کیونکہ ان کے مزاج سے سب واقف تھے۔

ہرمز جی نے اصرار کرکے کہا:

جو ہم کہتے ہیں ،ان کو سمجھادو مگر ذرا ملائم الفاظ میں،ان کو بات کی تاب نہیں۔

ہندوستانی: حضور کہتے ہیں کہ فوج کا واسطہ بے ڈھب ہے۔اب کبھی اس طرح نہ پکاریے گا۔آپ نے شاید یہیں سے آزاد آزاد کہہ کر پکارا تھا۔

خوجی: واہ ہیں۔عجب ڈرپوک آدمی ہیں۔کیا کوئی گولی مارتا یا توپ کھینچ مارتا۔ہم بھی تو پلٹنوں مین رہ چکے ہیں۔بھائی رسالداریاں کی ہے۔کمیدانیاں کی ہیں۔سپاہی پرسپاہی ہاتھ ہرگز نہ اٹھے گا۔

اس نے خوجی کی بات ہرمز جی کو سمجھادی۔

ہرمز جی: پوچھو تمہارے غل مچانے سے کیا وہ چلے آئے ،بس اتنا پوچھ لو تم جو چلائے وحشت میں آن کرتو اس سے تمہیں یہ امید تھی کہ وہ چلے ہی آئیں گے۔

خوجی: پوچھو یہ جھگڑا کیا ہے۔آپ کو ان باتوں سے کیا مطلب ہے؟۔میاں آزاد نے اس طرف دیکھا تھا، ہماری ان کی آنکھیں بھی چار ہوئی تھیں۔

ہرمز:مئیڈا سے کیا میاں آزاد نے اس طرف نظر کی تھی؟۔ہم نے تو نہیں دیکھا

مئیڈا:وہ اسوقت رو میں چلے جاتے تھے۔ان کو تو شاید

یہ بھی معلوم نہ ہوسکا ہوگا کہ یہ مسٹر ہرمز جی کی کوٹھی ہے یا کوئی اور مقام ہے۔

اب سنیئے، جس وقت شہر سے فوج جنگی سامان اور آن بان سے مصر کے لیے چلی تو تمام شہر میں دھوم مچ گئی کہ لشکر محاذ پر جاتا ہے۔گو فوجی افسر اور ترکی سپاہی سب خوبرو اور سب کڑیل جوان تھے۔مگر آزاد پر اور ہی عالم تھا۔میاں آزاد کے چہرے سے شان سپہ سالاری ظاہر تھی۔یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی شہزادہ یا کوئی جنرل ہے۔

لوگ مکانوں، دکانوں، کوٹھیوں، چھتوں اور بازاروں میں بڑے جوش خروش اور کوشی کا اظہار کرتے تھے۔کسی نے لشکر دیکھ کر رومال ہلایا۔کسی نے مرحبا مرحبا کا شور مچایا۔کسی نے دعا مانگی کہ خدایا اس ملک کے خیر خواہوں کو خوش اور بامراد رکھ۔سرخرو ہو کر واپس آئیں۔خوشی کے ڈنکے بجائیں۔دشمن شکست فاش کھائے، ترکی رنگ رلیاں منائے۔ترک دوست مسجدوں مین گھی کے چراغ جلائیں۔دشمن منہ کی کھائیں۔کوئی جزاک اللہ کا نعرہ بلند کرتا ہے۔کوئی سپاہیوں کی نمک حلالی کا دم بھرتا ہے۔لڑکے تالیاں بجاتے تھے۔بوڑھے دل ہی دل مین دعائے خیر دیتے تھے۔

ترکوں کی فوج دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔میدان جنگ میں پہنچے اور شیر بن

گئے، ملک کے نام پر جان دیتے ہیں چاہے دو دن تک کھانا نہ ملے۔ مگر دشمن کو پیٹھ نہ دکھائیں گے، قتل کریں گے اور مر جائیں گے۔ لو کی شدت، سورج کی گرمی۔ سردی کی کثرت ایک کو نہ مانیں گے۔ چاہے برف گرے چاہے کہرا پڑے یا ہوا سے جگر تک ٹھٹھرا جائے مگر ترکی سپاہی کا قدم پیچھے نہ ہٹے گا۔

جس وقت فوج شہر سے باہر جاتی تھی، ایک میلہ سا جما ہوا تھا۔ کوٹھے پھٹے پڑتے تھے، تماشائی زمین کے ایک ایک چپے کے لئے لڑتے تھے۔ الغرض تمام شہر میں دھوم مچی تھی۔

جب فوج شہر سے باہر پہنچی تو آزاد پاشا اور ایک افسر علیقو پاشا میں باتیں ہونے لگیں:

علیقو: آپ نے ملاحظہ کیا، کس قدر جوش ہے۔

آزاد: بے شک اور یہ جوش قابل قدر ہے۔

علیقو پاشا نے میاں آزاد سے پوچھا:

دشمن اب کس مقام پر ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ شہر سے گرد نمودار ہوئی اور رفتہ رفتہ بلند ہونے لگی۔ لشکریوں نے بھانپ لیا کہ وزیر جنگ نے کچھ ہدایت کی ہے۔ کئی سوار بگٹٹ اور سرپٹ گھوڑے دوڑاتے آتے ہیں۔ ورنہ اس قدر گرد نہ بلند ہوتی۔ شہر میں تو خیر یوں ہی سب کے سب قرینے کے ساتھ آئے تھے۔ مگر شہر پناہ کے باہر پہنچ کر پورے جنگی قاعدے سے جاتے تھے۔ جس وقت گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی، افسر کمانیر نے حکم دیا کہ:

''فوج آگے نہ بڑھے''

سب رک گئے مگر کچھ دیر تک سوائے گرد کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ اور سوائے ٹاپوں کے اور کوئی آواز سنائی نہ دی۔ جب قریب آئے تو دیکھا کہ دس سوار مارا مار چلے آتے ہیں۔ سواروں نے آن کر کہا:

وزیر جنگ کا حکم لائے ہیں۔

افسر کمانیر نے وزیر جنگ کا خط لیا اور پڑھ کر لشکریوں کو سنایا۔

اس کے بعد آزاد پاشا کو حکم دیا کہ کل سواروں اور جوانوں اور توپ خانے والوں کو سنا دو۔

آزاد پاشا نے گھوڑا اپنی صف سے نکالا اور وہ کاغذ لے کر تھوڑا آگے بڑھایا اور سب کو اس کا مطلب سنا دیا۔

اس کے بعد افسر کمانیر نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے یوں فرمایا:

اے میرے پیارے جوانو!

تم کو حضور وزیر جنگ کی ہدایت سے معلوم ہوا ہوگا کہ روسی لشکر کے نوے ہزار آدمی دریائے ڈینیوب کو عبور کر آئے ہیں۔ ان کے روکنے کا پورا بندوبست کیا گیا تھا۔ مگر خدا جانے کس راہ سے چلے آئے، جب ہماری فوج ان کے مقابلے کے لئے گئی تو کوئی پچیس ہزار روسی اتر آئے اس جماعت نے ہماری فوج جو تعداد میں بہت کم تھی، مقابلہ کیا۔ گو ہماری جماعت کم تھی مگر پھر بھی بڑی دیر تک جرات کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرتی رہی۔ اور باوجود متواتر حملوں کے اپنی جگہ سے نہ ہٹی۔ اس جنگ سے روسیوں کو ایسا موقع ملا کہ ان کی باقی فوج بھی اتر آئی۔ اب یہ وقت ہے کہ ایک ایک ترک اپنے دشمن کے خون کا پیاسا ہو اور دشمن کو نیچا دکھائے۔

افسر کمانیر: کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا۔

لشکری: کیا مجال، کیا طاقت۔ہم لوگ ان میں نہیں ہیں جو بھاگ جایا کرتے ہیں۔

علیقو پاشا: شاباش۔

افسر کمانیر: حضور جنگ فرماتے ہیں کہ آزاد پاشا کو بہت عزیز رکھنا۔

آزاد: آزاد اسلام کا خادم ہے۔آزاد ترکی کا نوکر ہے۔میدان جنگ میں جان ہتھیلی پر رکھے جاتا ہے۔آزاد زندہ واپس نہ آئے گا۔اور اگر آئے گا تو پہلے روسیوں کو نیچا دکھائے گا۔

لشکر نے نعرہ مارا اور فوج آگے بڑھی، پیغام لانے والے سپاہی رخصت ہوئے۔شام کے وقت ایک گاؤں کے قریب فوج نے پڑاؤ ڈالا۔

دولھا کی مرمت

اخاہ میاں خواجہ بدیع الزماں ہیں۔آیئے حضرت ماشا اللہ کیا ترخ ترخ نور برس رہا ہے۔

سب صورت لنگور فقط دم کی کسر ہے۔

قد وقامت پر نظر ڈالیے تو پون انچ مگر سمجھتے ہیں کہ ہم گراں ڈیل جوان ہیں۔

میاں خوجی ہرمزجی بھائی کی گاڑی پر سوار ہو کر مس روز کی طرف گئے۔ایک لڑکی گیل جس کا نام تھا،پر فضا باغ میں ٹہل رہی تھی۔ان سب سے ہرمزجی نے خوجی کو ملا دیا اور یہ سب ان کو بناتی تھیں۔خوجی گاڑی سے اترے اور گیل کو سلام کر کے پوچھا:

خوجی:مس روز کہاں ہیں،کہاں گئیں؟۔

گیل:مسکرا کر ہم نہیں سمجھے۔

گیل نے ایک ترکی باغبان سے کہا:

ان کو سمجھا دو کہ مس روز،مس میڈا کے ساتھ ہوا کھانے گئی ہیں۔

آپ بیٹھیے،آتی ہوں گی۔

باغبان نے کہا:بیٹھو۔آویں دونوں گیا باہر۔

خوجی:تم ہندوستان سے آئے ہو؟

باغبان:آں (ہاں) کلکتہ گیا۔دو برس،بس چلے۔

خوجی:ان سے کہہ دو۔ہم جاتے ہیں،ہمارے مکان پر خط لکھوا کے بھیج

دیں۔

باغبان: کہہ دیں ہم کیوں اچا (اچھا)

خوجی نے مس گیل سے ہاتھ ملایا اور گاڑی پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔

ادھر ہرمز جی کو جو دل لگی سوجھی تو انہوں نے مس گیل اور مس میڈا سے کہا۔ کل ہم خوجی کی برات نکلوائیں گے۔ تینوں میں باہم مشورہ ہوا۔

اتنے میں خوجی آن پہنچے،

ہرمز جی نے کہا لو تمہاری شادی کی فکر ہو گئی۔

مس روز راضی ہیں۔ کل برات لے کر آؤ۔

خانساماں کو بلوایا گیا، تا کہ خواجہ صاحب گفتگو سمجھتے جائیں۔

خوجی: خدا کرے وزیر جنگ وغیرہ بھی خود برات میں رونق افروز ہوں۔

ہرمز جی: سب بڑے بڑے لوگ اس برات کو خود آ کر ملاحظہ کریں گے۔

خوجی: واللہ تو پھر بندوبست کر لیجیے۔

میڈا: ہاتھی کا ملنا محال ہے اور اونٹ خواجہ صاحب کو ناپسند ہے۔

ہرمز جی: یہ کیوں؟۔

خوجی: اجی ایک روز میں چلا جاتا تھا، سامنے سے ایک شتربان آتا تھا۔ باتوں باتوں میں بگڑ گیا، میں نے کہا مارے قرولیوں کے چندصیا دوں گا۔ اس نے ہنس کر کہا:

بیدھا تو نہیں ہے۔ بس میں لپکا۔ اب لاکھ لاکھ تدبیر کرتا ہوں اس تک ہاتھ نہیں پہنچتا۔ تب سے میں نے اس جانور پر لاحول بھیجا۔

ہرمزجی: گھوڑا شریر ہوتا ہے۔اور بیل اور گدھا واہیات جانور ہیں۔خچر کی رائے بہتر ہے۔

خوجی: خوب سوجھی استاد۔خچر تو امیروں کی سواری میں رہتا ہے۔عمدہ خچر کی جوڑی ہزار سے کم کی تو نہ آئے گی۔مگر یار طبلے پر تھاپ ضرور ہو۔

ہرمزجی: یہاں شادی بیاہ میں آدمی کا ناچنا بالکل ممنوع ہے،اور جو کوئی عورت ناچے تو ستم ہی ہو جائے۔

خوجی: اچھا پھر کسی سبیل سے ناچ کا تو نام ہو جائے۔

ہرمزجی: اس کی تدبیر یوں کیجیے کہ کسی ریچھ یا بندر نچانے والے کو بلا لیجیے۔کم خرچ اور لطف کا لطف تین بندر والے کافی ہیں۔

خوجی: حضرت تین چار نہیں پانچ مبارک فال ہے۔

ہرمزجی: خیر وہ پانچ ہی سہی۔

خوجی: مگر وہ ہر شخص کو کہہ دیا کریں کہ صرف راہگیروں کو خوش کرنے کے لئے تماشا دکھاتے ہیں۔تاکہ دولھا انعام دے۔اور بارات کی طرف سے ناچ کا سامان علیحدہ ہوا ہے۔اور دلھن کے ہاں مختلف قسموں کا ناچ رنگ ہوتا رہے گا۔جب لوگ باہر سن چکیں گے کہ یہ دولھا کی جانب سے ہے،تو اندر کون تحقیقات کرنے بیٹھے گا۔کہ کس کی طرف سے ناچ ہے۔خرچیں وہ اور نام یاروں کا۔کہیں یار لوگ چوکنے والے ہیں بھلا۔

ہرمزجی: اہو ہو بھئی واللہ کیا سوجھی ہے۔باقی رہی روشنی مشعل لے جانا،تو شمع دام اور لیمپ دھکے میں ٹوٹ جائے گا۔اس لئے دس پانچ آدمی بڑے بڑے

چراغوں میں تیل بھر کر ماش کے پتلے جلاتے لے چلیں تو کیسا؟۔

خوجی: ابھی یہاں ایسا سمجھنے والا کون ہوگا۔ لوگ غور کریں گے تو سمجھیں گے کہ ریچھ اور بندر والے رات کو تماشا دکھانے کے لئے روشنی ساتھ لیے پھرتے ہیں۔

دوسرے دن قریب شام سب سامان تیار ہوا، خوجی سج سجا کر سوار ہونے لگے۔

ہرمزجی: اس قرولی نے آپ کو اور بھی اونچی بنا دیا۔ (مسکرا کر) شادی مبارک ہو۔

اب ہرمزجی جلدی سے مئیڈا کے ہاں پہنچے۔

مئیڈا: ہنس کر بارات کہاں ہے؟۔

ہرمزجی: چل چکی ہے۔ آج ذرا قطع مبارک دیکھے گا۔

مئیڈا: تو چلیے ہم سب مل کر سڑک پر بارہ دری میں بیٹھیں گے۔ ہرمزجی، مئیڈا اور مسروز سب مل کر بارہ دری میں بیٹھے، اور چار ملازم دروازے پر کھڑے ہو گئے۔

برات چلی، آگے نشان خچر، پیچھے ریچھ اور بندر۔ اس کے بعد دس پانچ آدمی روشنی لیے ہوئے، کہیں لڑکے تالیاں بجاتے ہیں۔ ہرمزجی اور خوجی میں پہلے ہی مشورہ ہو چکا تھا کہ برات میں باجے کی بجائے تالیاں بجیں گی۔ اور خچر پر برات کا نشان ہو۔ اور طالب علم بھی ساتھ ہوں۔ پانچ سات طلباء جن کو فارسی اردو کے اشعار کئی دن سے رٹا دیے تھے۔ اور دس بارہ نوکر اغل بغل چلے جاتے تھے۔ بیچ میں خوجی ٹٹو پر سوار اکڑے بیٹھے ہیں۔ لکڑی کی قرولی سنبھالے، گیروے رنگ کے کپڑے پہنے، سیاہ پگڑی اوپر پھولوں کا سہرا۔ افیون کی ڈبیا کمر میں بار بار ٹٹولتے

جاتے ہیں۔ٹٹو کی دم اور پیشانی سرخ اور تمام بدن پر نیلے نیلے رنگ کے گول گول داغ، خاصے ہولی کے سوانگ بنے تھے۔ رات تھی چاندنی۔خوجی کی صورت دیکھ کر لڑکے بار بار ہنستے تھے۔جدھر سواری جاتی تھی، لوگ اس طوفان بدتمیزی کو دیکھ کر قہقہے لگاتے تھے۔

خوجی نے چونک کر کہا:

کیا ہے بھئی۔

لڑکے: جس محلے سے آپ کی ٹٹوی نکلتی ہے۔وہ زعفران زار ہو جاتا ہے۔

خوجی: یہ تو میں پہلے ہی سمجھا تھا کہ ایسی مہذب بارات یہاں والوں نے کہاں دیکھی ہوگی؟۔

ایک تماشائی: (ہرمزجی کے ملازم سے) کیوں بھئی یہ کیا رنگ ہے؟۔

ملازم: یہ بونا مسخرہ بہروپیا ہے۔

ایک ہندوستانی تماشائی:۔واہ رے بہروپیے۔

خوجی: او ملعون بہروپیے خبردار ۔اس وقت میرے ہاتھ میں قرولی ہے۔(ملازم سے) بھئی ہوشیار رہنا بہروپیا آن پہنچا ہے۔

سواری کا ٹٹو نہایت سست اور مریل تھا۔پیٹھ پر اچھل اچھل کر ایڑ لگاتے جاتے تھے۔اور لوگ پھبتیوں پر پھبتیاں سناتے جاتے تھے۔

لڑکوں سے کہتے جاتے تھے۔خبردار غزل بھولنے نہ پائے۔مشعل چی مل کے قدم بقدم چلو۔بھئی دیکھو نا معقول نشان کا خچر بہت بڑھ گیا ہے۔

برات چوک میں داخل ہوئی۔

ہرمز: (میڈا سے) لیجیے برات آن پہنچی۔ یہ نشان کا خچر سامنے آ رہا ہے۔ مس روز ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئیں۔

گیل: ریچھ اور بندر کیسے ہیں؟۔

ہرمز جی: یہ ناچنے کے لئے آئے ہیں۔

مس روز: ایں ناچنے کا بھی سامان ہے۔

ہرمز جی: کمیدان صاحب ہیں۔ کوئی مذاق ہے۔

اتنے میں خوجی نمودار ہوئے۔ ملازموں نے بھیڑ کو اغل بغل ہٹا دیا۔ خوجی کی صورت نظر آتے ہی ہرمز جی، مس میڈا اور مس روز اور گیلن ہنستے ہنستے بےتاب ہو گئے۔

میڈا: ٹٹو کو تو آپ نے خوب رنگ دیا ہے۔

ہرمز: ایسے رنگیلے، سجیلے جوان سفید ٹٹو پر سوار ہوں بھلا۔

مس روز:۔ اور ان کی کمر میں یہ کیا ہے؟۔

ہرمز: کمر سے لکڑی کی قرولی لگی ہے۔ دیا سلائی والی ٹین کی ڈبیا جیسی گھڑی کے طور پر ہے۔

مس روز: اور یہ لڑکے تماشا والے ہیں نا۔

ہرمز: جی نہیں مدرسہ کے طلباء ہیں، غزل خوانی ہو گی۔ اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ اس مقام پر جو لوگوں نے گھیرا اور تالیاں بجا بجا کر اس زور سے قہقہے لگائے کہ خوجی کا ٹٹو بیٹھ گیا۔

خوجی: او جانگلو مسخرے ہنستے کیا ہو، جلد کوئی تدبیر بتاؤ۔ ورنہ مارے قرولیوں

کے بولا دوں گا۔اس وقت تمام زمانے کی نظر مجھ دولھا پر پڑتی ہے۔

ملازم: میں اس گھوڑے کی عادت کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ بغیر چابک کھائے اٹھنے والا نہیں۔

خوجی: یہاں مصلحت کرتے ہوئے یا کسی تدبیر سے ٹٹو کو مناتے ہو۔

ایک دل لگی باز نے شڑاپ شڑاپ چابک جمانے شروع کیے۔اتفاق سے خوجی پر بھی ایک چابک پڑ گیا۔

خوجی: اوہ۔اوہ۔نامعقول یہ کیا کیا تو نے۔

دل لگی باز: حکم کی تعمیل۔

خوجی: تو گھوڑے کو مارتا تھا یا مجھ کو۔خیر اب کوئی تدبیر بھی کرو گے کم بختو۔

ملازم نے ٹٹو کو مار کر اٹھایا۔خوجی پھر سوار ہوئے ایک پاؤں رکاب پر رکھ کر دوسرا اٹھایا ہی تھا کہ ٹٹو چلنے لگا۔خوجی ارا ارا دھم سے زمین پر آرہے۔پگڑی یہ گری۔قرولی وہ گری،ڈبیا ایک طرف۔ٹٹو ایک طرف۔

خوجی: او گیدی۔او نامعقول بہروپیے۔

دل لگی باز: اٹھیے اور پھرتی سے سوار ہو لیجیے۔گھوڑے پر سے گرنا سوار گرنا شہسواروں ہی کا کام ہے۔جسے گھوڑا نصیب نہیں وہ کیا گرے؟۔

خوجی: یہ بات ہے ہی۔مگر بڑی خیریت گزری کہ میں گھوڑے پر نہ گرا۔ورنہ میرے بوجھ سے اس کا کام ہی تمام ہو جاتا۔

تماشائی: بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔

خوجی نے پھر سر پر پگڑی باندھی قرولی کمر سے لگائی اور ایک لڑکے سے پوچھا

”آئینہ نہ ہوگا تمہارے پاس؟۔“

لڑکا ضرور۔

خوجی: پھر سے پوشاک سجی ہے۔ ذرا آئینہ تو دیکھ لیتے۔

لڑکا: آئینہ نہ ملے تو پانی میں منہ دیکھ لیجیے۔

خوجی: ہاں ہاں ایک ملازم سے ایک گلاس پانی تو کہیں جلدی سے مانگ لانا۔

ایک آدمی نے گلاس دیا، مگر خالی۔ خوجی افیم کے نشے میں تو تھے ہی دیکھ کر کہا سب ٹھیک ہے۔

دو چار قدم چل کر خوجی کو یاد آیا کہ مس روز کا گھر تو معلوم ہی نہیں۔

چلا اٹھے۔

یارو غضب ہو گیا۔ تھم جاؤ، جلوس روک لو۔

ملازم: خیریت تو ہے۔

خوجی: ہرمزجی بڑے خراب آدمی ہیں۔ مجھ کو مکان کا پتا تک نہ بتایا مگر تم جانتے ہو گے۔

ملازم: کون سا مکان۔ کیسا مکان۔

خوجی: وہی جہاں چلنا ہے۔

ملازم: مجھ کو کیا معلوم، جدھر کہیے چلوں۔

خوجی: مجھے تو کام کی کثرت سے فرصت نہ ملی۔ مگر تم لوگ عجیب شخص ہو۔ برات چلی اور دلھن کے مکان کا پتا تک نہ دریافت کیا۔ غضب ہی کر دیا۔

ملازم: خیر تو نام بتایئے دریافت کر لیا جائے گا۔

خوجی: ارے بھائی دولھا کو دلھن کا نام نہ لینا چاہیئے۔ اٹکل سے چلے چلو اسی طرف۔ تو پھر میری سسرال کیوں نہیں چلے چلتے۔

ملازم: یا الٰہی کچھ نام تو بتایئے۔

خوجی: کہوں تو مشکل نہ کہوں تو مشکل۔ اچھا پھر دریافت ہی کر لو۔ پری کوہ قاف کی۔ پورا نام ہم نہ لیں گے۔

ملازم: ایک آدمی سے اجی سبز پری کہاں رہتی ہے؟۔

آدمی: پرستان میں۔

خوجی: اس میں کیا شک ہے۔ آج وہاں وہ تیاریاں ہیں کہ پرستان بھی مات ہے۔ مگر پوچھ لو کس طرف سے جائیں۔ ایک طرف چار سنار دکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ملازم نے پوچھا: کوئی پری یہاں رہتی ہے۔

ایک سنار نے کہا:

مجھے اور تو معلوم نہیں مگر شہر سے باہر پورب کی طرف جو ایک تالاب اور بڑا سا درخت ہے، وہاں پر سال ایک درویش رہتے تھے، ان کے پاس ایک پری تھی۔

ملازم: لیجیے پتا مل گیا۔

خوجی دس پانچ قدم چلے ہونگے کہ منیڈا کی کوٹھی کا تالاب یاد آیا۔

چلا اٹھے:

اخاہ یارو، اس تالاب کی سجاوٹ آج قابل دید ہوگی طلسمات کا نقشہ نمایاں ہوگا۔ طلسمات کا۔

ملازم: پھر چلیے کدھر؟۔

خوجی: اب خواہ مخواہ کہلایا ہی چاہتے ہو تو سنو! ہم اپنی دلہن کو ہمیشہ مئیڈا کی کوٹھی میں دیکھا کیے ہیں، وہیں برات چلے۔

ملازم: تو پہلے آپ نے کیوں نہ بتا دیا؟۔ اب تک بارات پہنچ گئی ہوتی۔ مئیڈا صاحب تو نہایت مشہور آدمی ہیں چوک کے برابر کوٹھی ہے۔

خوجی: پھر اور نہیں کیا۔ کچھ ایسے ویسے کے گھر ہم شادی کرنے جاتے ہیں بھلا؟۔

اب سنیئے کہ وڈ صاحب **ملک** سپین کے ایک بہت بڑے تاجر تھے۔ ان کی کوٹھی قسطنطنیہ میں تھی۔ بڑے مال دار آدمی تھے۔ ایک مرتبہ کسی انگریز دوست سے انھوں نے سپین کے آرمیڈا نامی مشہور جہاز کے بیڑے کی بہت تعریف کی۔

دوست نے ہنس کر جواب دیا کہ:

مئیڈا صاحب کو مگر بھاگتے راہ سے نہ ملی۔

تب سے احباب مذاق سے انہیں مئیڈا صاحب کہتے ہیں۔ وہ کوٹھی عوام میں مئیڈا صاحب کے نام سے مشہور ہو گئی۔ مئیڈا صاحب نہایت ترش مزاج آدمی تھے۔ ان کے دو لڑکے تھے۔ دونوں کا بیاہ ٹھہرایا ہوا تھا مہینوں سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ احباب دور دور سے بلائے گئے تھے۔ اتفاق سے ان کی میم بیمار ہو کر تین چار دن میں چل بسیں۔ تیسرے دن ایک لڑکا بیمار ہوا۔ لاکھ لاکھ تدبیر کی مگر بے سود۔ تین ہی دن میں یکے بعد دیگر دونوں چل بسے۔

اب مئیڈا صاحب کے نام سے خوجی کی بارات انھی کی کوٹھی پر چلی تھی۔ مس

روز کا ملازم سب باتیں سن رہا تھا۔اس نے آن کران سے کل کیفیت بیان کردی۔

مس روز: لیجیے ایک اور گل کھلایا۔

ہرمزجی: پھر آپ کیوں کمیدان صاحب کو تنگ بھیجے کہ برات لوٹ آئے۔

گیل: غضب ہو گیا، وہاں تو اس ہفتے میں کئی حادثے ہوئے ہیں۔

ہرمزجی: نوکر سے ذرا وڈ صاحب کے آدمی کو سمجھا دو۔وہ کہہ دے گا کہ یہ بہرو پیا بیاہ کی خبر سن کر آیا ہے۔حادثے کا حال اس کو معلوم نہیں۔ورنہ بچے کی جان پر بن آئے گی۔

برات کوٹھی کے پھاٹک پر پہنچ کر ذرا اڑ گئی۔

حادثے کے دوسرے روز وڈ صاحب نہایت غمگین تھے کہ کان میں شور وغل کی آواز آئی۔نیند اچٹ گئی، پوچھا:

یہ کیسا غل ہے؟۔

آدمی نے باہر نکل کر سپاہیوں سے کہا:

دیکھو کون غل مچاتا ہے۔خوب پیٹو بد معاش کو۔

خوجی: واہ رے واہ آپ کے یہاں کے انتظام کے، کب سے برات کھڑی ہے، اور دروازے پر روشنی تک نہیں ہے۔

وہ لوگ بہت بگڑے

ایک نے کہا:

اجی گردن ناپو اس کی، خوب پیٹو مردود کو۔

خوجی سمجھ گئے کہ گالیاں دے رہے ہیں)او گیدی یہ گالیاں کیسی؟

صاحب کے آدمی نے غصے میں آ کر سائیس کو ایک ٹھوکر ماری، وہ گر پڑا۔ خوجی کے سر پر ایک چپت رسید کی تو پگڑی دور جا گری۔ دوسرے نے ایک ڈنڈا لگایا۔ ڈنڈا ٹٹو کے پاؤں میں لگا۔ وہ بیٹھ گیا۔ اب لگی خوجی کے سر پر چپت بازی ہونے۔

خوجی: نہ بھائی ایسی دل لگی نہ کرو۔ (پھر بگڑ کر) کچھ کم بختی تو نہیں آئی سب کی، دیر ہوتی جاتی ہے اور اندر خبر نہیں کرتے۔ مالک سنیں گے تو نکال ہی کے چھوڑیں گے تم سب کو۔

دس پانچ آدمی اور اندر سے کھڑ بڑ کرتے ہوئے نکل آئے۔ ریچھ اور بندر نچانے والوں کو بے بھاؤ کی پڑیں۔ چراغ والے چراغ پھینک کر بھاگنے لگے اور لڑکے منتشر ہو گئے۔

اتنے میں ہرمزجی کے نوکر نے کہہ دیا کہ یہ بہروپیا بیاہ کی خبر سن کر انعام کے لالچ سے آیا تھا۔ حادثے کا حال اس کو نہیں معلوم۔ معاف کر دیجیے۔

آدمی: تجھ کو معلوم نہیں کہ صاحب آج بدحواس ہیں اور مارے رنج کے ان کی پاگلوں کی سی کیفیت ہو رہی ہے۔

(خانساماں نے اس کا مطلب خوجی کو سمجھایا)

اتنے میں ایک آدمی نے خوجی پر بھی دو ایک لگا دیں۔ دوسرے نے دس پانچ لٹھ ٹٹو پر جڑ دیے۔ ٹٹو ہنہناتا ہوا بھاگا اور خوجی اپنا سامنہ لے کر ہرمزجی کی کوٹھی واپس آئے۔

میدان جنگ

میاں آزاد اپنی رجمنٹ کے ساتھ کئی دن تک مختلف مقامات پر پڑاؤ ڈالتے رہے۔ایک دن ایک دل کش مقام پر پہنچے۔درخت پھلے پھولے۔شاخیں ہری بھری،سبزہ زار۔میاں آزاد گھوڑے سے اتر کر علیقو پاشا کے ساتھ چشمے کے کنارے ٹہلنے لگے۔

علیقو: ہماری فوج اور افسروں کا جوش خروش روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے۔دوطرف جنگ چھڑ گئی ہے۔ایک یہاں دوسری ایشیا میں۔احمد مختار پاشا ایشیائے کوچک میں متعین فوج کے سپہ سالار مقرر ہوئے ہیں۔دیکھیے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔خدا جس کو فتح دے۔

آزاد:احمد مختار پاشا جری اور جنگ آزما ہیں یا ایسے ویسے۔

علیقو : ایسے ویسے نہیں،بڑے تجربہ کار آدمی ہیں اور نماز روزے کے پابند ہیں۔ادھر یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں،ادھر لشکری سفر کے تھکے ہوئے کمر کھول ہی رہے تھے کوئی گھوڑے سے اتر کر سستانے لگا۔کسی نے سبزے پر گھوڑے کو چھوڑ دیا۔کہ آزادی کے ساتھ پھرے۔کوئی ترکی چرٹ پیتا ہے۔کوئی دریا کی موجیں دیکھتا ہے۔غرض سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے،کہ دفعتہً گرد نمودار ہوئی۔سب کی نظر گردہی کی طرف تھی۔یاالٰہی یہ گرد کیسی؟۔میاں آزاد بھی حیرت سے دیکھنے لگے،سامنے سے کئی سوار نظر آئے۔افسر کمانیر اپنے خیمے سے بدحواس ہوکر نکلے۔اورفرط اشتیاق سے کوئی دس بارہ قدم بڑھ کر سواروں کا استقبال کیا۔

ایک نوجوان سوار نے لفافہ دے کر کہا:

وزیر جنگ نے دیا ہے۔

افسر کمانیر نے خط پڑھا،تو خاص وزیر جنگ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔کھولا خط پڑھا۔

افسر کمانیر: کوچ کوچ کا حکم ہے۔

ان کے ماتحت افسروں نے کہا:

کوچ میں کوئی عذر نہیں مگر ابھی فوج تھکی ماندی چلی آتی ہے،اگر اسی دم کوچ کر دیا تو بڑی خرابی واقع ہوگی۔

افسر کمانیر نے وزیر جنگ کا حکم سنا کر کہا:

اب ہم ایک دم نہیں رک سکتے،حکم ہی یہی ہے۔

وزیر جنگ نے لکھا تھا کہ اگر ذرا بھی دیر کی تو تمہاری سپاہ کو روسی بالکل بھون کر رکھ دیں گے۔تھوڑی دیر تک افسروں میں سرگوشی ہوئی۔

علیقو پاشا:اور جو ایک فلانک کالم بھیج دیں تو کیسا ہو۔

افسر کمانیر: کل رجمنٹ کو حکم ہے کہ کوچ کرے اور آگے بڑھے۔

آزاد پاشا: آج راہ ذرا خراب تھی،پڑاؤ کا مقام تو صاف ہے،مگر راستے میں بڑی بڑی مصیبتیں پڑیں گی،اگر ایسی راہ اب بھی ملے گی تو بس تڑ کا ہی ہو جائے گا۔اور رات کے وقت اور بھی دقت ہے۔

احمد مختار پاشا:اب وقت ضائع ہوتا ہے۔

افسر کمانیر: کوچ کا حکم دو۔

قاعدے کے موافق کوچ کا حکم دیا گیا تو لشکری سخت حیران ہوئے کہ یا الٰہی کون سی آفت آنے والی ہے کہ یہاں پہنچے کچھ دیر نہیں ہوئی کہ کوچ کا حکم دے دیا گیا۔ مگر بندگی بے چاری، پھر بھی حکم پانے کی دیر تھی کہ دم کے دم میں سب لیس۔ قرینے کے ساتھ کوچ ہوا۔ شام تک فوج نے آسانی کے ساتھ راستہ طے کرلیا۔ مگر سورج کے غروب ہوتے ہی وہ تاریکی چھائی کہ توبہ۔ افسر کمانیر نے پہلے ہی سے روشنی کا مناسب انتظام کر دیا تھا۔ آخر ایک مقام پر پہنچے جہاں چاروں طرف جھاڑیاں تھیں۔

افسر کمانیر نے دو چار واقف کار آدمیوں سے پوچھا کہ پہلے پڑاؤ سے یہ مقام کس قدر فاصلے پر ہے۔

معلوم ہوا کہ پہلے پڑاؤ سے گیارہ کوس زمین طے کر آئے ہیں۔

علیقو پاشا: یہاں تو بڑی دقت ہوگی۔ سوئیں گے کہاں؟۔

احمد مختار پاشا: خدا جانے وزیر جنگ کو سوجھی کیا؟ گرد واری کے لئے کسی کو ضرور بھیجنا چاہیے، معلوم ہو تو دشمن ہے کہاں۔

آزاد: تیس سوار اور ایک جونیئر افسر کو تو وزیر جنگ نے روانہ کر دیا ہے مگر ابھی تک وہ واپس نہیں آئے۔ سپاہیوں نے ادھر ادھر دیکھا کہ شاید کوئی عمدہ مقام ہاتھ آئے مگر سوائے ایک قبرستان کے کچھ نہ دیکھا۔ سب کی صلاح ہوئی کہ قبرستان ہی میں پڑاؤ ڈالیں۔ افسر، سپاہی اور سوار سب قبرستان میں داخل ہوئے۔

افسر کمانیر: (ایک افسر سے) اتنا سا گاؤں اور اتنا بڑا قبرستان، اس کی وجہ سمجھے، یہاں ایک جنگ عظیم ہوئی تھی۔ میرے والد بزرگوار اس جنگ میں شہید

ہوئے تھے۔

افسر: تو ان کی قبر بھی شاید یہی ہوگی۔

افسر کمانیر: ہاں وہ سامنے والی اونچی قبر ہے۔

سواروں نے گھوڑے باندھے اور قبروں پر لیٹنا شروع کیا۔ دن بھر کے سفر اور کوچ در کوچ نے بے حد تھکا دیا تھا۔ گو قبروں اور پتھروں پر لیٹنے میں کوئی آرام نہیں تھا مگر اس وقت قبریں ہوا کے تکیے اور پتھر پھولوں کے بستر سے زیادہ آرام دیتے تھے۔ نصف سے زیادہ لشکری قبروں پر لیٹے تھے۔ بعض بعض نے ہتھیار بھی اتار رکھے تھے۔ بعض بعض مسلح ہی سو رہے تھے۔ کہ جب تک کوئی اور بندوبست ہو تب تک ذرا تو آرام کر لیں۔

علیقو پاشا: نے کہا:

آدمیوں اور گھوڑوں کی جس قدر کمی ہوگی اسی قدر آسانی سے فوج کوچ کرے گی۔ اگر دستہ بڑا ہو تو سڑک پر کوچ کے وقت سخت دقت پڑے گی۔ جتنے افسر کسی کالم کی کمان کرتے ہوں ان کو دائیں بائیں کے دستوں کا حال معلوم رہنا چاہیے۔ آج اس مرتبہ کے کوچ میں ذرا گڑبڑ ہو گئی تھی۔ چار میل انسان ایک گھنٹے میں چل سکتا تھا۔ لیکن سپاہی فوج کے ساتھ ایک گھنٹے میں چار میل نہیں جا سکتا تھا۔ اور پھر اس قدر وزن لے کر۔ اس کے علاوہ جب کوچ کر کے منزل مقصود پر پہنچتا تو آرام نہیں ملتا تھا۔ نہ گدگدا بچھونا پاتا نہ عمدہ غذا۔ زمین پر سونا ہوتا۔ ادھر پڑاؤ پر پہنچتے ہی حکم ہوتا کہ فلاں ڈیوٹی پر جاؤ۔

آزاد پاشا: یورپ کے ملکوں میں اوسط وقت کوچ کرنے کا کیا ہے؟۔

علیقو پاشا: فوج پیادہ کے لئے تین میل فی گھنٹہ۔ رسالے کے لئے پانچ میل اور توپ خانے کے لئے بھی پانچ میل۔ اگر دستے بڑے ہوئے اور فوج زیادہ ہوئی تو اس سے بھی کم زمین طے ہو گی۔ فوج پیادہ انتہا ڈھائی میل فی گھنٹہ جائے گی۔ اور سڑک خراب ہوئی تو ڈیڑھ میل سے زیادہ گھنٹے میں فوج نہیں جاسکتی۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اتنے میں آواز آئی:

دھنا''

ایں یہ توپ کیسی دغی۔

سب کے کان کھڑے ہوئے، افسر کمانیر سخت حیران تھے کہ یہ آواز کہاں سے آئی، اور واقعی ہی حیرت اور پریشانی کی بات تھی۔ اتنے میں آواز پھر آئی، جو لوگ غافل سو رہے تھے، وہ تک بھی جاگ اٹھے۔ اب تمام لشکر میں کھلبلی مچ گئی۔ ایں کیا روسی آگئے۔ یہ توپ کہاں دغی؟۔

فوراً حکم ہوا کہ جو کمر کسے ہوئے مسلح ہیں، وہ گھوڑوں پر کاٹھیاں دھریں۔ اور جو مسلح نہیں وہ کمریں کسیں اور فوراً تیار ہو جائیں۔

دو منٹ کے اندر ہراول کے سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے آن پہنچے۔ آتے ہی غل مچا کر ایک ایک نے سنایا کہ:

ایک سوار: فوراً گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ۔

دوسرا سوار: اب وقت تنگ ہے۔ دشمن سر پر آن پہنچا۔

تیسرا سوار: اٹھو اٹھو، آرام اب منزلوں دور ہے۔

افسر کمانیر نے دریافت کیا تو سواروں نے کہا:

یہاں سے آدھ میل کے فاصلے پر ایک قلعہ ہے۔اس میں ترکی فوج کے چند سپاہی تھے۔ چھ ہزار روسیوں نے انہیں گھیر لیا۔ترکوں کی قلت اور روسیوں کی کثرت سے یہ نتیجہ ہوا کہ قلعہ کی ایک دیوار توڑ کر ترکی نکل گئے۔قلعہ خالی پا کر روسی اسے اپنے قبضے میں لے آئے۔

اب ان کو جاسوسوں نے خبر دی ہے کہ ترکی فوج آن پہنچی ہے۔

افسر کمانیر نے کہا کہ:

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ گولے چلانے کیوں شروع کیے۔معلوم ہوتا ہے کہ روسیوں کی فوج ہماری فوج سے کم ہے۔خوف دلانے کے لئے گولہ اندازی شروع کر دی۔ورنہ اگر روسی سپاہ کافی ہوتی تو اس وقت وہ دو چار دستوں کے ساتھ ہمیں گھیر لیتے۔

کل افسروں اور جونیئر افسروں کو بلا کر مشورہ کیا،اور مشورہ کے بعد مختلف قسم کے حکم جاری کرنے لگے،تاکہ فوج قرینے سے آراستہ ہو جائے۔

آزاد پاشا:اب آخری رائے کیا قرار پائی۔ قلعے پر حملہ ہوگا یا ملتوی ہوگا۔

علیقو پاشا:حملہ ہو یا نہ ہو،توپ کا جواب ضرور دینا چاہیئے۔

احمد مختار پاشا: پہلے اس قبرستان سے نکل کر کالموں کو درستی کے ساتھ آراستہ کیجیے،پھر توپ خانے سے کام لیجیے۔

اتنے میں پھر توپ دغی اور ادھر سے اس کا جواب دیا گیا۔

اب سنیئے کہ یہ قلعہ دریائے ڈینیوب سے کئی کوس کے فاصلے پر واقع تھا۔بیچ میں قلعہ خاص تھا۔اردگرد چھوٹے چھوٹے قلعے یعنی چاروں کونوں پر ایک

ایک۔ یہ قلعے گو وسعت میں چھوٹے تھے، مگر بے حد مضبوط اور سب میں توپیں چڑھی ہوئیں، اس قلعے میں ایک بہت بڑی توپ تھی، ترکی اپنی زبان میں اس کو صف شکن کہتے تھے۔ اس کی عظمت کی ادنیٰ سی تعریف یہ ہے کہ درزی اس پر بیٹھ کر کپڑے سی سکتے تھے۔ اس توپ پر ترکوں کو بڑا ناز تھا۔ جب ترکوں نے قلعے کو خالی کیا تو صف شکن میں کیل ٹھونک دی تھی۔ قاعدہ ہے کہ جب کبھی میدان میں لڑائی ہوتی ہے، تو بھاگتے وقت اکثر توپ میں کیل ٹھونک دیتے تھے۔ تاکہ دشمن آئے تو فوراً اس توپ کو کام میں نہ لا سکے۔ قلعہ خاص کا بہت بڑا رقبہ تھا۔ قلعہ کیا تھا گویا ایک شہر آباد تھا۔ زراعت بھی اس میں ہوتی تھی۔ دریا سے کاٹ کر ایک نہر لائے تھے جو قلعے کے چاروں طرف جاری تھی۔ نہر کے اردگرد کچھ فاصلے پر بنسواڑی تھی، اس درجہ گھنی کہ گولہ بدقت اس پار جائے۔ بنسواڑی کے بعد ببول کے درخت تھے۔ یہ بھی گھنے تھے۔ ان کے بعد ایک اور نہر تھی نہایت گہری۔ نہر کے بعد گہری گہری کھائیاں۔ ان کے بعد اونچی اونچی زمین اور پھر ریت اور بالو۔ ان سب کے بعد پھر بنسواڑی اور چاروں کونوں کے اردگرد ڈھیریں اور کھائیاں اور جنگل۔

ترکی اس قلعے کو نہ چھوڑتے مگر خرابی یہ ہوئی کہ جب نوے ہزار روسیوں کے دریائے ڈینیوب کے اس پار آجانے کی خبر آئی تو اس قلعے کی فوج کو حکم ہوا کہ وہ فوراً اس لشکر کی مدد کو جائے جو روس سے لڑنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ بس قلعے میں چند سپاہی رہ گئے تھے۔ رسد بھی کافی نہ تھی۔ لہٰذا قلعے کی دیوار توڑ کر وہ بھاگ گئے۔ روسی سمجھتے تھے کہ اس قلعے کے قبضے سے گویا ملک کا ایک حصہ ان کے قبضے میں آ گیا ہے۔ اور تھا بھی ایسا ہی۔ مگر جب انہیں خبر ملی کہ ترکی فوج آن پہنچی ہے اور ہے

بھی ساری کی ساری سامان جنگ سے پوری طرح لیس ہے۔تو پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔روسیوں کے صرف ڈیڑھ ہزار آدمی اس قلعے میں تھے۔قریب تھا کہ رسد کا سامان بھی انہیں پہنچ جائے۔مگر ترکوں نے اسکی مہلت نہ دی۔

وزیر جنگ نے دارالسلطنت میں بیٹھے بیٹھے اس قلعے کی فکر کی،ورنہ روسی اس میں جم جاتے تو پھر نکالنا مشکل تھا۔روسیوں نے ترکی فوجوں کے آنے کی خبریں سن کر توپیں داغنا شروع کردیں۔دونوں طرف سے دھنا دھنا کی آوازیں آنے لگیں۔

افسر کمانیر نے دوچار سواروں سے جو اس قلعے کے حالات سے خوب واقف تھے طرح طرح کے سوال کیے اور پھر ان کے جوابوں پر غور کیا۔

کمانیر:اس قلعے کے اردگرد تو چار برج ہیں نا۔

سوار:ہاں اور چاروں مضبوط۔

کمانیر:اور توپیں چڑھی ہیں۔

سوار:جی ہاں،ایک برج میں جو پورب کے رخ ہے،برنجی توپیں ہیں۔

کمانیر:خوب معلوم ہے۔

سوار:حضور میں اس قلعے میں چھ ماہ رہ چکا ہوں۔

کمانیر:بھلا کسی ایسے گاؤں والوں سے پوچھو،جو تمہارا دوست ہو۔

سوار:آپ کو جو کچھ دریافت کرنا ہو کرلیجیے،تو پھر میں گاؤں والوں سے اور خبریں لاؤں۔

کمانیر:بنسواڑیاں جو اس میں تھیں وہ ہیں یا نہیں۔

سوار: اب ایسی بودی بھی نہیں ہے کہ گر ہی پڑتی ہو۔

کمانیر: ہاں ہم سمجھے خیر۔

سوار سے اور بہت سے سوال کرنے کے بعد کمانیر نے حکم دیا کہ

توپ خانہ تھوڑی دور اور بڑھاؤ:

اور اس کے بعد سواروں سے پوچھا کہ:

قلعہ یہاں سے کس قدر فاصلے پر ہے۔

سواروں نے کہا: آدھ کوس۔

مگر اس سوار نے جو قلعے میں رہ چکا تھا اس کی تردید کی اور کہا:

آدھ کوس سے زیادہ ہے۔

کمانیر: نے کہا گاؤں کے لوگوں سے دریافت کرو کہ ٹھیک فاصلہ کتنا ہے؟۔

چھ سوار گاؤں میں پہنچے۔ دیہاتی بے چارے مارے خوف کے لرز رہے تھے۔ کہ خدا خیر کرے، جنگ کے نام سے رعایا منزلوں دور بھاگتی ہے۔ لوگ خوب جانتے ہیں کہ تجارت پر اوس پڑ جائے گی۔ خون کی ندیاں بہیں گی۔ ملک تباہ ہوگا۔ گاؤں جلا دیے جائیں گے۔ اور ہزاروں قسم کی مصیبتیں پڑیں گی۔

دونوں طرف سے گولوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ ایک گولہ عین فوج میں آن کر پھٹا تو ایک ٹکڑا علیقو پاشا کے گھوڑے کے پٹھے پر پڑا۔ اور میاں آزاد کا گھڑا ابھی ڈر گیا، علیقو پاشا کو گھوڑا گرا، مگر وہ چابک دستی سے اچک گئے۔

آزاد: شاباش بچ گئے نا؟۔

یہ انھوں نے کہا ہی تھا کہ ایک سوار کا گھوڑا دوسرے گولے کے ٹکڑے سے دھم

سے زمین پر آ گرا۔ میاں آزاد کے کان کے پاس سے بھی ایک گولی سنسناتی ہوئی گذر گئی۔

آزاد: ایں یہ گولی کہاں سے آے ء؟۔

ایک افسر (غل مچا کر) ایں اگر قلعہ دو میل ہے تو گولی کہاں سے اتنی دور آئی۔

دوسرا افسر: بے شک دو میل دور۔

یہ باتیں ہو ہی رہیں تھیں کہ پشت سے روسیوں نے باڑھ ماری۔

دھائیں، دھائیں۔ دھائیں۔

تمام فوج میں کھلبلی مچ گئی۔

دونوں طرف سے گولہ اندازوں نے گولے چلائے، ترکی گولہ اندازوں نے چار گولے ایسے چلائے کہ ایک قلعے کے برج کو ڈھا دیا۔ اتنے گھنگھور گھٹا چھائی اور بجلی چمکنے لگی اور اس زور سے کوندنے لگی کہ گھوڑے بے قرار ہو گئے۔ ترکوں نے اس کے باوجود اندازی بند نہ کی۔ مگر روسیوں نے جواب دینا بند کر دیا۔ گو روسی محفوظ مقام میں تھے، قلعہ بے حد مضبوط تھا۔ صف شکن توپ ستم کا توڑ کر رہی تھی، اور ترک اس کے برعکس کھلے میدان میں تھے۔ لیکن رسد کی قلت کے سبب سے روسی مایوس ہو رہے تھے۔ ترکوں نے بھی مصلحت کے طور پر چپ اختیار کر لی۔

افسر کمانیر نے ایک دستے کو پشت کی طرف بھیج دیا، تا کہ جو روسی دستہ اس طرف سے جنگ کرنے کو آتا ہے۔ اس کا جواب دینے جائے۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ تھوڑے ہی سے آدمی تھے۔ گھٹا چھاتے ہی قلعے میں چلے گئے۔ ترکی فوج کانپ

رہی تھی کہ اگر مینہ برسنے لگا تو بڑی خرابی ہوگی۔

اتنے میں ایک شخص نے آکر بیان کیا کہ:

یہاں سے آدھ کوس کے فاصلے پر جنگل ہے۔اس میں پہلے درندے کثرت سے رہتے تھے۔مگر فوج نے شکار کر کے جنگل کو خالی کر دیا۔اگر رات کے وقت فوج وہاں رہے تو طوفان سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

افسر کمانیر: ایک جونیئر افسر اور بیس سوار جا کر موقع دیکھ آویں اور فوراً آ کر رپورٹ کریں۔

آزاد نے کہا میں جاتا ہوں۔

میاں آزاد بیس سوار لے کر گئے اور موقع دیکھ کر فوراً واپس آئے۔

افسر دیکھ آئے اچھا مقام ہے؟۔

آزاد: بڑا گھنا جنگل ہے اور فوج بآسانی رات کو رہ سکتی ہے۔

ایک سوار: اس میدان سے کہیں بہتر ہے۔

دوسرا سوار: جب ہم اس قلعہ میں تھے تو اس جنگل میں خوب شکار کھیلتے تھے۔مگر سلطان کا حکم آ گیا کہ شکار محفوظ رہے۔اب تو جانوروں کا وہاں نام ہی نہیں۔

تیسرا سوار: نہیں، ہے تو اکا دکا ضرور، مگر بہت کم۔

چوتھا سوار: اب اور بھی گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سن کر بھاگ جائیں گے۔

افسر کمانیر نے حکم دیا:

جنگل کے قریب چل کر ٹھہرو۔

فوج روانہ ہوئی، روسیوں کو بھی خبر مل گئی کہ ترکی اس جنگل کی طرف گئے ہیں۔

افسر کمانیر نے حکم دیا:

دو سو سوار مسلح ارد گرد پہرا دیں۔

اس کے بعد کچھ لوگ تو نہایت بے چینی کے ساتھ سوئے اور کچھ بیٹھے بیٹھے ہی اونگھنے لگے۔

مقابلہ

میاں بدیع الزمان کی شادی کا حال بیان ہو چکا ہے۔ چاندسی بیوی پانے کی آرزو میں چاندگنجی ہوگئی۔ اوس ہی پڑ گئی۔ مس روز تو نہ ملیں، الٹے بے بھاؤ کی پڑیں۔ ٹٹو سے زمین پر لڑھکنی کھائی اور جگت ہنسائی جو ہوئی وہ الگ۔ دوبار دولھا بنے۔ پرانے سر پر نئی پگڑی سجائی۔ مگر آرزو پوری نہ ہوئی۔

خوجی کے دل میں یہ بات کھب گئی کہ لڑکوں کی شرارت سے ان پر اوس پڑی۔ نہ وہ منحوس اشعار زبان پر لاتے، نہ یہ جوتیاں کھاتے۔ اپنے حافظے پر بھی دانت کٹکٹا کر رہ جاتے کہ مس روز کا نام کیوں نہ یاد آیا۔ بڑا غپا کھایا ہر دھنتے تھے، تنکے چنتے تھے۔ ہرمزجی ک اہنسا اور بنانا، مس میڈا کا مسکرانا، مس گیل کا انگلیوں پر نچانا اور بھی ستم تھا۔ خون پی کے رہ جاتے تھے، اف تک زبان پر نہیں لاتے تھے۔

ادھر سنیے، میاں آزاد نے جنگل میں لشکریوں کے ساتھ رات کو قیام کیا۔ سپاہیوں اور سواروں نے درختوں کے نیچے آگ روشن کی تو کہ سردی کچھ کم ہو۔

میاں آزاد کی لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی، فوج دن بھر کی تھکی ہوئی تھی جو لیٹا اس کو فوراً نیند آ گئی۔ اب کوئی پانچ چھ گھڑی رات باقی رہی ہوگی کہ اچانک بہت قریب سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ سب کے سب بدحواس ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ افسر اور سوار سب حیران پریشان۔ سمجھ گئے کہ روسیوں کی فوج آ گئی۔

ہاتھ پاؤں پھول گئے بات ہی ایسی تھی خوب جانتے تھے کہ دشمن سر پر آن موجود ہوا ہے۔افسر کمانیر کی غلطی پر دانت پیس پیس کر رہ جاتے تھے۔مگر سپاہیوں ک و بلند آواز سے ڈھارس دیے جاتے تھے۔کہ:

گھبرانے کی بات نہیں۔اطمینان کے ساتھ کمر کسو اور گھوڑے کی پشت پر آ کر دشمن سے مقابلہ کرو اور مردانہ وار لڑو۔

اتنے میں سوار آ گئے۔ارے لاحول ولاقوۃ بڑا دھوکا ہوا۔یہ تو ہماری فوج کے سردار ہیں۔دیکھا کہ پچاس سوار آتے ہیں۔

سوار خیریت اسی میں ہے کہ ج سقدر جلد ممکن ہو تیار ہو جایئے۔روسی آن پہنچے ہیں بس اب چھاپا مارا ہی چاہتے ہیں۔اب دیر نہیں ہے۔

افسر کمانیر: سب لیس ہو جاؤ۔کچھ پرواہ نہیں آنے دو۔آئیں، آئیں شوق سے آئیں، ہم بھی تیار ہیں۔

اس استقلال کے قربان، جنرل ہو تو ایسا ک ہمستقل مزاجی سے فرماتے ہیں کہ کچھ مضائقہ نہیں آنے دو۔

افسر کمانیر: روسی فوج کس طرف سے آتی ہے۔

سوار: حضور سامنے سے۔

افسر کمانیر: کیا قلعے کے دروازے سے آتی ہے۔

سوار: نہیں حضور وہ پورب کے رخ برج ہے، اس کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے۔اس تہہ خانے میں سے زینہ لگا کر آئے ہیں۔اور میدان میں قلعے کی آڑ میں ٹھہرے ہیں۔اور گھوڑے اس رخ سے باہر نکالے ہیں۔

افسر کمانیر: یہ کسی معتبر آدمی نے بیان کیا ہے۔

سوار: ایک سوار گاؤں کے کسی جولاہے کے ساتھ خبر لانے گیا تھا۔اسی نے بیان کیا،اس میں کسی طرح کا فرق نہیں ہے۔

افسر کمانیر: کچھ سمجھ میں نہیں آتا،تہہ خانہ اور برج اور یہ سب الم غلم بکتے ہو۔تم کتنے روز سے فوج میں نوکر ہو۔کوئی دو چار مہینے؟۔

دوسرا: خداوند میں چار سال سے نوکر ہوں۔میں نے فقط سنا کہ روسی میدان میں جمع ہوئے اور قلعے سے نکل آئے،مگر خدا جانے بھاگنے کی نیت سے نکلے۔یا شب خون مارنے کی نیت سے۔

کمانیر نے ادھر ادھر گھوڑا پھیر کر فوج کو ایک نظر دیکھ کر کہا۔

صرف دو توپیں ساتھ چلیں اور باقی کی حفاظت کے لئے دو سو سوار یہیں رہیں۔

یہ حکم دے کر فوج کو کوچ کی اجازت دے دی۔آدھ کوس پر فوج گئی ہوگی کہ ایک پیغام برنے آن کر آگے گئی ہوئی ترکی فوج (ہراول) کا خط علیقو پاشا کو دیا۔انھوں نے پڑھا اور کمانیر کے حوالے کیا۔

مضمون یہ تھا:

روسی ہم سے لڑنے پر آمادہ ہیں۔اب ان کی طرف سے توپ دغا ہی چاہتی ہے۔آپ کی فوج دو طرف سے گھر گئی ہے۔روسی فوج کا کالم اس جنگل کی پشت پر بھی ہے۔وہ ادھر سے حملہ آور ہوگا۔اور قلعے کی فوج جو باہر تھی وہ اندر چلی گئی۔یا شاید وہی فوج اسطرف چلی گئی ہو۔بہر حال ادھر تو قلعے سے توپ چلے گی اور ادھر

پشت پر سے باڑھ چلے گی۔

کمانیر نے کل فوج کو یہ مضمون سنایا اور کہا۔

جنگل میں تو ہمارے سوار موجود ہی ہیں، روسی فوج کے دستے کو بخوبی روکیں گے، اور توپیں بھی ہیں۔ ہراول کے دستے کو اپنے پاس بلا لینا چاہیئے۔ یہ کہہ کر فوج کے پاس حکم بھیجا کہ تم فوراً ہمارے ساتھ آملو۔ اگر روسی فوج میدان میں ہو تو باڑھ چلاؤ، ہم سمجھ جائیں گے، قلعے میں ہو تو مقابلہ فضول ہے۔ فوراً ہم سے مل جاؤ اور باہر ہو تو بندوقیں سر کرو۔ خبردار ہٹنا نہیں۔

تھوڑی دیر میں ہراول کی فوج اپنے افسر کے ساتھ مل گئی مگر قلعے سے توپ کی آواز نہ آئی۔ کمانیر نے اپنے چھوٹے افسروں سے مشورہ کیا اور بہت جلد یہ رائے قرار پائی کہ جو سوار جنگل میں ہیں، ان کی کمک ضروری ہے۔ جنرل نے نصف فوج تو اسی میدان میں چھوڑی، فوج کے اس حصے کے پاس دو توپیں تھیں، باقی ماندہ فوج لے کر چلے ہی تھے کہ جنگل کی طرف سے دھائیں دھائیں کی آوازیں آنے لگیں۔ اور جنگ شروع ہو گئی۔

کمانیر نے ایک فلائنگ کالم آزاد پاشا کی سرکردگی میں روانہ کیا، فلائنگ کالم عام فوج سے تیز جاتا ہے۔ جلدی اس لئے تھی کہ جنگل میں سواروں کو ڈھارس ہو۔ اور کمک وقت سے پہلے ہی پہنچ جائے۔ اب سنیئے کہ دو سو سواروں میں سے صرف اسی قدر عرصے میں بیس زخمی اور دس ضائع ہو چکے تھے، اور چھ گھوڑوں پر گولیاں پڑی تھیں۔ یہ لوگ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے مگر روسی فوج بہت آگے بڑھ آئی تھی۔ روسیوں کی طرف سے صرف دس سوار زخمی ہوئے۔ اور دو مرے جس میں ایک

افسر تھا۔آزاد پاشا کے کالم نے سواروں کو مدد دی، اور دونوں طرف سے بندوقیں دغنے لگیں۔فیر پر فیر اڑتی تھی۔روسیوں کے دوسو سوار جنگل کی ایک اور طرف سے آ کر اس دستے پر گرے اور اب مصیبت یہ پڑی کہ ادھر تو باڑھ پر باڑھ پڑتی تھی اور ادھر تلوار کی لڑائی دست بدست شروع ہو گئی۔جب تک جنرل کا دستہ کمک کو آئے، روسیوں نے کسی قدر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔اور ان سواروں میں چند ہی باقی رہ گئے تھے، کہ جنرل کی فوج بھی آن پہنچی۔پھر کیا تھا، روسیوں کی فوج کا جو دستہ آگے بڑھا تھا۔اس کو ترکوں نے کاٹ کر پھینک دیا۔ادھر آزاد پاشا کا دستہ بڑھا تو روسی فوج نے اس سے مقابلہ کیا۔تھوڑی دیر تک روسی گالب رہے، مگر آزاد پاشا بڑی جرات سے آگے بڑھتے ہی گئے۔ان کا گھوڑا سب سے دس قدم آگے جاتا تھا۔جب روسیوں نے دیکھا کہ ترکی فوج آن پہنچی ہے تو انہوں نے دریا میں گھوڑے ڈال دیے۔

یہ وہ دریا تھا جس سے نہریں کٹ کٹ کر قلعے کے اردگرد جا رہی تھیں۔ادھر روسیوں نے دریا میں گھوڑے ڈالے۔ادھر ترکوں نے باڑھ ماری۔روسی پلٹ پڑے اور کمال شجاعت کے ساتھ ترکوں کی فوج تک آ گئے۔لیکن نصف سے زیادہ کو آزاد پاشا کے سپاہیوں نے ختم کر دیا۔اس مقام پر روسیوں نے بڑی چالاکی کی تھی۔وہ کوب جانتے تھے کہ اگر دریا سے باہر نہ آئے تو ترکی رسالہ ہمارے ایک سوار کو بھی نہ چھوڑے گا۔اور سب اسی دریا میں موت کا شکار ہوں گے۔لہذا دریا سے گھوڑے نکالے اور مقابلے پر آ گئے۔جب روسیوں نے دیکھا کہ نصف سے زیادہ سپاہی ختم ہو گئے ہیں تو تلواریں سونت سونت کر چڑھ دوڑے، ترکوں نے

اب بھی بندوق ہی سے کام لیا اور نصف کے قریب باقی روسیوں کو بھی وہیں ڈھیر کر دیا۔ اب روسیوں کے کوئی سو سوا سو آدمی باقی رہ گئے تھے۔ وہ بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر ترکوں پر آن گرے۔ تلوار کی لڑائی شروع ہوئی۔ تین روسیوں نے آزاد پاشا کے گھوڑے کو زخمی کیا۔ مگر واہ رے آزاد۔ ایک روسی نے گھوڑے کے پٹھے پر تلوار لگائی ہی تھی کہ آزاد نے تلا ہوا ہاتھ لگایا اور بھنڈارا تک کھل گیا۔ دوسرا جھپٹا اس نے تاک کر سر اڑانا چاہا۔ مگر ایک ترکی سوار نے خود روسی کا سر بھٹا سا اڑا دیا۔ تیسرے روسی نے بڑھ کر آزاد کے گھوڑے کی ٹانگ پر ہاتھ لگایا اور گھوڑا تڑپ کر دس پانچ قدم پیچھے ہٹا، مگر ایک ترک نے روسی کی دونوں ٹانگیں تلوار سے اڑا دیں۔

غرض تھوڑے ہی عرصے میں ترکی فوج نے دشمن کو کاٹ کے پھینک دیا اور جنرل کے کالم سے جا ملی اس جنگ میں تین سو بندوقیں، دو سو تلواریں اور پچپن گھوڑے ترکوں کے ہاتھ آئے۔

قلعے کے روسیوں نے جو اس شکست کی خبر سنی تو ہاتھ پاؤں پھول گئے سٹی، پٹی بھول گئے چال تو اچھی چلے تھے مگر ترکی فوج کے سپہ سالار نے ان کی سب آرزوؤں کا خون کیا۔ میاں آزاد کا سینہ باغ باغ تھا۔ پھولے نہیں سماتے تھے، کھلے جاتے تھے کہ آج پہلی فتح پائی اور رومیوں نے شکست کھائی۔

اب کچھ کچھ صبح کے آثار نمودار ہوئے کمانیر نے قلعے کے حالات کی تحقیقات کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کیں۔ فوج ایسے مقام پر کھڑی تھی کہ روسی گولے وہاں تک نہ پہنچنے پائیں،

علیقو پاشا: کل شام تک انشا اللہ قلعہ بھی خالی کرالیں گے۔ بڑا مضبوط قلعہ

ہے۔

احمد پاشا: کیا تم نے کبھی اس قلعہ کی سیر نہیں کی ہم تو کئی بار دیکھ چکے ہیں۔

آزاد پاشا: اب شام تک انشا اللہ اس قلعے کی سیر کر رہے ہوں گے، اس کی عظمت کے تو ہم ابھی سے قائل ہو گئے اور سنا ہے کہ اس میں ایک بہت بڑی توپ ہے۔

احمد پاشا: مگر ایک بات یاد رکھیے گا، جب کبھی دشمن سے میدان میں مقابلہ ہو تو اس کو یہ موقع نہ دیجیے گا کہ ایک حصہ فوج کا لے کر کسی جانب سے آپ کی باقی فوج پر آ گرے۔ جیسا کہ آج ہوا ہے۔ یہ عیب ہے۔

آزاد پاشا: سنیے تو کہ اس کا باعث کیا ہوا۔ ہم نشیب میں تھے، اور دشمن بلندی پر۔ وہ ہم کو بخوبی تنگ کر سکتا تھا اور ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تو میں جان پر کھیل کر بڑھتا گیا ورنہ سب کے سب خاک و خون میں لوٹتے ہوتے۔

احمد مختار پاشا: پھر صحیح ہے، ہم کو یہ نہیں معلوم تھا ہم اور علیقو پاشا تو دیکھتے جاتے تھے، مگر کچھ کچھ کاروائی نظر آتی تھی۔

۔۔۔۔۔۔۔اختتام۔۔۔۔۔۔

قلعے کا محاصرہ

دوسرے روز سے ترکوں نے قلعے کا محاصرہ شروع کر دیا۔ تین جانب سے قلعے کو گھیر لیا گیا مگر چوتھی جانب سے مشکل تھی۔ ایک تو وہاں جانے کے لئے ایک دریا حائل تھا ترکی انجینئر دریا عبور کرنے کی آسانی سے فکر کر سکتے تھے۔ مگر دریا قلعے کی دیوار سے ملحق تھا، اور اسی مقام پر روسیوں کی توپیں نصب تھیں۔ روسی گولہ انداز خدا سے دعایں مانگتے تھے کہ ترکی اس طرف آئیں تو ہم پرے کے پرے توپ کے ساتھ اڑادیں۔

ترکی کالم اس طرف بڑھا تو روسیوں نے قلعے سے توپیں چلائیں۔ گیارہ ترکی زخمی ہوئے اور دو پیادیاں ی مقام سے لوٹ گئے۔ روسیوں نے بہت عجلت کی ورنہ اگر ذرا اور ٹھہر جاتے تو پھر پورے دستے کی خیر نہیں تھی۔ افسر کمانیر نے اسی وقت کس قدر گھبرا کر کہا:

شکر ہے کہ صرف دو ہی شہید ہوئے، ورنہ بہت نقصان ہوتا۔ اب ترکوں نے قلعے کو چوتھی جانب سے گھیرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ روسی قلعے میں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ان کو خوب معلوم تھا کہ ترکی فوج قلعہ خالی کرالے گی، لہذا بھاگ جانے کی ایک راہ تجویز کر چکے تھے۔ اور سوچتے تھے کہ اگر ترکوں نے گولہ اندازی شروع کر دی تو جب تک ہمارے پاس گولہ بارود ہے تب تک جواب دیں گے ،اور جب ختم ہو جائے گا تب چپکے سے قلعہ چھوڑ کر نکل جائیں گے۔ دونوں اپنی اپنی گھات میں تھے۔

افسر کمانیر نے کہا:

گاؤں سے دو کوس مشرق کے رخ روسیوں کا ایک رسالہ آن پہنچا ہے۔ دس سوار خبر لانے جائیں ورنہ پھر ٹیڑھی کھیر ہے۔

ایک پاشا: آپ کو کیوں کر معلوم ہوا کہ روسیوں کا رسالہ آ گیا ہے۔

کمانیر: ابھی ایک شخص نے آن کر بتایا ہے خبر معتبر معلوم ہوتی ہے۔

دوسرا پاشا: ایک رسالہ آن پہنچا۔ فوراً خبر لانی چاہیئے۔

تیسرا پاشا: قلعے کی تو قلعی کھل گئی، یہاں تو بالکل سناٹا ہے۔

علیقو پاشا: ہاں ورنہ اب تک گولہ نہ چلتا ہوتا۔

آزاد: تو اگر ادھر سے گولہ نہ چلتا ہو۔

آزاد: تو اگر ادھر سے نہ چلے تو کیا کچھ فرض ہے کہ ہم بھی خاموش رہیں۔ ہم تو گولے چلائیں گے ان کا مصالح تو خالی ہو گیا۔

کمانیر: ہم نے سنا ہے کہ اس گاؤں کے مشرق کے رخ روسیوں کا رسالہ قلعے والوں کی کمک کے لئے آن پہنچا ہے۔ جب تک اس خبر کی تصدیق یا تردید نہ ہو گی، ہم کوئی کاروائی نہ کریں گے۔

آزاد پاشا نے اجازت لے کر گھوڑے کی باگ اٹھائی۔ دس سوار ساتھ لیے اور چلے۔ کوئی کوس بھر کے فاصلے پر گئے ہوں گے کہ روسیوں کا رسالہ سامنے نظر آیا۔ جو سوار گرداوری کر رہے تھے۔ ان میں سے کوئی چالیس پینتالیس ان کی برف جھپٹے۔ ادھر آزاد پاشا نے گھوڑا بھگایا، ادھر انھوں نے ان کا پیچھا کیا۔ گو آزاد پاشا کا گھوڑا بہت تیز تھا۔ مگر روس کے دو افسر اور تین سواروں نے ان کے گھوڑے

کے قریب آن کر للکارا۔ اب آزاد پاشا کے ساتھ نو سوار رہ گئے تھے۔ ایک سوار کو روسیوں نے راستے میں قتل کر ڈالا۔ آزاد پاشا نے دیکھا کہ چاہے جس قدر تیز گھوڑا جائے۔ ان سے آگے نہ بڑھنے پائے گا۔ ناچار نو سواروں سمیت انہوں نے گھوڑے کی باگ پھیر دی۔ اب ان کا اور ایک روسی افسر کا مقابلہ ہونے لگا۔

اس نے بندوق سر کی۔

دھائیں۔

مگر نشانہ خالی گیا۔

دونوں نے تلواریں سونتیں۔ اس نے ایک ہاتھ لگایا۔ تلوار آزاد پاشا کے گھوڑے کے کان تک آئی تھی، کہ آزاد نے روسی افسر کا ہاتھ اڑا دیا۔ ہتکلٹی اسے کہتے ہیں اتنے میں دوسرے سوار آ گئے۔ ترکی سواروں نے بندوقیں چلائیں، تو روسیوں کے دو گھوڑے زخمی ہو کر گر پڑے اور تین آدمی لوٹنے لگے۔ ادھر آزاد پاشا کے گھوڑے کے پٹھے پر زخم لگا اور خون جاری ہو گیا۔ غرض ادھر یہ اور ادھر وہ۔ دونوں اپنے اپنے پڑاؤ کی طرف چلے۔ وہ اپنے بیڑے میں پہنچے تو ایک افسر کا ہاتھ غائب تھا۔ تین سوار غائب۔ آزاد پاشا اپنی رجمنٹ میں آئے تو گھوڑا زخمی۔

ایک سوار کا پتا نہیں۔ ایک گھوڑا نظر نہیں آتا۔ دس بھیجے تھے نو ہی واپس آئے۔ دو سوار سخت زخمی ہو گئے تھے۔ مگر ایک گھوڑے پر دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک ترکی وردی پہنے تھا اور دوسرا روسی تھا۔

اس پر لشکریوں نے خوشی کا نعرہ مارا کہ ایک روسی کو قید کر لائے ہیں۔

کمانیر: یہ مڈبھیڑ کس مقام پر ہوئی؟

آزاد: یہاں سے کوئی سوا کوس کے فاصلے پر۔

کمانیر: کیا روسی سوا کوس کے فاصلے پر ہیں؟۔

آزاد: نہیں کوئی دو کوس کے فاصلے پر۔مگر گرداوری کے سواروں کا ہم سے مقابلہ ہو گیا۔ہم تو دیکھ بھال کر واپس آئے تھے۔مگر انھوں نے پیچھا کیا۔ہم نے گھوڑے بھگائے کہ آپ کو اطلاع دیں،لیکن جب وہ سر پر آگئے تو مجبور ہو کر خوب دل کھول کے مقابلہ کیا۔

اتنے میں سواروں نے آزاد کی تعریف کی۔نو سواروں میں سے آٹھ اس کے مداح تھے۔اور نویں سوار میں تکلیف اور پیاس کی شدت کے سبب بولنے کی طاقت نہ تھی۔

ایک سوار: آزاد پاشا نے گھوڑا پھیر کر روسی افسر کا مقابلہ کیا،اور اس خوب صورتی کے ساتھ کہ ایک ہی وار میں اس کا ہاتھ کاٹ کر پھینک دیا۔

دوسرا سوار: پہلے دونوں کی بندوقوں کا نشانہ خالی گیا۔مگر آزاد پاشا بڑی جوانمردی سے لڑے۔

تیسرا سوار: ایسے مقام پر گھوڑا پھیرنا اور بچانا دل لگی نہیں ہے۔

چوتھا سوار: جب تک ہم لوگ پہنچے،یہ روسی افسر کا ہاتھ کاٹ چکے تھے۔بالکل بے بس کر دیا تھا۔افسر ہو تو ایسا۔پہلے تو باگیں اٹھا کر ہم سب واپس آتے تھے۔مگر جب وہ لوگ سر پر آگئے تو سوائے مقابلہ کے کوئی چارہ نہ تھا۔تو آزاد پاشا پلٹ

پڑے اور ہم سب بھی ساتھ ہی ساتھ پلٹے۔تلوار چلنے لگی اور ہم غالب رہے۔

پانچواں سوار: ہم نے دور سے دیکھا کہ روسی سوار پرے جمائے کوچ کے لیے تیار کھڑے ہیں۔

کمانیر: ہوں تو اب قلعے کا خالی کرانا ایک کام ہے۔اور اس رسالے سے مقابلہ کر کے اس کو ہٹانا دوسرا کام ہے۔اگر ہم ادھر جاتے ہیں تو ادھر یہ لوگ قلعہ چھوڑ کے صحیح سالم نکل جاتے ہیں۔یا شاید ادھر سے یہ مقابلہ کریں اور ادھر سے وہ۔اگر ہم نہیں بڑھتے تو وہ رسالہ بڑھتا ہے۔اس صورت میں ہم دونوں جانب سے گھر جائیں گے ۔غور طلب بات ہے اچھا،جب تک وہ رسالہ آئے قلعے پر گولہ باری شروع کر دو۔مگر ذرا اور غور کرنے دو۔

کئی پاشا مشورے کے لئے آئے اور آخر یہ رائے قرار پائی کہ پھر سوار بھیجے جائیں،اور وہ جا کر بغور دیکھیں کہ روسی رسالہ کس طرف جانے کا قصد رکھتا ہے۔

آزاد پاشا نے کہا: میں جاتا ہوں۔مگر کمانیر نے کہا:

نہیں ابھی کسی قدر تھکے ہوئے چلے آتے ہو۔ریاض پاشا بیس سوار لے کر جائیں گے۔

ایک سوار نے جو اس قلعے میں عرصے تک رہ چکا تھا کہا:

''میں جا کے دو آدمیوں کو بھیجتا ہوں۔دودھ بیچنے کے بہانے سے وہ جائیں گے۔

کمانیر نے کہا:

بہتر ہے۔

سوار گاؤں گیا اور ایک بوڑھے آدمی کو بلا لایا۔ کان میں کہا کہ:

یہاں سے کوئی ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر روسیوں کی فوج آ گئی ہے۔ جا کر ٹوہ لو کہ کدھر جاتے ہیں۔ اور کتنے آدمی ہیں۔

بوڑھا ایک اور آدمی کو لے چلا۔ تو ادھر روسی قیدی اور ترکوں میں باتیں ہونے لگیں:

روسی: (آزاد سے) ہم سے بڑی بڑی قواعد لی جاتی ہے۔ ذرا چوک ہوئی اور کوڑے پڑنے لگے۔ پچاس کوڑے تک سزا جائز ہے۔ چاہے کیسا ہی سخت جرم ہو پچاس کوڑوں سے زیادہ سزا نہیں دی جا سکتی۔ سب سے سخت سزا یہ ہے کہ آٹھ دن تک تنہا ایک اندھیری کوٹھری میں قید کر دیتے ہیں۔ اور کوٹھری قبر سے زیادہ تنگ ہوتی ہے۔

جو سوار ریاض پاشا کے ساتھ روسی رسالے کی خبر لانے کے لیے گئے تھے۔ وہ اتنے میں واپس آ گئے۔ انھوں نے کہا:

روسیوں کا رسالہ خاص قلعہ والوں کی کمک کے لئے آیا ہے۔ بیرونی مدد دے کر وہ قلعے کی فوج کو اپنے ساتھ لے جائیں گے، یا اگر موقع ملا تو ہم کو ہٹا دیں گے۔ مگر رسالے کے گھوڑے اور سوار سب خوب صورت ہیں۔ کل رات کی شکست کا حال سن کر روسی بہت جھلائے ہوئے ہیں اور تلے ہوئے ہیں کہ بدلہ لیں۔

اتنے میں وہ دونوں جاسوس بھی آ گئے۔ جن برتنوں میں دودھ بیچنے لے گئے تھے۔ وہ سامنے پھینک دیے،

سواروں نے بڑھ کر پوچھا:

کہو کچھ پتا لگایا۔کوئی بات دریافت ہوئی۔

بوڑھا: بڑی فوج ہے اور وردیاں ایسی چمکتی ہیں جیسے شیشہ۔

سوار: کبھی پہلے بھی فوج دیکھی تھی۔

بوڑھا: ہونہہ عمر گزر گئی۔بیسیوں لڑائیاں دیکھ ڈالیں، یہ ایک دو لیے پھرتے ہیں،

سوار: دودھ بکا یا نہیں؟

بوڑھا: فوج میں دودھ لے کر گئے ہم، پہلے تو دو ایک افسروں نے پوچھا:

''تم کون ہو''

''ہم نے کہا''

دودھ بیچنے آئے ہیں۔

کہا:

''دودھ میں سنکھیا تو نہیں ہے۔

ہم نے کہا:

چکھ کے دیکھ لو۔

''چکھتے ہی لوٹ جائیں''

میں نے تھوڑا سا دودھ خود پیا، تب انھوں نے دودھ لیا اور دام دیے۔

پاشا: ہم لوگوں کا حال کچھ پوچھتے تھے۔

بوڑھا: بہت کچھ پوچھا، رات کو جو لڑائی ہوئی، اس کا حال پوچھا۔ہم نے کہا، دونوں طرف سے باڑھ چلتی تھی۔ہم تو دبکے دبکائے اپنے جھونپڑوں میں

بیٹھے تھے۔ صبح کو معلوم ہوا کہ روسی ہار گئے۔ اور ترکوں نے فتح پائی۔ لاشیں تو ہم نے بھی دیکھی تھیں۔

پاشا: کچھ سنا کہ کس طرف جانے والے ہیں۔

بوڑھا: ہاں ہاں اسی طرف آتے ہیں۔

سوار: خوب معلوم ہے کہ اسی طرف آئیں گے۔

بوڑھا: ہاں بس کوئی دو گھنٹے میں اس طرف بڑھیں گے۔

کمانیر: (سواروں سے) تم کو دیکھ کر روسیوں نے پیچھا نہیں کیا۔

سوار: نہیں ہم آڑ میں تھے۔ جھاڑی کی آڑ میں کھڑے تھے۔ جب ہم نے دیکھا کہ گرداوری کے ساتھ آتے ہیں تو آہستہ آہستہ چل کھڑے ہوئے، مگر ہم نے کئی بار دیکھا۔ فوج میں بڑا جوش و خروش تھا۔ تین توپیں ہم کو نظر آئیں۔

پاشا: توپ خانہ بھی ساتھ تھا۔

کمانیر: ہماری رائے یہ ہے کہ نصف فوج یہاں مورچہ بندی کرے اور قلعے پر گولے چلائے۔ تین طرف سے قلعے کو ہم نے محصور کر لیا ہے۔ نصف نصف فوج ہر سمت رہے۔ اور باقی فوج رسالے کی طرف بڑھے۔ تاکہ اس کو راستے ہی میں روک دے۔ آگے نہ بڑھنے پائے اور ہم صرف دو سو سواروں کو لے کر درمیان میں ٹھہریں، تاکہ دونوں طرف کا حال ہمیں معلوم رہے۔

اس رائے سے کل افسروں نے اتفاق کیا۔ فوج ترتیب کے ساتھ آراستہ ہوئی اور چلی۔

آزاد پاشا اس کالم کے ہمراہ تھے جو مغرب کے رخ قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے

تھا۔

علیقو پاشا اس کالم کے ہمراہ گئے، جو روسی فوج سے مقابلہ کرنے گیا تھا۔

اب سنیے کہ ایک کوس کے فاصلے پر ترکی رسالہ رک گیا۔ اور جنگ شروع ہو گئی۔ کمانیر کے کان میں دھائیں دھائیں کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ سواروں نے غل مچایا کہ وہ جنگ شروع ہوگئی۔ جو دستہ قلعے کو گھیرے ہوئے تھا، اس نے بھی آواز سنی اور دفعتہً قلعے سے بھی گولہ چلنے لگا۔

دھنا۔۔

اور پھر تین طرف سے گولے برسنے لگے۔ کمانیر جنرل دونوں طرف کی جنگ کا حال دیکھ رہے تھے۔

ترکوں کے ایک گولے نے مغرب کے رخ بیرونی قلعے کے برج کو ڈھا دیا اور کئی توپیں مع چالیس روسیوں اور گولہ اندازوں کے ارارکر کے گر پڑیں، اور اس برج نے تیس گھوڑوں اور گیارہ سائیسوں کی جان بھی لے لی۔ اس برج کے نیچے ہی گھوڑے بندھے تھے۔ ترکوں نے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ اس پر روسی اور بھی جھلائے۔ جھلا کر گولے چلانے لگے۔ کہ اتنے میں ترکوں کا ایک گولہ قلعے کے ایک کوٹھے پر پھٹا، جس کے ٹکڑوں سے دو روسی افسر دو گولہ انداز دو سپاہی اسی دم ٹھنڈے ہو گئے۔

روسی افسروں نے دیکھا کہ معاملہ نازک ہوتا جا رہا ہے۔ بڑی تشویش ہوئی، تسکین فقط یہ تھی کہ باہر سے کمک آیا ہی چاہتی ہے۔ مگر ان کا یہ خیال خام تھا۔ پانچ چھ افسر ایک بلند مقام سے دوربین لگا کر میدان کی طرف دیکھنے لگے۔ دیکھا

کہ افسر کمانیر کچھ سواروں کو لے کر وسط میں ہے۔اور روسی اور ترکوں کے درمیان گولی چل رہی ہے۔انھوں نے خوشی کا نعرہ لگایا کہ ہمارے سوار لڑ بھڑ کر ہماری مدد کو ضرور آئیں گے۔مگر عین اس خوشی کی حالت ایک ترکی گولہ اس بلند مقام پر پھٹا جہاں یہ روسی افسر دوربین سے دیکھ رہے تھے۔اور اسی دم وہ سب افسر اس دنیا سے کوچ کر گئے۔اپنے رسالے کو دوربین کے ذریعے سے دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے مگر یہ آخری خوشی تھی۔

ترکوں نے تھوڑی دیر میں قلعے کی مغربی دیوار کو جو بے حد مضبوط تھی، مارے گولوں اور گولیوں کے چھلنی کر دیا۔اس کے علاوہ وہ دو اور اطراف سے بھی آگ برسا رہے تھے۔روسیوں کے پاس قلعے میں اس قدر سامان نہ تھا کہ تین طرفوں سے ترکوں کا مقابلہ کرتے۔

غرض جب ترکوں نے تین جانب سے قلعے کو گھیر لیا تھا، اور تینوں طرف سے گولیاں اور گولے برسائے۔تو روسی قلعے کے اندر سخت عاجز ہو گئے۔ترکوں نے قلعے کا ایک برج گولیوں سے اڑا دیا۔کئی روسی افسروں کو جو دوربین سے اس فوج کو دیکھتے تھے۔جو بیرونی مدد دینے کو آئی تھی، ایک ہی گولے سے ٹھنڈا کر دیا۔تو ترکوں کا دل اور بھی بڑھا مگر روسی اپنی تشویش ناک حالت پر افسوس کرتے تھے۔ خصوصاً جب انہوں نے دیکھا کہ جو فوج ان کی مدد کو آئی تھی۔روک دی گئی۔اور ترکوں کے ایک دستے نے آگے بڑھ کا ان کا مقابلہ کیا اور دوسرے دستے نے قلعے کو گھیر لیا۔تو رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔

اب روسی افسر قلعے میں باہم مشورے کرنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔

ایک افسر: بات بڑی بے ڈھب ہوئی ہے، اب کچھ نہ کچھ فکر کرنی چاہیئے۔

دوسرا افسر: اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے کہ قلعہ چھوڑ دیں۔ اور چپکے سے نکل جائیں۔

تیسرا افسر: ہاں صحیح ہے مگر قلعہ چھوڑا اور دریا کی طرف ترکی دستے نے ہمارا تعاقب کیا، بس پھر جان بچنی محال ہو جائے گی اور کتے کی موت جان جائے گی پھر کرتے دھرتے کچھ نہ بن پڑے گی۔

چوتھے افسر نے جو سب سے زیادہ تجربہ کار تھا کہا

گولہ انداز دریا کی طرف والے برج میں رہیں، جب ہم لوگ نکل جائیں تب وہ بھی بھاگ کھڑے ہوں۔ اس عرصے میں اگر ترکوں کے دستے نے دریا کی طرف جانے کی کوشش کی تو گولہ انداز اوپر سے آگ برسائیں۔ ہم کو موقع ملے گا کہ ہوشیاری کے ساتھ نکل جائیں۔

یہ گفتگو قلعے کے اندر خاص خاص افسروں میں ہو رہی تھی۔ کہ ترکوں کا ایک گولہ دوسرے برج پر گرا اور دیوار سے ٹکرایا۔ برج کو گراتا ہوا قلعے کے صحن میں پھٹا، تو چونتیس آدمیوں کو زخمی کیا، دو سپاہیوں اور ایک لیفٹیننٹ کی جان لی۔ اب اور بھی کھلبلی مچی۔ یہ گولہ ابھی سرد نہ ہوا تھا کہ ایک اور گولہ آیا اور پھٹتے ہی تین آدمیوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ اس کے بعد ترکوں نے گولوں کی بھر مار کر دی اور تمام میدان میں دھنا، دھنا۔ دھنا کی آواز گونجنے لگی۔

روسی جنرل نے اپنے گولہ اندازوں کو حکم دیا:

جتنی توپیں ہیں سب پر بتی پڑے اور صف شکن بھی گولے برسائے۔ گولہ

اندازکوپوری خوراک دی جائے گی تو تھوڑی دیر میں سناٹا ہو جائے گا۔

ادھر یہ گفتگو ہوتی تھی، ادھر میدان میں ایک اور گل کھلا۔ روسیوں ک ادستہ اس قدر قریب آ گیا کہ گولوں کی لڑائی بے کار ہو گئی۔ گو ترکوں نے برابر باڑھ پر باڑھ ماری مگر روسی گرتے گرتے فوج کو لے ہی آئے، تا کہ اس دستے کو شکست دے کر قلعے والوں کی مدد کو پہنچیں۔ اگر یہ دستہ شکست پاتا بھی تو روسیوں کی تمنا پوری نہ ہوتی۔ تین طرف سے فوج قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھی، اور قلعے کی روسی فوج کے پاس اتنا سامان بھی نہ تھا کہ دو گھنٹے مقابلہ کرتی۔ روسیوں نے تلوار لی اور جھپٹے۔ ترکوں نے بھی دست بدست جنگ کی، مگر اچانک ایسی گھنگھور گھٹا چھائی کہ کل میدان میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ گھٹا ٹوپ اندھیرا کی کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ جو جس مقام پر تھا، خاموش کھڑا رہ گیا۔ قلعے کی روسی فوج نے چاہا کہ نکل بھاگے مگر راستہ ہی نہ سوجھتا تھا، بڑے بوڑھے آدمیوں کا قول ہے کہ ایسی تاریکی اور ایسے کالے بادل کبھی نہیں دیکھے تھے۔

آزاد پاشا، علیقو پاشا اور احمد پاشا اپنے اپنے دستوں کو چھوڑ کر گشت کرنے لگے اور بگل بجنا شروع ہوا۔ کہ سب اپنی اپنی جگہ پر رہو۔ جب کچھ تاریکی کم ہوئی۔ یہ تینوں دوست ایک مقام پر آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ مگر ایک کی بھی شکل نظر نہ آتی تھی۔

اتنے میں بادل چھٹنے لگے اور کچھ کچھ روشنی نمودار ہونے لگی، روسی سمجھے کی ترک ابھی کچھ دیر خاموش رہیں گے اور ہم کو موقع ملے گا کہ دریا کی طرف بھاگ جائیں، لیکن یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ترکوں نے توپ پر بتی دی اور دھنا کرتا ہوا

گولہ آیا۔

ارے افوہ۔ ہم سمجھتے تھے کہ ترک غافل ہو گئے ۔ مگر وہ کب چوکنے والے ہیں۔ ابھی تک بادل منتشر نہیں ہوئے۔ تاریکی موجود ہے۔ مگر انھوں نے گولہ چلا ہی دیا۔

دوسرا آیا، تیسرا آیا۔ مجبور ہو کر روسیوں نے چند جری گولہ اندازوں کو قلعے کے ایک برج میں چھوڑا اور تیار ہو گئے کہ نکل بھاگیں، مگر چند آدمیوں نے صلاح دی کہ جلد بازی فضول اور اصول جنگ کے خلاف ہے۔ پہلے دیکھ لو کہ ترک کیا کاروائی کر رہے ہیں۔ اندازہ کر لو کہ ان کے کس قدر آدمی ہیں۔ پھر بے شک قلعہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لو۔ اس پر سب متفق ہو گئے۔ قلعے والوں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ دریا کی طرف بے شمار ترک سپاہی موجود ہیں۔ چند گولہ انداز انہیں کسی طرح نہیں روک سکتے تھے۔ اب بڑی پریشانی ہوئی، بھاگیں تو قتل ہوں اور قلعے میں رہیں تو ترکوں کے گولوں سے کھوپڑی پھٹتی ہے۔

یوں تو ترک فوج کا ہر ایک سپاہی شیر دل اور جوانمرد تھا، لیکن آزاد پاشا سب سے دس ہاتھ بڑھ چڑھ کے تھے۔ ان کے دل مین لگن تھی کہ روسی سپاہیوں کو بھگا کر اپنے تئیں شمالی سرحد تک پہنچائیں۔

اب سنیئے کہ آزاد پاشا چھ جری اور دلاور ترکوں کو لے کر قلعے کی طرف چلے۔ دوزینے ساتھ تھے چار مزدور لیٹ کر ان لکڑی کے زینوں کو آہستہ آہستہ لیے جاتے تھے۔ آزاد پاشا کے ساتھ وہ سوار بھی تھا جو قلعے میں عرصہ دراز تک رہ چکا تھا۔ قلعے کی ایک کھائی اور بنسواڑیاں اور کئی ایک جھاڑیوں کو طے کر کیآ زاد پاشا بڑی دیر

میں ایسے مقام پر پہنچے، جہاں میدان ہی میدان تھا۔ آزاد پاشا آڑ میں کھڑے رہے۔ جب مزدور زینے لے کر آئے تو انہوں نے سوار سے سوالات کرنا شروع کیے:

آزاد: قلعے میں تو بالکل سناٹا ہے۔

سوار: آدمی کم ہیں۔

آزاد: پھر ہمارا دستہ کیوں نہیں آتا۔ روکنے والا کون ہے۔

سوار: یہ فقط خیال ہی خیال تھا کہ یہ مقام خالی ہوگا، اگر فوج آتی اور روسی گولہ اندازی کرتے تو دستے کا دستہ اڑ جاتا یا نہیں۔ اسی سبب سے تو پانچ چھ آدمی آئے اگر مار بھی ڈالے گئے تو کیا وطن پر جان گئی۔ گئی۔

آزاد: اچھا اب فوج بلوالیں؟

سوار: ہاں اب کوئی مضائقہ نہیں۔

آزاد: اب یہاں تک آئے ہیں تو قلعے کی سیر بھی کرلیں۔ تھوڑی دیر بعد آزاد پاشا ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے قلعے کی دیوار بہت قریب تھی، ترکی گولہ انداز اب بچا بچا کر گولے چلانے لگے۔ تاکہ آزاد پاشا پر کوئی ٹکڑا نہ پڑ جائے۔ مگر آزاد پاشا جان ہتھیلی پر رکھ کر گئے تھے۔ سیدھے قلعے کی دیوار کے نیچے جا کر کھڑے ہو گئے۔

آزاد: زینہ لگا کر اندر کی حالت تو دیکھیں۔

سوار: دیوار اس قدر بلند ہے کہ توبہ۔ زینے اس قدر بلند کہاں کہ قلعے کا حال معلوم ہو جائے۔

آزاد: وہ دیکھو دیوار گری ہوئی ہے۔ ہمارے گولے نے دیوار کے ایک حصے

کوخاک میں ملادیا۔وہاں سے زینہ لگا کر دیکھیں۔

سوار: بڑا نازک معاملہ ہے، معلوم ہوتا ہے آپ کا کوئی پیچھے رونے والا نہیں۔

آزاد نے یہ فقرہ سنا لیکن زینہ لگا کر بلند آواز سے بسم اللہ کہہ کر کھٹ کھٹ کرتے ہوئے چڑھا گیا، دوسرا زینہ بھی لگایا گیا۔ چھ سپاہی اور سوار جو ساتھ تھے وہ بھی چڑھنے لگے۔ جب آخری سیڑھی پر پہنچے تو پھر بسم اللہ کہہ کر میاں آزاد نے اسپر پاؤں رکھا۔ اور دونوں زینوں سے لا الہ الا اللہ کی آواز بلند کی اور قلعے کی طرف جھانکا۔ سب نے مل کر تالیاں بجادیں۔ روسیوں نے جو آواز سنی اور آزاد پاشا اور دو آدمیوں کو دیکھا کہ قلعے کے اوپر آ گئے تو سمجھے کہ فوج کی فوج آ گئی ہے۔ ایک پر ایک گرنے لگا۔ بلا مشورہ و اجازت سپاہی اور سوار اور افسر اور جتنے تھے سب کے سب دریا والے رستے سے بھاگے۔ گولہ انداز بھی غائب اور افسر بھی۔ آزاد پاشا اور ان کے ساتھیوں نے پھر نعرہ بلند کیا۔ اس نعرے کی آواز ترکی فوج تک تو نہ گئی، مگر جب ترکوں کے ایک دستے نے دیکھا کہ روسی فوج دریا کی جانب سے نکل جاتی ہے۔ تو دو طرف سے اس پر حملہ کر دیا۔ اور ایک دستہ قلعہ کے اندر داخل ہو گیا۔ ان دونوں دستوں نے روسی فوج کو گھیر لیا۔ روسی اس وقت بے بس تھے۔ جب دیکھا کہ دو طرف سے مجبور ہو گئے ہیں اور بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تو سخت پریشان ہوئے۔

اتنے میں قلعے میں سے آزاد پاشا نے بندوق سر کی، مگر ترکوں نے اشارے سے منع کیا کہ گولی ابھی چلنے نہ پائے اور ایک سوار روسیوں کے پاس بھیجا۔

سوار نے جا کر روسیوں سے یوں گفتگو کی:

سوار: ترکی فوج کے اعلیٰ افسر نے ہمیں بھیجا ہے، اور کہا ہے کہ دریافت کرو یہ لوگ جان دینا چاہتے ہیں یا ہتھیار ڈالنا چاہتے ہیں۔

ایک افسر: ہم دونوں طرف سے محصور ہیں یہ ہمیں خوب معلوم ہے۔

سوار: دو ہی طرف سے نہیں، ادھر قلعے کی جانب بھی نظر ڈالو۔

روسیوں نے قلعے کی طرف دیکھا تو ترک ڈٹے ہوئے ہوش اڑ گئے۔

دوسرا افسر: ہم بالکل بے بس ہیں۔

سوار: پھر کیا ضرور ہے کہ خواہ مخواہ جان دیجیے۔

افسر: اب ہم لڑنا نہیں چاہتے۔

سوار: تو ہتھیار رکھ دو۔

راوی: مثل مشہور ہے کہ دبی بلی چوہے سے کان کترواتی ہے۔ آپس میں مشورہ کرنے لگے۔

کرنل: ہتھیار رکھنا تو بڑی شرم کی بات ہے۔

لیفٹیننٹ: مگر اب اور تو چارہ بھی نہیں۔

جنرل: وہ ہتھیار ہی کتنے ہیں۔ ذرا گنو تو۔

لیفٹیننٹ: ہاں سچ تو ہے۔ شاید دس پانچ تلواریں ہوں اور پندرہ بیس بندوقیں۔

کرنل: اچھا ہم ہتھیار رکھ دیتے ہیں۔

سوار: ہاں بس رکھ دو۔

روسیوں نے ہتھیار رکھ دیے اور ترکوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر کر

قید کرلیا۔اور قلعے میں لے گئے۔اس وقت ایک روسی افسر کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔دل ہی دل میں سوچنے لگا۔کہ اب تک قلعے پر قبضہ کیے دشمن سے لڑ رہے تھے،اور اب قید میں ہیں۔یہ افسر جنگ کریمیا میں کارہائے نمایاں کر چکا تھا،اور کئی لڑائیوں میں اس نے تمغے حاصل کیے تھے۔آج تک کسی جنگ میں اس نے شکست نہیں کھائی تھی،مگر اس قلعے میں آن کر ایسا پھنسے کہ قید ہو گئے۔اس افسر نے علیقو پاشا کو غور سے دیکھا۔اور علیقو پاشا نے اس پر نظر ڈالی۔

علیقو پاشا: کیا ہوا۔انقلاب زمانہ تو مشہور ہی ہے۔کبھی ہم غالب کبھی تم۔

افسر: (خون خوار ہو کر) اتفاق کی بات ہے۔

علیقو پاشا: ایسا ہی اتفاق سب کو ہوتا ہے۔

افسر (ماتھے پر بل ڈال کر) کیا بزدلوں کی سی باتیں کرتا ہے۔

علیقو پاشا: اب قید میں ہو،اس لئے چھوڑے دیتا ہوں ورنہ۔۔۔۔

ایک پاشا: اس بحث سے کیا فائدہ۔

دوسرا: قیدی سے کیا جھگڑتے ہو۔

تیسرا: بے کار اس کے منہ لگتے ہو۔

چوتھا: جانتے ہو یہ کون ہیں،بڑے نامی گرامی افسر ہیں۔

علیقو پاشا: ہونہہ مجھ سے کہتے ہو۔جنگ کریمیا میں میرا ان کا مقابلہ ہو چکا ہے۔جب ہی تو جھلا رہا ہے۔دھوکے دھوکے میں میں گرفتار ہو گیا تھا۔اور یہی افسر مجھے گرفتار کر کے لے گیا تھا۔

آزاد پاشا: اخاہ۔۔۔جب ہی یہ باتیں رمز میں ہو رہی ہیں۔

روسیوں کے ایک افسر نے آزاد پاشا کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

یہ بھی ترکی ہیں کیا؟۔

ترکوں نے کہا:

ہاں ٹھیٹھ ترک ہیں۔کیوں کیا کسی اور ملک کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔

روسی نے کہا:

نہیں ہیں تو سرخ وسپید، مگر بعض اوقات ان کا لہجہ ترکوں کا سا نہیں پایا جاتا۔

لوگوں نے کہہ دیا کہ ہندی ہیں۔

ترک قلعے کی سیر کرنے لگے، جو افسر اور سوار اس قلعے میں رہ چکے تھے وہ پرانی باتوں کو یاد کرتے اور پرانے مقاموں کو دیکھتے تھے، اور جو لوگ پہلے نہیں آئے تھے۔غرض ترک فاتح مزے سے قلعے میں دندناتے تھے۔

آزاد: آج بہت تھکے ہیں۔

سوار: کارنمایاں کیا ہے۔آفرین آفرین۔

دوسرا افسر: ہم ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی روسی دیکھ نہ لے۔اب ادھر کا حال سنیئے۔روسی اور ترکی دونوں دست بدست جنگ پر آمادہ ہو گئے تھے۔مگر گھٹاؤں کی تاریکی کے سبب سے دونوں کچھ کچھ پیچھے ہٹتے گئے۔حتیٰ کہ فاصلہ زیادہ ہو گیا۔

کماندر نے ٹیلے پر سے ہی دیکھ لیا تھا کہ ان کی فوج نے قلعہ خالی کرالیا ہے۔فوراً اپنے دو سواروں ک وحکم دیا کہ اس دستے سے جا کر مل جاؤ، جو میدان میں کھڑا ہے۔

سوار روانہ ہوئے اور ادھر قلعے سے سوار طلب کیے۔میاں آزاد نے چاہا کہ

سواروں کے ساتھ خود بھی جائیں۔مگر اس قدر شل ہو گئے تھے کہ اٹھنا محال تھا۔

علیقو:تم نہ جاؤ۔ہم جاتے ہیں۔

احمد:ہم کو جانے دو۔

اتنے میں دس پندرہ آدمیوں نے قلعے کے برج سے کہا:

وہ بھاگے،وہ بھاگے جاتے ہیں۔ہاں سوارو شاباش جانے نہ پائیں۔جانے نہ پائیں۔

آزاد پاشا اور کل افسروں وسواروں اور روسی قیدیوں کے کان کھڑے ہو گئے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔کون بھاگا۔سمجھ گئے کہ روسی بھاگے ہوں گے۔

برج پر جا کر دیکھا تو ترک تعاقب کر رہے ہیں۔اور روسی سوار بگٹٹ بھاگے جاتے ہیں۔سب نے مل کر خوشی کا نعرہ لگایا اور جو لوگ قلعے میں تھے۔انھوں نے بھی برج والوں کی دیکھا دیکھی نعرہ مارا۔

آزاد:میدان ہمارے ہاتھ ہے۔

ایک افسر نے دوربین کے ذریعے دیکھ کر کہا:

جیت تو ہم گئے ہیں مگر ایک خرابی ہے۔خدا جانے اگر روسی رسالہ اس ٹیلے پر پہنچ گیا تو ہم دب جائیں گے۔

آزاد:ہم کو وہ ٹیلا نظر نہیں آتا۔

افسر:ایک عینک اور چڑھائیے۔

آزاد:(مسکرا کر)واللہ ہمیں نہیں سوجھتا۔

افسر:اب بہت قریب ہے۔خدا نہ کرے کہ ٹیلے پر پہنچ جائیں۔

آزاد: ہاں خدا خیر کرے۔اب نظر آیا۔

روسی قیدیوں میں سے دو افسروں نے درخواست کی کہ اگر ترک اجازت دیں تو وہ بھی برجوں پر سے دیکھیں۔

کچھ سوار قلعے سے بھی روانہ ہوئے۔اور تھوڑی دیر میں میدان کے دستے سے مل کر گھوڑے دوڑا دیے تو روسیوں کو بھاگتے راہ نہ ملی۔ترکوں نے ان کا تعاقب کیا۔روسیوں نے بڑی کوشش کی کہ ٹیلے پر چڑھ جائیں،مگر ترکی سواروں نے دم نہ لینے دیا۔کئی سو سوار ٹیلے پر چڑھے،مگر باقی ایسے بدحواس ہو کر بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔جو سوار ٹیلے پر تھے،انہوں نے باڑھ مارنی شروع کی۔جس سے ترکوں کا کسی قدر نقصان ہوا۔ایک افسر نے فوراً فوج کے دو حصے کر دیے۔ایک حصے نے ٹیلے کے روسی سپاہیوں کا مقابلہ کیا۔اور دوسرے نے ان روسی سواروں کا تعاقب کیا جو بھاگے جاتے تھے۔آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سوار تو بھاگ نکلے۔مگر ٹیلے کے سواروں نے ترکوں کو بہت نقصان پہنچایا۔اگر تعداد میں کافی ہوتے تو ترکوں کو وہاں سے ہٹ جانا پڑتا۔مگر ترکوں کی تعداد زیادہ تھی۔انھوں نے روسیوں کے منہ پھیر دیے،بہت سے روسی مارے گئے۔باقی بھاگ گئے۔شام تک کل ترک فوج قلعے کے اندر روندناتی تھی۔رات کو ترکی فوج نے طرح طرح کی دل لگیوں سے خوشیاں منائیں۔

آزاد کا خط

میاں آزاد اور چند افسر اور کئی ہزار سوار اور پیادے قلعے کی حفاظت کے لئے مقرر ہوئے۔اور کچھ فوج روسیوں کے مقابلے کے لئے روانہ کی گئی۔گرداوری کے لئے جو سوار بھیجے گئے تھے۔انھوں نے اطلاع دی کہ پانچ میل کے فاصلے پر روسیوں کا لشکر جرار مقیم ہے۔لشکر خاص اس غرض سے آتا ہے کہ قلعے کو خالی کرادے،اور پھر اس قلعے کو اپنا صدر مقام بنائے۔

افسر کمانیر:وزیر جنگ کی تاکید ہے کہ یہ قلعہ ہمارے ہی قبضے میں رہے،اگر دشمن اس قلعے پر قابض ہوگیا تو ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔یہ قلعہ یورپین ترکی کی کنجی ہے۔لہذا ہماری فوج کو اس کی ہر قیمت پر حفاظت کرنی چاہیئے۔

ایک افسر:وزیر جنگ کے پاس خط و کتابت جاری ہے یا نہیں۔

کمانیر:برابر راستہ جاری ہے۔

افسر:تو بیشک ہماری کامیابی میں شک نہیں۔

کمانیر:اگر ہماری فوج کو کمک مل جائے تو کوئی ہمیں ہٹا نہیں سکے گا۔

افسر:وزیر جنگ کو لکھیے۔سپہ سالار کو لکھیے۔

کمانیر:لکھ چکا ہوں،کمک بہت جلد آنے والی ہے۔

میاں آزاد کو جو معلوم ہوا کہ قسطنطنیہ تک خط و کتابت جاری ہے،تو انھوں نے حسن آرا کے نام خط لکھا۔:

میدان جنگ

جولائی ۲۷، ۱۸۷۷ء

اب میدان جنگ ہے اور توپ وتفنگ سے کام ہے۔ یہاں کا حال سنو۔

روس اور ترکی کے درمیان ایک بہت بڑا دریا ہے۔ جس کا نام ڈینیوب ہے۔ یہ دریا دریائے گنگا سے بھی بڑا ہے۔ اور اسکے کناروں پر بڑے بڑے مشہور شہر واقع ہیں۔ بارش کے سبب سے آج کل دریا بہت چڑھا ہوا ہے۔

روس نے صوبہ رومینیا سے جو ترکی کا ماتحت ہے سازش کر لی ہے۔ جب ترکوں کو یہ خبر معلوم ہوئی تو انہوں نے قصبہ بکٹ واقع رومینیا پر قبضہ کر لیا۔ روسی شمالی کنارہ دریا کی طرف بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ اٹھارہ مئی تک کوئی پونے دو لاکھ آدمی جمع ہو گئے۔ ترکوں نے ایک جہاز جس کے ساتھ کشتیوں پر توپیں تھیں۔ ایک ٹاپو کی طرف بڑھایا، اور ایسے مقام پر لنگر انداز ہوئے کہ جنگل کی آڑ کے سبب سے روسیوں کو ان کا جہاز اچھی طرح نظر نہ آتا تھا۔ مگر تین مستول البتہ درختوں سے بھی اونچے تھے۔ ان کے سبب سے روسیوں کو معلوم ہو گیا کہ ترک کمین گاہ میں ہیں۔ روس کے گولہ اندازوں نے چھوٹی توپوں سے گولے پھینکنے شروع کیے۔ مگر ترکوں کا بال بیکا نہ ہوا۔ اس کے بعد دو بڑی بڑی توپوں سے گولے پھینکے۔ انھوں نے چالاکی یہ کی کہ ایک بلند مقام سے گولے پھینکے۔ آخر کار ایک گولہ ہمارے جہاز پر پڑا اور میگزین کو اڑا دیا۔ جس وقت روسیوں نے دیکھا کہ جہاز سے دھواں اٹھا تو خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ جب جہاز ڈوبنے لگا تو روسیوں نے دو چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھیجیں۔ انھوں نے نشان لے لیا۔ ترکوں کے جہاز پر کوئی سوا دو سو آدمیوں کے قریب تھے۔ جس میں سے پانچ چھ آدمی بچ نکلے۔ روسی اس فتح سے بڑے ہی خوش

ہوئے۔ٹوپیاں اچھلنے لگیں۔سپاہی افسروں اورافسر سپاہیوں کے گلے ملنے لگے۔

کچھ دن کا عرصہ ہوا۔روس اور ترکی کے جہاز ایک دوسرے کے مقابل لنگر انداز تھے۔جب ترکوں کو معلوم ہوا کہ روسیوں کا جہاز بھی آ گیا ہے۔ اور اندھیرے کے سبب ان کو بالکل نظر نہیں آیا ہے۔تو انھوں نے قصد کیا کہ وہاں سے چلیں۔پو پھٹتے ہی چلے۔مگر روسی جہازوں نے تعاقب کیا۔اب سنیئے کہ روسیوں نے ایک مقام پر تارپیڈو چھوڑا ہے۔انھوں نے بھی ایک تارپیڈو چھوڑا۔درمیان میں دونوں آپس میں ٹکرائے اور سرد ہو گئے جب روسیوں کو معلوم ہوا کہ ترکوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا ہے۔تو سخت شرمندہ ہوئے۔اب سنیئے کہ ایک بڑے اونچے مستول پر جا کھڑا ہوا۔روسیوں نے اس کی جرات دیکھ کر گولہ مارا۔کپتان نے سر کو ذرا ہٹا لیا۔گولہ دور جا کر دریا میں گرا اور ٹھنڈا ہو گیا۔روسی گولہ انداز جھلائے،پھر تاک کر دوسرا گولہ چلایا۔ترکی کپتان نے پھر سر ہٹالیا،گولہ دور جا کر دریا میں گرا اور ٹھنڈا ہو گیا۔اور نشانہ خالی گیا۔اب روسی گولہ انداز سخت شرمندہ ہوئے۔اب ایک ماہر اور اپنے کام میں تاک گولہ انداز آگے آیا۔اس نے کہا کہ اب کی اگر کپتان اس مقام پر کھڑا رہا تو اڑادوں گا۔یہ کہہ کر گولہ چلایا۔اس مرتبہ ترکی کپتان نے گولے کے قریب پہنچنے کے وقت تک ذرا بھی جنبش نہ کی۔اس سے پچاس قدم کے فاصلے پر گولہ پھٹا۔تب تو ترکوں نے تالیاں بجائیں۔خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ہمارے کپتان نے ٹوپی اتار کر روسیوں کو ٹوپی سے تین بار سلام کیا۔اور مستول سے اترے۔روسیوں نے اس لائق افسر کی خود تعریف کی۔اور بہت ہی شرمندہ ہوئے کہ ان کے گولہ اندازوں کے گولوں نے تین بار نشانہ خطا

کیا۔روس، روم، جرمنی اور آسٹریا،فرانس اور انگلستان کل ملکوں کے اخبار ہمارے کپتان کی بے حد تعریف کر رہے تھے۔ترکوں کے افسر اچھے نہیں ہیں، میرا دل روتا ہے کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ہاں ترکی سپاہیوں کا ساری خدائی میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔جان جائے مگر قدم پیچھے نہ ہٹے۔مگر افسوس کہ افسر اچھے نہیں ملے۔دل روتا ہے، خدا کی قسم دل روتا ہے۔اگر ترکوں نے خدانخواستہ شکست بھی پائی تو میں یہی کہوں گا کہ ترکی سپاہی بہادری میں کسی قوم سے کم نہیں ہیں۔اس وقت میرا دل بھر آیا، جہاز اچھی حالت میں نہیں ہیں۔ مرمت تک نہیں ہوئی۔افسوس اب فرمایئے، سپاہ بے چاری کیا کرے۔ترکوں کو یہاں تک منظور ہے کہ تنخواہ نہ ملے، مگر جنگ کے ہتھیار اور اسلحہ تو درست ہوں۔ہائے افسر لائق ہوتے تو ترک اب تک روس کے چھکے چھڑا دیتے۔مگر افسروں کی لیاقت ظاہر ہے۔کسی بات کی پرواہ ہی نہیں۔

روس کی آبادی نو کروڑ ہے۔ترکی کی آبادی تین کروڑ کے قریب ہے۔ تگنے کا فرق ہے۔دونوں سلطنتوں میں روپیہ نہیں ہے۔دونوں کی اندرونی حالت خراب ہے۔رشوت کی دونوں ملکوں میں گرم بازاری ہے۔مگر ترک بڑے نیک ہیں، تین پانچ نہیں جانتے۔روسی وعدہ خلاف اور عہد شکن ہیں۔ترکوں نے جو کہا وہ کیا۔ان کی جرات کا ایک زمانہ معترف ہے۔اگر کوئی تنگ کرے یا چھیڑے تو آگ ہو جائیں، اور شیر کی طرح بپھر پڑیں، ورنہ ان کی مہمان نوازی اور انسانیت کا کوئی جواب نہیں۔

ایک لائق انگریز کی رائے ہے کہ ساری دنیا میں جانوروں کے ساتھ انسان

اس رحمدلی اور سلوک کے ساتھ پیش نہیں آتے۔جس قدر رحم اور محبت کے ساتھ ترک پیش آتے ہیں۔

میدان جنگ میں جو کچھ کاروائی میں نے کی۔اس کا بیان شیخی نہ سمجھنا۔مگر اس قدر ضرور لکھوں گا کہ جب اس قلعے میں جس میں بیٹھ کر میں خط لکھ رہا ہوں، روسی فوج مقیم تھی۔اور جب تین طرف سے ترک اس قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔اور دونوں طرف سے آگ برسائی جا رہی تھی۔تو تمہارا پیارا آزاد جان پر کھیل کر صرف پانچ سواروں کو ساتھ لے کر قلعے کے اندر گیا تھا۔جب روسیوں کا ایک دستہ رات کے وقت دفعتًہ جنگل کے ایک کونے سے ہماری فوج پر حملہ آور ہوا تھا۔تو تمہارا آزاد ہی اس کے مقابلے کے لئے بھیجا گیا تھا۔اور دشمن کو شکست فاش دی تھی۔نازک نازک وقتوں میں جب کہ دشمن کی خبر لانا،اور اس کی نقل وحرکت کا حال دریافت کرنا نہایت ہی جرات کا کام تھا۔تو آزاد ہی صرف دس بارہ سوار لے کر جاتا تھا۔اور خبر لاتا تھا۔آزاد نے روسی رسالے کیافسر سے دست بدست جنگ کی۔اور اس کو زخمی کر کے اپنے سواروں کو بچا لایا۔اور اپنی فوج کو روسیوں کی نقل وحرکت کی اطلاع دی۔

یہاں کے افسر مجھ سے بے حد خوش ہیں۔وزیر جنگ بے حد تعریف کرتے ہیں۔افسر اعلی میرا دم بھرتے ہیں۔خوجی مسخرے کو میں قسطنطنیہ چھوڑ آیا ہوں۔لیکن اگر قلعے میں رہنا ہوا تو بلا لوں گا۔

خط نہ ملنے کی شکایت تو ضرور کرتی ہو گی مگر میدان جنگ سے خط کیوں کر بھیجوں۔بعض بعض مقاموں پر اب تک راستہ بند ہے۔آمدورفت محال

تھی۔یہاں سے یہ خط قسطنطنیہ جائے گا۔اور وہاں سے ہندوستان تمہارے پاس پہنچے گا۔اس خط کا جواب اس پتے سے بھیجنا۔

قسطنطنیہ۔ترکی

کوٹھی ہرمزجی بھائی۔کومل کر۔آزاد پاشا کو ملے۔

یہ خط لکھ کر میاں آزاد قلعے میں ادھر ادھر سیر کرنے لگے۔دو چار افسران کے ہمراہ تھے۔

آزاد: خالی خولی بیٹھنا تو اچھا معلوم نہیں ہوتا۔

علیقو: ہاں بس اب تو جنگ سر پر سوار ہے۔

محمد پاشا: ہم کو تو یہ قلعہ پھاڑے کھاتا ہے۔

علیقو: یہی حال اپنا بھی ہے۔

آزاد: افسوس ہے کہ اس دستے کے ساتھ ہم نہ بھیجے گئے۔

محمد پاشا: چلیں شکار کھیلیں۔

آزاد کو یہ تجویز پسند نہ آئی چنانچہ اٹھے اور دریافت کیا کہ ڈاک لے کر کون لوگ جائیں گے۔

ان سے جا کر کہا۔

بھائی واسطے خدا کے ذرا حفاظت سے ڈاک لے جانا۔

سوار: بہت حفاظت سے لے جائیں گے۔کیا حضور کا بھی کوئی خط ہے۔

آزاد: ہاں بڑا ضروری خط ہے۔

سوار: آپ خاطر جمع رکھیں۔راستہ صاف ہے۔

آزاد: ہاں راستہ تو صاف ہے۔

میاں آزاد قلعے کے ایک برج پر جا کر دوربین سے جنگل کو دیکھنے لگے۔ دیکھا کہ چوطرف میدان ہے۔ اور جنوب کی طرف فوج مقیم ہے۔ قلعے کے ایک طرف دریا لہریں مارتا ہے۔ سوچے کہ چل کر کشتی میں سوار ہوں اور دو گھڑی دل بہلائیں۔ دو چار آدمیوں کو ساتھ لیا اور چلے۔ ایک کشتی پر سوار ہوئے۔ دریا کی روانی کے مزے اڑاتے ہوئے چلے جاتے تھے کہ دفعتہً گرد نمودار ہوئی۔

آزاد: یہ گرد کیسی ہے؟۔

مانجھی: کیا روسی تو نہیں آ گئے؟۔

آزاد: لاحول ولاقوۃ۔

مانجھی: مگر گرد زیادہ نہیں ہے۔

سوار: دس سے زیادہ آدمی نہیں ہیں۔

مانجھی: ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔

آزاد: ہاں ہیں تو سوار مگر تعداد کم ہے۔

سوار: چھ بندوقیں ہم لوگوں کے پاس ہیں۔ اور سب بھری ہیں۔ اگر روسی ہوئے اور انھوں نے بندوق سر کی تو ہم بھی چلائیں گے۔ مگر روسیوں کو جرات کیوں کر ہوئی، کہ بے دھڑک قلعے کے قریب چلے آتے۔ اور پھر گرداوری کے سواران کو نہ دیکھتے۔ یہ صرف شک ہی شک ہے۔ روسی نہیں ہیں۔

آزاد: روسی گولی چلائیں تو جان جانے کی پرواہ نہیں مگر خرابی یہ ہے کہ بلا کوئی کارنامہ کیے ہوئے جان جائے گی۔ اگر کسی بڑی جنگ میں قتل ہوں اور شمشیر

جرات کے کچھ جوہر دکھائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ دل کا حوصلہ تو نکلے۔ یہ کیا کہ کشتی پر دس بارہ آدمی سیر کر رہے تھے کہ گولی پڑی۔ چلیے لوٹ گئے۔ خدا کرے روسی نہ ہوں۔ آؤ کنارے پر اتر رہیں۔

اتنے میں ترکوں نے قلعے کے برج سے کہا:

فوج آگئی۔ فوج آگئی۔

آزاد نے کہا: لو کمک کی فوج آگئی۔ برج والے دور بین سے دیکھ رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ہماری ہی فوج ہے۔ ورنہ اب تک ہلچل مچ گئی ہوتی۔

ایک سوار نے اشارے سے برج والوں سے دریافت کیا کہ کیا ہماری کمک کی فوج آگئی۔

اس نے اشارے سے کہا ہاں۔

اور پھر پندرہ بیس آدمیوں نے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ ادھر کشتی پر سے لوگوں نے مارے خوشی کے غل مچایا۔

میاں آزاد نے حکم دیا کہ:

کشتی کنارے سے لگاؤ۔

مانجھی نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ آزاد نے ایک سوار کو بھجوایا کہ خبر لاؤ۔ سوار نے قلعے کے اندر جا کر دیکھا، چوبیس سوار آئے ہیں۔ کل حال پوچھا اور کشتی کی طرف واپس چلا۔ آزاد سے یوں حال بیان کیا۔

سوار: حضور کمک کی فوج یہاں سے ایک میل پر آگئی ہے۔ آج تھکی ہوئی ہے، کل تک یہاں پہنچ جائے گی۔ گرداوری کے سوار اطلاع کے لئے آئے

ہیں۔افسر کمانیر نے اسی وقت اس دستے کو بھی اطلاع دی جو قلعے سے باہر ہے۔

آزاد: کتنے آدمی ہیں۔ ہیں کوئی پانچ چھ ہزار۔

سوار: یہ تو نہیں پوچھا، دریافت کر آؤں لپک کر۔

آزاد: نہیں کچھ ضرورت نہیں (مانجھی سے) چلو جنگل کے رخ۔

مانجھی: بہت خوب۔اس وقت جنگل ہی کے چلنے کی بہار ہے۔دریا گھوم گھام کر چکر کھاتا ہوا گیا ہے۔اور بعض بعض مقاموں پر اونچے نیچے درختوں کے سائے سے دریا بالکل تاریک ہے۔

آزاد: بس ایسے مقام سے ہم بہت خوش ہوتے ہیں۔

مانجھی: حضور ضرور چلیے، اور روز چلا کیجیے، بس کوئی چار گھڑی دن رہے چلا کیجیے، بڑی سیر ہوتی ہے۔بس ادھر ادھر شکار کیا کیجیے۔اور بھون بھون کے گوشت کھایے۔آج کل شکار کی بہار ہے۔

آزاد: یہ ندی کس دریا سے ملی ہے۔

مانجھی: دریائے ڈینیوب سے ملی ہے۔یہاں سے دو کوس کے بعد اس کا پاٹ اور بھی چوڑا ہے۔

آزاد: یہاں پر تو بالکل ذرا سا پاٹ ہے۔

مانجھی: دیکھیے، سامنے ہی کے جنگل میں شکار کے لیے وزیر اور سلطان آگے جایا کرتے تھے۔

اب اس مقام پر پہنچے جہاں بڑے اونچے اونچے درخت دریا کے دورویہ اس قدر گھنے تھے کہ دریا کا پانی ان کے سائے کے سبب سے بالکل سیاہ نظر آتا تھا۔اور

جا بجا کنارے کے نشیب وفراز دریا کا چکر کھا کر بہنا اور درختوں پر خوشنوا پرندوں کا جھرمٹ عجب لطف دکھاتا ہے۔میاں آزاد نے ایک ہوائی فیر کیا تو آواز تمام جنگل میں گونجنے لگی۔ریاض پاشا اور محمد پاشا جو شکار کھیلنے گئے تھے بندوق کی آواز سن کر بڑے حیران ہوئے۔ان کی بندوق کی آواز یہ لوگ سنتے تھے۔مگر ان کو یہ معلوم تھا کہ وہ شکار کھیلنے گئے ہیں۔

ریاض: یہ بندوق کیسی دغی اور آواز دریا کے رخ آئی ہے۔

محمد: ہاں بے شک آئی تو اسی طرف سے ہے۔شاید کسی گاؤں والے نے چلائی ہو۔

ریاض: دو تین آدمی ساتھ جا کر دیکھیں۔

محمد: اجی کوئی ہمارا ہی لشکر ہو گا۔

ریاض: تو اس طرف سے آواز کیوں کر آئی ؟۔

اتنے میں میاں آزاد نے پھر گولی چلائی۔اب ریاض پاشا گھبرائے۔جتنے آدمی ان کے ساتھ تھے سب سے کہا کہ بندوقیں بھر لو اور دو سواروں کو حکم دیا کہ جس طرف سے گولی آئی ہے ادھر جا کر دیکھو کون ہے۔

سوار: اگر وہ ہم پر گولی چلائے تو ہم جواب دیں یا نہ دیں۔

ریاض: بیشک جواب دو، لیکن ہم کو بھی خبر ہونی چاہیئے۔

سوار: ایک آدمی دوڑا دیں گے۔یہ کہہ کر سوار اس طرف چلا گیا۔

میاں آزاد نے اپنے ساتھیوں سے کہا جب سے ہم نے گولی چلائی۔ادھر سے ایک گولی کی آواز بھی نہ آئی۔معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ خائف ہو گئے۔شاید

سمجھے ہوں کہ دشمن یہاں چھپا ہوا تھا ورنہ کیا وجہ کہ بندوق کی آواز نہ آتی۔

اتنے میں تین ترکی سواروں نے کشتی دیکھی۔

ایک سوار: یہ تو ہمارے ہی لشکر کے ہیں۔

دوسرا سوار: ہاں ہاں وہ آزاد پاشا بیٹھے ہیں۔

تیسرا سوار: بندوق بھی ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔

ادھر میاں آزاد اور ان کے ساتھیوں نے ان سواروں کو دیکھا۔ جب کشتی کے قریب آئے تو ایک سوار نے کہا کہ ادھر آپ نے گولیاں چلائیں اور ادھر ہم لوگ حیران ہوئے کہ یا الٰہی یہ کون ہے۔

غرض آزاد پاشا اور ریاض پاشا کشتی میں سوار ہوئے اور قلعے میں داخل ہو کر کمک کی فوج سے حالات دریافت کرنے لگے۔

رات کے کوئی دو بجے کے وقت گرداوری کے سواروں نے آن کر افسر کمانیر کو اطلاع دی کہ جو دستہ باہر بھیجا گیا تھا۔ اس سے روس کے ایک دستے کی لڑائی چھڑ گئی ہے۔ اور ہماری فوج کو مدد کی بڑی ضرورت ہے۔

افسر کمانیر نے اسی وقت حکم دیا کہ فوج فوراً تیار ہو۔

حکم پاتے ہی سواروں، افسروں اور پیادوں نے تیاری کی۔ ادھر بگل بجا ادھر فوج جھٹ پٹ تیار ہو گئی اور قاعدے کے مطابق پرے جمائے ہوئے قلعے سے چلی۔ افسر کمانیر بھی ساتھ ہوئے۔

آزاد پاشا بھی اس فوج کے ساتھ تھے۔ راستے میں انہیں خیال تھا تو اس قدر کہ ان کا خط حسن آرا بیگم کے پاس پہنچ جائے۔ مدت سے کوئی خط نہیں بھیجا

ہے۔وہ بے چاری خدا جانے کیا کہتی ہوں گی۔دل میں طرح طرح کے بد خیالات راہ پاتے ہوں گے۔کبھی کہتی ہوں گی کہ آزاد دیکھو بھول گئے ہوں گے کبھی سوچتی ہوں گی کہ شاید لڑائی میں قتل کیے گئے ہوں۔کبھی خیال کرتی ہوں گی کہ شاید فوج میں کوئی عہدہ نہ ملا ہو۔یا خدا میرا خط جلد پہنچا دے۔ایسا نہ ہو کہ راستے میں ڈاک لٹ جائے یا کوئی اور حادثہ ہو کہ خط وہاں تک نہ پہنچے۔

پانچ میل پر کمک کی فوج اس دستے سے ملی۔معلوم ہوا کہ روسیوں کا مورچہ سامنے ہے۔روسیوں نے چار گولے چلائے۔ترکوں نے بھی جواب دیا،مگر پھر گولہ اندازی ختم ہوگئی۔فوج ایک گاؤں کے قریب ٹھہری تھی۔

میاں آزاد نے دیکھا کہ ایک ہندی اس گاؤں کے ایک درکت کے سائے میں بیٹھا ہوا حقہ پی رہا ہے۔قریب جا کر غور سے دیکھا۔

پھر پوچھا:

کیا آپ ہندوستان میں رہتے ہیں؟۔

اس شخص نے مسکرا کر کہا:

جی ہاں۔

آزاد: کس شہر میں دولت خانہ ہے خان صاحب

خان: آپ خوب پہچان گئے کہ خان صاحب ہیں، میں رام پور میں رہتا ہوں۔

آزاد: یہاں کس سلسلے میں آنا ہوا۔

خان: ایک صاحب کو پڑھاتا ہوں۔انھیں کے ساتھ چلا آیا۔

آزاد: تو آپ میدان جنگ میں کیوں کر آئے؟۔

خان: وہ ایک اخبار کے نامہ نگار ہیں۔

آزاد: ہندوستان کی کوئی خبر کہیئے۔

خان: ہندوستان میں آج کل گھر گھر وہی ذکر ہے کہ ایک صاحب میاں آزاد ترکی گئے ہیں، اور وہاں جنگ میں شریک ہوئے ہیں۔ جب واپس آئیں گے تو ایک نوجوان بیگم سے ان کی شادی ہوگی۔

آزاد: وہ بیگم کون ہیں؟۔

خان: حسن آرا نام ہے ان کا۔

آزاد: ہم نے آزاد کا ذکر یہاں نہیں سنا۔

خان: ہم نے سنا ہے کہ کسی شخص نے ان بیگم سے جا کر جڑ دی کہ میاں آزاد نے ترکی میں ایک سائیس کو قتل کر کے سائیسن سے شادی کر لی تو بیگم صاحبہ کی حالت بڑی خراب ہوگئی، اور دل کو ایسا سخت صدمہ پہنچا کہ نبض رک گئی۔ آدھ گھنٹے تک تو لوگوں کو یقین سا ہو گیا کہ خدانخواستہ چل بسیں۔ عزیزوں نے زار زار رونا شروع کیا۔ شہر بھر میں خبر مشہور ہوگئی کہ حسن آرا بیگم فوت ہوگئیں۔

یہ حال سن کر میاں آزاد کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔

خان صاحب نے کہا:

''آپ کی آنکھوں سے کیوں آنسو نکلے''

آزاد نے بات ٹالنے کے لئے کہا۔

''یوں ہی غم کی بات سن کر مجھے رونا آتا ہے۔''

خان: لوگ تو انہیں دفنانے کی بھی فکر میں تھے۔

آزاد (رو کر افسوس)

خان: ان کے بہنوئی ایک نواب صاحب ہیں۔وہ فوراً ڈاکٹر صاحب کو بلا لائے ۔ڈاکٹر صاحب نے کہا ابھی جان باقی ہے۔فوراً دوائی پلائی گئی چند منٹ کے بعد بیگم صاحبہ نے آنکھیں کھول دیں،تو خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔

آزاد: شکر ہے شکر ہے۔

خان: سنا ہے کوئی ان کے عزیزوں میں سے ہے۔وہ چاہتے ہیں کہ انہیں کے ساتھ شادی ہو اور حسن آرا کہتی ہیں کہ شادی ہوگی تو آزاد کے ساتھ ورنہ عمر بھر کنواری ہی رہوں گی۔حشر تک شادی نہ کروں گی۔

آزاد: آفرین۔

خان: تو اس عزیز نے ایک اخبار میں یہ جھوٹی خبر چھپوادی کہ آزاد نے سائیس کی بیوی کو گھر میں ڈال لیا ہے۔بس حسن آرا ضبط نہ کرسکیں۔

آزاد: اس شخص کا نام بھی معلوم ہے آپ کو۔

خان: جی نہیں نام تو نہیں سنا۔

آزاد: کیسے کیسے بے ایمان دنیا میں ہیں۔

خان: مگر وہ آزاد ہی کا دم بھرتی ہیں۔اتنے میں ایک ترکی سوار آن پہنچا اور بولا ،آزاد پاشا،آزاد پاشا جلد چلیے۔

آزاد گھبرا کر کیوں خیر تو ہے۔

سوار: کوچ جلد تیاری کیجیے،بس اب دیر نہ لگائیے۔وہاں سب تیار ہوگئے ہیں

بس ایک آپ ہی کی دیر ہے۔

آزاد: کیا تیاری کیسی۔ کیا فوج کہیں جائے گی؟۔

سوار: ہاں ہاں جلد آیئے۔ میں چلتا ہوں ابھی آیئے۔ آزاد لشکر میں پہنچے تو وہاں سبھی تیار تھے۔ آزاد بھی رسالے کے ساتھ چلے۔

ایک پاشا نے کہا:

یہاں سے چار کوس پر دشمن نے مورچے باندھ لیے ہیں اور پہاڑوں پر کئی رسالے ہیں۔ دو جانب سے گولے برسیں گے مقابلہ برابر نہیں ہے۔

ڈھائی کوس کے فاصلے پر گرداوری کے سواروں نے رسالے کو روک دیا اور بیان کیا کہ روسیوں کا ایک بہت بڑا لشکر جس میں نصف سے زیادہ کاسک ہیں۔ ایک پہاڑی پر جوق در جوق جمع ہیں۔ کئی بھاری توپیں بھی ساتھ ہیں۔ رسد ابھی کافی طور پر نہیں آئی ہے۔ رسد کا انتظار کر کے کل یا پرسوں تک آگے بڑھیں گے۔ اس مقام پر افسروں میں باہم مشورہ ہوا۔

علیقو پاشا: ہمارے نزدیک آگے بڑھنا جہالت ہے۔ اول تو وہ بلندی پر ہیں اور ہم نشیب میں۔ دوسرے ان کی جماعت کہیں زیادہ ہے۔

آزاد: قلعے سے اور کمک آنی چاہیے، ورنہ ضرور شکست پائیں گے۔

سب کی رائے یہ قرار پائی کہ ترکی فوج دشمن کے مورچوں سے ایک کوس کے فاصلے پر قیام کرے۔ چنانچہ اس رائے پر عمل کیا گیا اور دس سواروں کو حکم دیا گیا کہ فوراً کمانیر کے پاس قلعے میں جائیں۔ رسالے کے افسر اعلیٰ نے ان کے نام ایک خط لکھا جس کا منشا یہ تھا۔

ہمارا لشکر ایسے مقام پر ہے، جہاں سے روسی فوج ایک میل ہے۔ مگر اب زیادہ بڑھنے کا موقع نہیں رہا۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ دشمن نے ایسے عمدل مقام پر مورچہ باندھا ہے کہ اگر ہماری فوج دوگنی بھی ہو تو کامیاب نہ ہو سکے گی۔ اس کی جماعت ہماری جماعت سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لئے مزید فوج بھیجیے۔

سوار خط لے کر روانہ ہوا۔

اب سنیئے کہ روسیوں کو جب ترکی فوج کے آنے کی خبر ہوئی تو انھوں نے دوربینوں سے دیکھنا شروع کیا۔

جنرل نے حکم دیا کہ:

آدھ گھنٹے کے بعد گولہ چلانا شروع کر دو۔

اس آدھ گھنٹے میں ترکی لشکر مزید ایک میل پیچھے ہٹ گیا تھا۔ گولہ اندازی روسیوں نے شروع کر دی، مگر گولہ دو میل تک آتے آتے ٹھنڈا ہو جاتا۔ اس کی تیزی اور حدت باقی نہ رہتی۔

روسیوں نے دیکھا کہ گولے بے کار اور ضائع ہو رہے ہیں، اور ترکوں کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔ حکم دیا گولہ اندازی بند کر دو۔ اس گولہ اندازی سے ترکوں کا ذرا بھی نقصان نہیں ہوا۔

آدھ گھنٹے کے بعد ترکوں کی فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ روسیوں کا ایک رسالہ ایک طرف سے اور دوسرا دوسری طرف سے آن پہنچا اور دونوں جانب سے باڑھ چلنے لگی۔

آزاد: ارے بڑا دھوکا ہوا۔

سوار: گرد آوری کے رسالے نے ذرا بھی اطلاع نہ دی۔

مختار پاشا: بھاگنا ہماری وضع کے خلاف ہے۔ لڑیں گے اور جان دیں گے۔

اتنے میں گرد آوری کے سواروں میں سے ایک سوار گھوڑے کو بگٹٹ دوڑاتا ہوا آیا اور آتے ہی غل مچایا کہ: بھاگو اب یہاں پر ٹھہرنا فضول ہے۔ ہمارے ساتھ کے سب سوار مار ڈالے گئے۔

مختار پاشا: پھر اب کیا کیا جائے۔ بھاگنے کا تو نام نہ لو۔

سوار: اب بغیر بھاگے بنتی بھی نہیں ہے۔ بھاگیں نہ تو کریں کیا؟۔

آزاد نے کہا:

مشورے کو مختصر کیجیے، وہ دیکھیے دو آدمی لیٹ بھی گئے۔

افسر اعلیٰ نے حکم دیا:

گولے کا جواب دو۔

ادھر سے بھی گولہ چلنے لگا اور دھائیں دھائیں کی آواز گونجنے لگی۔ ایک گھنٹے تک دونوں فریقوں میں گولہ بازی ہوتی رہی۔ اس کے بعد ترکوں کے پاس بارود بہت کم رہ گیا۔

آزاد: بارود اب نہیں ہے۔ پندرہ بیس منٹ سے زیادہ اب نہیں ٹھہر سکتے۔

علیقو: ایک آدمی روسیوں کے لشکر میں بھیجا جائے۔

احمد پاشا: ہائے افسوس دھوکے میں مارے گئے۔

مختار پاشا: اچھا دھاوا کر دو۔ سمجھا جائے گا۔

اب سنیئے کہ شام ہو گئی۔ عین شام کے وقت حملہ کیا گیا۔ مگر روسیوں نے اس

قدر گولے برسائے کہ فوج آگے نہ بڑھ سکی۔ترکی سپاہی بڑی جرات کے ساتھ ننگی تلواریں ہاتھوں میں لیے گھسے چلے جاتے تھے۔مگر افسروں کی غلطی کے سبب آگے بڑھے اور بھون ڈالے گئے۔

جب آزاد پاشا نے یہ کیفیت دیکھی تو افسروں سے کہا:

اب کچھ ہی دیر میں ہم اور آپ یا تو روسی گولوں کا شکار ہو جائیں گے یا گرفتار ہو جائیں گے۔اب دل کی حسرت دل ہی میں رہی جاتی ہے۔

رات ہوگئی تھی اور رات بھی اتنی تاریک کہ تو بہ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آزاد روسی فوج میں گھسنے ہی کو تھے کہ ایک روسی رسالے نے پیچھے سے آن کر توپیں لگا دیں اور گولے چلنے لگے۔اس موقعے پر ادھر کی فوج بھاگی اور اس وقت مصلحت اسی میں تھی کہ میدان جنگ سے بھاگ جایئے۔

کچھ سوار اور سپاہی زخمی ہوئے اور کچھ مارے گئے، کچھ بھاگ نکلے۔آزاد بھی ان ہی میں شامل تھا۔انھوں نے جو اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑایا تو ایک میدان کی طرف نکل گئے۔رات کا وقت اور رات بھی سخت اندھیری۔روشنی کہیں نام کو نہیں مقام معلوم نہیں یا الٰہی جائیں تو کدھر جائیں۔اور خوف یہ کہ کہیں روسی نہ مار ڈالیں۔اس وقت آزاد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔دل میں سوچنے لگے کہ حسن آرا سے جو اقرار کیا تھا، وہ آج خاک میں ملا جاتا ہے۔ہم تو قتل ہوں گے مگر حسن آرا بیگم بھی بے چاری تڑپ تڑپ کر زندگی بسر کرے گی۔اور ہماری حالت سے کوئی اس کو اطلاع نہ دے گا۔بڑی بے قراری میں چلے جاتے تھے کہ ایک مزدور ان کو ملا۔اس نے ترکی زبان میں ان سے یوں گفتگو کی:

مزدور: حضور یہاں سے پڑاؤ کتنی دور ہے؟۔

آزاد: ہم کیا جانیں پڑاؤ کہاں ہے، ہم میدان جنگ سے آتے ہیں۔

مزدور: آپ بھی ترک ہیں۔ لہجے سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

آزاد: تم کون ہو اور اس وقت کہاں جاتے ہو؟۔

مزدور: ہم مزدور ہیں اور گٹھری اٹھائے لیے جاتے ہیں۔

آزاد پاشا اس مزدور سے باتیں کر رہے تھے کہ دفعتاً ایک گولی چلی اور گھوڑے کے کان کے پاس سے سن کر کے نکل گئی۔ آزاد نے جو دفعتہً فیر کی آواز سنی تو پہلے تو کسی قدر چونکے، پھر اچانک اس مزدور کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گھوڑے سے اترے۔ دیکھا تو تمنچہ پاس۔ دو تھپڑ لگائے اور تمنچہ چھین لیا۔

پوچھا: سچ بتا تو کون ہے؟۔

کہا: میں روسی جاسوس ہوں۔

آزاد نے اس کو چھوڑ دیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر میدان کی راہ لی۔

ہندوستان کو واپسی

ترکی اور روس کی جنگ میں اپنی بہادری اور شجاعت کے جھنڈے گاڑھنے کے بعد میاں آزاد واپس اپنے وطن ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے۔ان کے ہمراہ دو خوبصورت لڑکیاں مس میڈا اور مس کلیرسا بھی تھیں۔بصرہ الظفر نامی جہاز پر سوار ہوئے۔صاف ظاہر ہے کہ مسخروں کے بادشاہ خواجہ بدیع الزمان بھی ان کے ہمراہ تھے۔اور بے حد خوش۔اب جہاز روانہ ہوا تو میاں خوجی کو گپ ہانکنے کی سوجھی۔

بولے:

ایک دن کا ذکر ہے کہ ہم ہولی کے دن بازار میں نکلے اور شہر تھا ہندوؤں کا۔لوگوں نے منع کیا کہ آج نہ نکلیے گا۔ورنہ رنگ پڑ جائے گا۔ہم اس زمانے میں بڑے شہ زور تھے۔ہاتھی کی دم پکڑ لی تو ہل نہ سکا۔اور ہاتھی بھی چھوٹا موٹا نہیں دیو کا دیو۔چاہا کہ بھاگ جائے۔لیکن کیا مجال۔جس نے دیکھا عش عش کر اٹھا۔اس کے بعد ہم بازار میں آئے دیکھا تو بلڑ مچا ہوا ہے۔ایک جگہ دیکھا کہ سو کے قریب آدمی جمع تھے،اور رنگ اچھل رہا تھا۔میرے سبھی ہتھیار موجود تھے،

آزاد:مگر افسوس قرولی نہ تھی۔

خوجی:نہ بھی بات نہ کاٹو۔میں نے کہا یارو دیکھ بھال کے،مردوں پر رنگ ڈالنا دل لگی نہیں ہے۔وہ لوگ پہلے تو گڑبڑا گئے اور میں آگے بڑھا۔اتنے میں ایک پٹھان نے ہم سے کہا:

”میاں پہلوان،تم سپاہی آدمی ہو اور گرانڈیل جوان“اگر آپ کو غصہ آ گیا تو

غضب ہو جائے گا۔

مگر ہم نے ایک نہ مانی اور ان کی طرف بڑھے۔ اتنے میں حضرت دولڑکوں نے پچکاری تانی اور رنگ ڈال دیا۔ اور اسی پٹھان نے تان کر پیچھے سے ایک جوتا مارا۔ ہماری کھوپڑی پلپلی ہوگئی۔ مڑ کے جو دیکھتا ہوں تو ڈبل جوتا ڈھائی تلے کا۔ میں مسکرا کے آگے بڑھا۔

آزاد: واہ جوتا کھا کے آگے بڑھے اور پھر مسکرائے بھی۔

خوجی: میاں میں تو سپاہی ہوں۔۔ تلوار سے بات کرتا ہوں، جوتے سے کام نہیں لیتا۔ اس لئے چپکا ہو رہا۔

آزاد: واہ واہ سبحان اللہ۔۔ آپ کی بہادری کے کیا کہنے۔

شہر سکندریہ میں آزاد چند روز کے لئے رک گئے۔ اور اسی ہوٹل میں قیام کیا جہاں جاتی دفعہ ٹھہرے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اسی ہوٹل میں ہمارے خوجی صاحب کی ایک کشتی ہوئی تھی۔ ہوٹک کے ہونے کے ساتھ، اور حسبِ معمول یہاں بھی خوجی صاحب نے مار کھائی تھی۔ اب جو میاں آزاد کے ساتھ پھر سے اسی ہوٹل میں وارد ہوئے تو بہت خوش ہوئے۔

خوجی صاحب نے اکڑ کر آزاد سے کہا:

خوجی : اب یہاں ہمارے ٹھاٹھ دیکھیے۔ پہلے تو لوگوں سے دریافت کرلو کہ ہم نے کشتی لڑی تھی یا نہیں۔ چاروں شانے چت۔ اٹھا اٹھا کے دے مارا۔

اٹھایا اور دے پٹکا۔۔۔ اور جانتے ہو کس کو؟ یہاں کے اس پہلوان کو جس کا نام لے کر مصر کے پہلوانوں کے استاد کان پکڑتے تھے، اس کو دیکھو تو آنکھیں کھل

جائیں، کسی کا بدن چور ہوتا ہے۔ اس کا قد چور ہے۔ پہلے تو مجھے دھکیلتا ہوا اکھاڑے سے باہر لے گیا۔ اور میں بھی چپ چاپ چلا گیا، بس بھائی پھر تو میں نے قدم جما کے جو اسے دھکیلا، بول گیا۔ وہ استاد اور میں جگت استاد۔ اس نے پیچ کیا میں نے توڑ کیا۔ اس نے داؤ لگایا، میں نے اچک کر کاٹ کھایا۔

کاٹ کھانے پر میاں آزاد نے زور کا قہقہہ لگایا۔

خوجی: بس جناب دو گھنٹے کی برابر لڑائی رہی۔ اس میں قوت اور یہاں استادی کرتب۔ میں نے اسے ہنپا ہنپا کے مارا۔ جب اس کا دم ٹوٹ گیا تو چرمر کر ڈالا۔ ہات ترے گیدی کی۔ چاروں شانے چت، اور کوئی پچاس ہزار آدمی دیکھ رہے تھے۔ شہر بھر میں مشہور تھا کہ ہندوستان کا پہلوان آیا ہے۔

آزاد: اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنو۔ جب جانیں کہ ہمارے سامنے پٹخنی دو۔ اس کے علاوہ ذرا ہم اس پہلوان کو بھی دیکھ لیں کہ کیسا ہے۔ تمھاری اس کی جوڑ ہے یا نہیں۔ فرض کرو تم سے کم ہوا یا تھوڑا فرق ہوا۔ تو پھر اٹھا کر دے مارنا کون سی بڑی بات ہے۔

اتنے میں ہوٹل کے چند آدمی آ کھڑے ہوئے اور خوجی کو شرارت سے دیکھنے لگے۔

خوجی: کیوں میاں! ہم نے یہاں ایک کشتی لڑی تھی نا؟۔

مصری آدمی: واہ ۔۔۔ ہمارے ہوٹل کے بونے نے البتہ اٹھا کر پٹک دیا تھا۔

خوجی: او گیدی جھوٹ بولنا اور سور کھانا برابر ہے۔

مصری آدمی: ہاتھ پاؤں توڑ کے رکھ دوں گا۔۔۔ تم اور کشتی ۔۔

خوجی: جی ہاں جی ہاں ہم اور کشتی ۔۔۔اب پھر سہی ۔بسم اللہ ۔خم ٹھونک کر) بلوا دو پھر اس پہلوان کو۔ اتنے میں وہی بونا جس سے خوجی کی کشتی ہوئی تھی اتفاق سے وہاں آ گیا۔خوجی کو دیکھ کر وہ منہ چڑانے لگا۔ خواجہ صاحب بگڑ کر کھڑے ہو گئے۔

آزاد کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ:

یہی وہ پہلوان ہے، جس سے ہم نے کشتی لڑی تھی۔

آزاد بہت ہنسے کہ بونے سے کشتی لڑی تھی تو کیا؟ کسی برابر والے سے لڑتے تو جانتے۔

جی ہاں کرنے اور کہنے میں فرق ہے۔ جناب اگر آپ اس سے ہاتھ ملائیں تو ظاہر ہو جائے کہ لوہے کے ہاتھ ہیں، اور میرے ہاتھ پاؤں فولاد کے ہیں۔آپ کی نرم نرم انگلیاں اور نازک کلائیاں دکھنے لگیں گی۔

اتنے میں بونا بھی خم ٹھونک کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ جیسے وہ بھی دوبارہ کشتی لڑنے پر تیار تھا۔خواجہ صاحب پینترا بدل کر آگے بڑھے۔آزاد پاشا اور ہوٹل کے دوسرے لوگ ان کے گرد کھڑے ہو گئے۔

خوجی: آؤ بچہ چڑا گلخیرو، آج بھی ماروں گا۔

بونا: (سمجھا کچھ نہیں) آج تمہاری کھوپڑی ہو گی اور میرا جوتا۔ایسا ماروں گا کہ عمر بھر یاد رکھے گا۔

اب سنیے۔ادھر خواجہ صاحب، ادھر بونا پہلوان، دونوں کندھے تول تول کر رہ جاتے۔خواجہ صاحب نے گھونسا تانا۔ بونے نے منہ چڑا دیا۔ یہ آگے جھپٹے۔اس

نے تھپڑ مارنے کا ارادہ کیا۔خوجی نے جھلا کے چپت جمائی۔اس نے دھول لگائی۔اورلطف یہ کہ دونوں کے سر گنجے۔اس زور کی آواز آتی تھی کہ سننے اور دیکھنے والوں کی جی خوش ہو جاتا تھا۔

آزاد:ارے یارو، ذرا زور سے چپت بازی ہو۔

خوجی:جی ہاں۔۔۔جس کی کھوپڑی پر گزرتی ہے،اسی کا دل جانتا ہے۔

آزاد:مگر یار اس کا قد تو بہت ہی چھوٹا ہے۔

خوجی: ہائے افسوس بھئی تم ابھی بالکل ناتجربہ کار ہو۔واللہ جو ذرا بھی تجربہ ہو۔بس اور کیا کہوں ارے کم بخت اس کا قد چور ہے۔جس طرح میرا بدن چار ہے۔

ایک: خوب آپ کا بدن تو ضرور چور ہے۔

خوجی:جناب یوں دیکھنے میں تو کچھ نہیں لگتا۔لیکن اکھاڑے میں اگر لنگوٹ باندھ کر میں کھڑا ہو جاؤں تو پھر دیکھیے بدن کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔بالکل گینڈے کی طرح۔کوئی کہتا ہے۔دم کٹا بھینسا ہے۔کوئی کہتا ہے ہاتھی کا بچہ ہے۔اور میں کوئی پرواہ نہیں کرتا۔کوئی دو جوتے بھی مارے تو پرواہ نہیں کرتا۔اور کچھ نہیں کہتا۔اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ کوئی بولا اور میں نے اٹھا کر پٹخ دیا۔ذرا غصہ آیا تو انجر پنجر الگ کر دیا۔بھئی ہماری طاقت کا کیا کہنا ہے۔

خواجہ صاحب نے جھلا جھلا کے اس بونے کے چپتیں لگائیں۔ایک بار اتفاق سے اس کے ہاتھ میں خوجی کی گردن آگئی۔اس نے زور سے ان کی گردن پکڑی کہ خواجہ صاحب سے چھڑائے نہ چھوٹی۔بہت ہاتھ پاؤں مارے۔بہت زور

لگایا۔مگراس نے دونوں ہاتھوں سے گردن پکڑ رکھی تھی ۔خواجہ صاحب ذرا جھکے۔ ان کا جھکنا تھا کہ اس نے زور کا ایک مکا مارا۔اور خواجہ صاحب منہ کے بل زمین پر۔اوپر سے دو تین لپڑ مار کر بونا بھاگا تو خواجہ صاحب اس کے پیچھے۔اس نے جا کر زور سے دروازہ بند کرلیا۔خوجی نے دروازے سے ٹکرا کر پھر پٹخنی کھائی۔تو دیکھنے والوں نے قہقہہ لگایا۔۔۔بس پھر ان کے غصے کی نہ پوچھیے۔آسمان سر پر اٹھالیا۔

اوگیدی ،بودے بزدل۔۔۔گیدی اگر شریف زادہ ہے تو آجا مقابلے پر۔۔۔گیدی میں ذرا زمین پر گرا تو بھاگ کھڑا ہوا۔

آزاد: (جھوٹ موٹ) ارے میاں آخر ہوا کیا میں تو ادھر دیکھ نہیں رہا تھا۔کشتی کا فیصلہ کیا ہوا آخر؟۔معلوم نہیں ہوا کہ کس نے دے مارا۔

خوجی: اکڑ کر ایسی بات آپ کیوں دیکھیں گے۔انجر پنجر ڈھیلے کر دیے اس گیدی کے۔مگر اس کا قد چور ہے دیکھنے میں بونا ہے۔مگر باون گز سے کم قد نہیں ہے اس کا،واللہ کشتی دیکھنے کے قابل تھی۔میں نے ایک نیا داؤ مارا تھا۔آج بھی چاروں شانے چت گرا۔اور اس کے گرنے کے وقت ایسی آواز آئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑ پھٹ پڑا۔آپ نے سنا ہی ہوگا۔

آزاد: وہ ہے کہاں۔کیا زمین کھود کے دفنا دیا آپ نے؟۔

خوجی: نہیں کسی کو تکلیف دینے سے گھبراتا ہوں،اور قسم ہے واللہ پورا زور نہیں لگایا۔ورنہ کیا میرے مقابلے میں ٹھہرتا۔توبہ توبہ۔ہاتھ پاؤں توڑ کے چر مر کر دیتا۔خون خشک ہوگیا اس کا۔بس روتا ہوا بھاگ گیا۔

آزاد: مگر خواجہ صاحب گرا تو وہ اور آپ کی پشت پر یہ اتنی گرد کیوں لگی ہے۔
اس کا کیا سبب ہے؟۔

خوجی: سچ کہوں اس مرتبہ میں اپنے زعم میں آپ ہارا اور پھر پورا زور بھی نہیں
لگایا تھا میں نے، ورنہ لاش پھڑکتی نظر آتی۔



خوجی کی شادی

قسطنطنیہ سے روانہ ہوتے وقت میاں آزاد نے احتیاطاً اپنی ہونے والی بیوی حسن آرا بیگم کے نام تار دے دیا۔ جس کے کہنے پر آزاد نے ترکی جانے کا قصد کیا تھا۔

حسن آرا کے ہاں آزاد کا تار آیا۔ انھوں نے آزاد کی آمد کی خبر پڑھی، تو بڑی خوش ہوئیں کہ ان کے منگیتر فاتح کی حیثیت سے اپنی بہادری کے جھنڈے ترکی اور روس میں گاڑ کر واپس آ رہے ہیں۔

حسن آرا نے روح افزا کے کان میں کہا:

"بہن روم سے تار آیا ہے اور اس میں لکھا ہے کہ آزاد قسطنطنیہ سے روانہ ہو چکے ہیں اور ہندوستان آنے والے ہیں۔

روح افزا نے ان کو گلے لگا کر مبارک باد دی۔

اب ادھر سنیے خواجہ بدیع الزمان کا حال۔ اسکندریہ میں آزاد کو کوئی روز تک رہنا پڑ گیا۔ وجہ یہ کہ ہیضے کے سبب جہازوں کی آمد و رفت بند ہو گئی۔

ایک روز سب بیٹھے تھے کہ مس میڈا نے کہا:

خواجہ بدیع، اپنے ملک کے کچھ حالات تو ہم سے بیان کرو۔ کہ وہاں کے روساء کیسے ہیں۔۔۔ امراء کا کیا حال ہے۔

خوجی: روساء تباہ۔ امراء خراب، پریشان حال، ان پڑھ۔۔ وہاں کے شوق دنیا سے نرالے ہیں۔ پتنگ بازی کا شوق۔ طرح طرح کے پتنگ

بنے، گول، دو پتا، ماہی جال، مانگ دار، بھیڑیا۔ طوقیہ، خربوزیہ، لنگوٹیہ، چپ، تکل، کنکیا، سفید، للپتا، کلپتا۔ شرطیں لگا کر پتنگیں اڑانے کے مقابلے ہوتے ہیں۔

آزاد: کیوں صاحب کیا یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔

خوجی: جی ہاں تم کیا جانو۔ تم تو کتاب کے کیڑے ہو۔ تم کو ان باتوں سے کیا واسطہ؟۔ سچ کہنا کبھی پتنگ اڑایا بھی ہے۔

آزاد: ہم نے تو پتنگوں کی اتنی قسمیں ہی نہیں سنی تھیں۔

خوجی: تم تو جانگلو ہو۔

میڈا: اور وہاں کے دولت مند کیا کام کرتے ہیں، کوئی اچھا کام بھی کرتے ہیں یا نہیں۔

خوجی: ہاں افیم اور چانڈو کثرت سے پیتے ہیں۔

آزاد: خواجہ صاحب سوچتا ہوں کہ آپ کی شادی اب اسکندریہ میں کر دی جائے۔ واپس ہندوستان گئے تو لوگ کیا سوچیں گے کہ خواجہ صاحب کو کسی نے پوچھا ہی نہیں۔

خوجی: آہاہاہا۔ واللہ یہ تو تم نے ایک ہی سنائی۔ بے شک صحیح ہے۔ واقعی ہمیں شادی کر لینی چاہیئے۔

آزاد: خوجی یار۔۔۔۔

خوجی: خدا کی مار اس بدبخت پر جو ہماری شان میں ایسا لفظ بیان کرے۔ اس سے خدا ہی سمجھے، اور میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

میڈا: کیا ہوا خواجہ بدیع صاحب کیوں بگڑ گئے۔

خوجی: ہاں دیکھو تم بھلی مانس اور شریف زادی ہو نہ جو خواجہ بدیع صاحب کہا، اور یہ کم بخت تو خوجی کہتا ہے۔ پھر کلیرسا سے مخاطب ہوئے:

خوجی: ایک بات کہوں یا نہ کہوں مس کلیرسا!

کلیرسا: کہو کہو ہم بھی تو سنیں کس قسم کی بات ہے۔

خوجی: کچھ شادی بیاہ کا ذکر ہے۔

کلیرسا: کہیں شامت تو نہیں آئی ۔۔۔ اور سنیے ۔۔۔ یہ اور شادی۔

خوجی: کیوں کیا ہوا؟۔ آخر ہم میں کون سی بات نہیں ہے۔ کچھ معلوم ہو، اندھا ہوں۔ کانا ہوں۔ لولا ہوں، لنگڑا ہوں۔ بدقطع ہوں۔۔ وہ کون سی بات ہے جو ہم میں نہیں ہے۔

کلیرسا: یہ منہ اور مسور کی دال، چلے ہیں ہم سے شادی کرنے۔

آزاد: بوا زعفران کی سی عورت ہو تو ضرور شادی کرلو۔

خوجی: حضرت اگر مس کلیرسا نے منظوری نہیں دی، تو پھر ہم کوئی اور ڈھونڈ لیں گے۔ مگر یہ ان کی غلطی ہے۔ ممکن ہے سیدھے راستے پر آجائیں۔

آزاد پاشا، کلیرسا اور میڈا سیر کے لئے گئے۔ وہاں راہ میں اتفاق سے آزاد کو ان کے ایک جاننے والے مل گئے۔ آزاد نے گاڑی روک کر کہا تم یہاں کہاں؟۔

اس نے جواب دیا:

حضور حج کو گیا تھا۔ وہاں سے ایک قدردان اپنے ساتھ یہاں لے آیا۔

آزاد نے کہا!

خوجی بھی یہیں ہے تمہارا دوست۔

خوجی: کا نام سن کر وہ بہت ہنسا اور دیر تک آزاد سے سرگوشیاں کرتا رہا۔

بعد میں آزاد پاشا نے مس کلیرسا اور مس میڈا کو بتایا اور اس بات سے آگاہ کیا۔

جب خواجہ صاحب بھی واپس آگئے تو ان تینوں نے ان سے بیان کیا کہ ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ ان کی شادی طے کر دی گئی ہے۔ اور کل ہی شادی ہوگی۔

خوجی نے فوراً منظور کر لیا۔

دوسرے روز آزاد پاشا نے مس کلیرسا اور مس میڈا کو گاڑی میں بٹھایا اور کوچ بکس پر خواجہ صاحب تشریف فرما ہوئے، اور چلے شادی کرانے۔ راستے میں خواجہ صاحب شور مچاتے جا رہے تھے۔ ہٹ جاؤ۔۔۔ بچ جاؤ۔۔۔

اتفاق سے دس بارہ دنبے سامنے آئے۔ جب دنبے قریب آئے تو حضرت بدیعا نے دنبے والے کو تیکھی نظروں سے دیکھا گویا کھا ہی جائیں گے۔ اس کی ان سے آنکھیں چار ہوئیں تو خواجہ صاحب اکڑ گئے۔

دنبے والے کو ہنسی آ گئی۔

ان میں تاب کہاں کہ کوئی ہنسے اور یہ خاموش رہیں۔ آگ ہو گئے۔ پہلے گاڑی والے کو ڈانٹ بتائی!

روک لے، روک لے، ابے تو نہیں روکے گا۔

آزاد! خداوندا اب کیا مصیبت پڑی۔ حضور خیر تو ہے۔

خوجی: بس اس نامعقول سے کہو کہ باگ روک لے۔ میں اس گستاخ، بے

ادب کو سزا دے آؤں تو بات کروں گا۔ مجھے دیکھ کر ہنس دیا، کوئی مسخرہ سمجھ لیا ہے۔

آزاد: کون تھا، کون، خداوندا نام تو سنوں میں۔

خوجی: اب راہ چلتے کا میں نام کیا جانوں، مجھے دیکھا تو ہنسے آپ۔ خون آنکھوں میں اتر آیا۔

آزاد: بھائی جان دیکھ کر جی خوش ہوا ہو گا۔ کہ کیا خوب صورت جوان ہے

خوجی: ارے یار سچ کہا۔ لاحول ولا قوہ۔۔۔ بھئی سچ کہتے ہو۔

آزاد: اب بتاؤ گدھے ہو کہ نہیں جو میں نہ سمجھاتا تو پھر اور ہاں سنو، شادی والے گھر ذرا قرولی کو میان ہی میں رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ قرولی بات بات پر نکلے۔ کرتے ہو نا وعدہ کیوں خواجہ صاحب؟۔

اتنے میں گاڑی رکی، خوجی گھبرا کے کوچ بکس سے اترے تو پائے وان سے دامن اٹکا اور منہ کے بل گرے۔ مگر چوٹ کم آئی، جلدی سے جھاڑ پونچھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ آزاد اور ان کے ساتھ کلیرسا اور مسمیڈا کو بے اختیار ہنسی آئی۔ خوجی نے پہلے تو لبوں پر انگلی رکھ کر آہستہ سے کہا۔

چپ چپ''

مگر جب ان سب نے اور بھی زور زور سے ہنسنا شروع کر دیے تو خوجی سر پیٹنے لگے۔

آزاد: دیکھو پھر وہی وحشت۔۔۔ اور جو دلھن والے دیکھ لیں تو کیسی ہو۔۔ گرد پونچھو۔۔۔ ذرا آدمی بنو۔ لاحول ولا قوہ۔۔۔

خوجی: ارے یار گرد تو جھاڑ چکا، مگر یہ ہتھ کنڈے کس کے ہیں۔ بھئی واللہ یہ

اس بہروپیے کا کام ہے۔میرے دشمنوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کرٹانگ پکڑ کے گھسیٹ لیا۔اچھا شادی ہولے،پھر بیوی کی صلاح سے مردود کو نیچا دکھاؤں گا۔

آزاد اور دونوں لڑکیاں گاڑی سے اتر کر خوجی کے سسرال کے دروازے پر آئے۔مگر خوجی صاحب گاڑی کے اندر ہی بیٹھے رہے۔جب اندر سے ان کے بلانے کو آدمی بھیجا گیا تو انھوں نے انکار کر دیا۔آزاد نے اندر یہ یہ عبارت ایک پرچے پر لکھی اور اس آدمی سے کہا کہ یہ کاغذ جا کر انہیں دکھا دو۔

خوجی تم واقعی شریف نہیں ہو،اور پاجی پن تو تمہاری شکل سے ظاہر ہے۔تم پر خدا کی لعنت،اگر تم نہ آئے تو دلھن خود آ کر تم کو لے جائے گی''

آزاد

خوجی صاحب نے پرچہ پڑھا تو دو لفظوں پر آگ ہو گئے۔ایک خوجی دوسرا پاجی۔رقعہ پھاڑ ڈالا۔اور پھر اندر جانے سے انکار کر دیا۔آدمی پھر اپنا سا منہ لے کر واپس آ گیا۔آزاد نے اندر سے ایک بھدی اور موٹی تازی عورت بھیجی۔اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔گاڑی سے اتارا اور گود میں اٹھا کر اندر لے چلی۔خوجی سمجھے تھے کہ دلہن یہی ہے۔اکڑتے ہی تھے کہ اس نے گود میں اٹھا لیا،اور جھپ سے مکان کے اندر داخل ہو گئی۔ صحن میں خوجی کو بالوں سے پکڑ کر دھڑام سے دے مارا۔

آزاد کوٹھے پر سے یہ ماجرا دیکھ رہے تھے۔کلیرسا سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی اور مس میڈا کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔

خوجی نے با آواز بلند کہا:

اماں جان! معاف کرو، ایسی شادی پر خدا کی مار۔ خدا کے واسطے چھوڑ دے نیک بخت۔ بسم اللہ ہی غلط ہوگئی۔

اتنے میں آزاد نے پوچھا کیا ہے بھئی؟۔

آزاد کی آواز سن کر عورت الگ ہٹ گئی، اور خواجہ صاحب نے یوں جواب دیا:

خوجی: کچھ نہیں میاں یونہی باتیں ہو رہی تھیں۔

آزاد: اچھا اب کے آکے دلھن کے پاس بیٹھو۔ وہ کب سے گردن جھکائے بیٹھی ہے بے چاری۔

خوجی اوپر تشریف لے گئے دیکھا کہ ایک کونے میں دوشالہ اوڑھے ہوئے دلہن بیٹھی ہے۔ مگر گردن جھکائے ہوئے ہے۔ کلیر سا اور میڈ ا ذرا دور بیٹھی تھیں خواجہ صاحب نے بیوی پر رعب ڈالنے کے لئے یوں گپ شروع کی۔

خوجی: م سکلیر سا، ہمارے ابا جان سید تھے، اماں جان کابل کے امراء خان دان سے تھیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں اگر آپ دیکھیں تو ڈر جاتیں۔ اچھے اچھے پہلوان نام سن کر کان پکڑتے تھے۔ یہ پنجے اور یہ چوڑی کلائی۔ کمر چیتے کی طرح ہتلی اور رنگ بالکل شلجم کی طرح۔ آنکھیں خون خوار۔ ایک دفعہ رات کو چور گھس آیا، میں ڈر گیا۔ مگر واہ ری اماں جان، اگر زندہ ہوں تو خدا بخشے، اور اگر مر گئی ہوں تو بھی خیر۔ اماں جان نے چور کی آہٹ پائی تو یوں لپکیں کہ بلا کی طرح اس لعین کو چپڑ غٹو کیا۔

آزاد کو یہ فقرہ سن کر وہ ہنسی آئی کہ فرش ہو گئے، اور خوجی نے بغور دیکھا کہ دلہن ہنسی ضبط کر رہی ہے۔ سوچا کہ کوئی غلط بات منہ سے نکل گئی مگر پرواہ نہیں کی

بولے۔

ادھر انہوں نے چپڑ غٹو کیا۔ ادھر چور غین بول گیا۔ ہات تیرے کی۔

میں نے پکار کر کہا۔ اماں جان جانے نہ پائے۔

اتنے میں ابا جان کی آنکھ کھلی، پوچھا

کیا ہے"

میں نے کہا"

اماں اور ایک چور میں لڑائی ہو رہی ہے۔

ابا کس اطمینان سے کہتے ہیں کہ پڑے رہو آرام میں اس نے اب تک چور کو بے دم کر کے قتل کر ڈالا ہوگا۔

میں جا کے دیکھتا ہوں، لاش پھڑک رہی ہے۔ تو جناب ہم ایسوں کے لڑکے ہیں۔

آزاد: کچھ ایسے ہو تب ہی ایسے ہو۔ سوروں کے سو رہی ہوتے ہیں۔

خوجی: (ہنس کر) تسلیم مس کلیرسا۔ اس وقت ہماری باتوں پر بہت ہنس رہی ہیں۔ ابھی ہم ان کی نظروں میں نہیں جچتے۔

آزاد: دلہن آج بہت ہنستی ہیں۔ ہنس مکھ بیوی پائی ہے آپ نے۔

خوجی: بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ اردو نہ سمجھتی ہوں گی۔ مصر کی رہنے والی ہیں یہ بھلا اردو کیا جانیں۔ کیوں صاحب؟۔

آزاد: آپ بھی بس چونگا ہی رہے۔ ارے بیوقوف اردو سے انہیں کیا تعلق۔ یہ مصری بولتی ہیں اور کچھ کچھ ترکی۔۔۔

خوجی: حضرت دریا پار والی جنگ میں ہم نے وہ نام پیدا کیا ہے کہ کہو تو دو سو شادیاں کرلوں جناب والا۔

آزاد: مس میڈا ہنس رہی ہیں، گویا تم بالکل جھوٹے ہو۔

خوجی: والد مرحوم کو خدا بخشے۔ واللہ وہ گر بتا گئے ہیں کہ ہر مقام پر کام آتے ہیں۔ کئی باتیں بتا گئے ہیں، ایک تو یہ کہ جب لڑائی ہو تو پہلا وار اپنا کرنا۔ اس میں چاہے دیو ہی کیوں نہ ہو۔ بات کرتے ہی چانٹا دینا۔ اب اس کی ہمت نہ ہوگی کہ ہاتھ چلائے۔

آزاد: جی ہاں آپ تو کئی جگہ اس نصیحت پر عمل کر چکے ہیں۔ ایک تو بوا زعفران پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ سچ کہنا کتنی بے بھاؤ کی پڑی تھیں۔ دوسرے زبین نے ناک میں دم کر دیا تھا۔ چھینکتے چھینکتے ناک نک چھکنی کی جھاڑی بن گئی تھی۔ اختر النساء اور زینت النساء کے مکان کے پاس اس کسان نے اچھی خبر لی تھی کہ میاں کو مع ٹٹوی کے کانجی ہوس لیے جاتا تھا۔ اور آخر میں بہروپیے نے خوب تنگ کیا۔ اچھے اچھے جھانسے دیتے، ان میں ایک آدھ کو تو مات کر دیتے چانٹا دیتے تو ہم جانتے۔

خوجی: اب میں اپنا سر پیٹ لوں کیا کروں یارو۔ جس جس مقام پر اپنے حلم کے سبز لیل ہوا تھا۔ ان سب کا ذکر کیا۔ وہ تو کہیے خیریت ہے کہ دلھن اردو نہیں جانتی۔ ورنہ نظروں سے گر جاتا۔

اس فقرے پر آزاد مسکرائے اور دلھن ہنسنے لگی۔ تو خواجہ صاحب اکڑ کر فرماتے کیا ہیں؟۔

واہ رے میں! واہ ری میری قسمت۔ واللہ وہ ہنس مکھ بیوی پائی ہے کہ جی خوش

ہو گیا۔

آزاد: اور لطف یہ ہے کہ زبان نہ سمجھنے کے باوجود ہنسی بھی ہے تو عین موقعے پر جس مقام پر ہنسنا چاہیئے تھا۔واہ۔

تھوڑی گپ شپ کے بعد آزاد، مس کلیرسا اور مس میڈا باغ میں ٹہلنے کے لئے چلے گئے۔اب میاں خوجی اور دلھن کی باتیں سنیے:

دلھن: ہم کو چھوڑ کر چلے تو نہ جاؤ گے۔

خوجی: چونک کر ارے یہ تو اردو بھی بول لیتی ہیں۔پھر تو خوب گزرے گی۔خدا اسلامت رکھے۔ہاں آپ کیا پوچھتی تھیں؟۔

دلھن میاں کچھ نہ پوچھو۔کس مصیبت سے یہاں آئے ہیں،ہم کو ایک حبشی بہکا کر لیے جاتا تھا۔بارے خدا خدا کر کے یہ دن نصیب ہوا کہ اس سے رہائی پائی۔ میں تم کو اپنے بڑے اب کے برابر سمجھتی ہوں،جو اس میں ذرا فرق ہو تو ناک کٹوا ڈالو۔مجھے عذر نہ ہوگا۔

اب تو خواجہ صاحب شیر ہو گئے فرمایا:

مجھے کئی ہنر آتے ہیں،ایک تو آج تک سینکڑوں پہلوانوں سے لڑا اور ہمیشہ سب کو ہرایا۔دوسرے قرولی چلانا ساری خدائی میں مجھ سے بڑھ کے کوئی نہیں جانتا۔تیسرے گھوڑے پر ایسا سوار ہوتا ہوں کہ کوئی کیا ہوتا ہوگا۔چوتھے فارسی ہم خوب لکھتے ہیں اور خوب بولتے ہیں پانچواں ہنر یہ ہے کہ افیم کھانے میں ہمارا کوئی مقابلہ نہیں،جس قدر چاہے دے دو۔چانڈو کے جتنے کہو چھینٹے لگاؤں۔

دلھن: تمہارے پہلوان ہونے میں شک نہیں اور سپاہی آدمی ہو۔ہائے کل

سے ہماری مونچھ میں درد ہے۔اللہ میری توبہ۔

خوجی: کاہے میں درد ہے، کیا کہا؟۔

دلھن :مونچھ میں۔

خوجی:مونچھ کیا مونچھ کیسی (حیران ہوکر) یہ کیا بکتی ہو؟۔

دلھن : تھپڑ لگا کر اے نچے دور ہوے خدا کی شان ۔یہ مونہہ کھائے چولائی۔۔۔ہونہہ۔۔کہنے لگے کیا بکتی ہو؟۔بکتا تو خود ہے۔

خوجی :اے بیوی یہ مونچھ کیسی؟۔

دلھن :(خوجی کی مونچھ پکڑ کر) اسے کہتے ہیں، کیا یہ مونچھ نہیں ہے؟۔

خوجی :بڑی دل لگی باز ہو۔مذاق کرتی ہو۔

دلھن :اللہ جانتا ہے میری مونچھ میں درد ہے۔آپ کو یقین ہی آتا۔

خوجی: اور بھی حیران ہوکر مونچھ؟ کل کہوں گی میری داڑھی بڑھ گئی ہے۔تم پر خدا کی مار۔بھلا عورت کو مونچھ سے کیا واسطہ؟۔

دلھن :تم بالکل گدھے ہو۔ہمارے **ملک** میں جتنی بھی عورتیں ہیں سب کی مونچھ ہوتی ہے۔بے مونچھ کے کوئی عورت نہیں ہوتی۔

خوجی :ارے واہ یہ عورتیں کیا تچھنیاں ہیں؟۔

دلھن :اللہ گواہ ہے تم جیسا خوب صورت جوان میں نے زندگی میں کبھی بھی نہیں دیکھا۔

خوجی: (خوش ہ وکر مسکرائے) ،میں کس لائق ہوں،ہاں کسی زمانے میں تھے۔

دلھن: لیکن سنیئے شادی کے لئے میری دو شرطیں ہیں، اور اگر ایک شرط کے خلاف بھی کام کیا تو تمہاری بوٹیاں نوچ نوچ کر کھاؤں گی۔

خوجی: (مسکرا کر) مجھے منظور ہے، شرطیں بتاؤ۔

دلھن: پہلی شرط یہ ہے کہ افیم کھانا قطعاً چھوڑ دو، بالکل۔

خوجی: بس اب دوسری شرط بتانے کی ضرورت نہیں۔ پہلی ہی شرط میں حضور نے ہوش اڑا دیے۔ دوسری شرط نہ جانے کتنی سخت ہوگی۔ خدا کے لئے اس شرط کو جانے دو۔

دلھن: اچھا دوسری شرط سنو، ہندوستان میں جب مکان لو تو کسی بہروپیے کے پڑوس میں، ورنہ ہم تمہارے ساتھ نہیں رہیں گے۔

اس قدر سننا تھا کہ خوجی آگ ہو گئے۔

خوجی: اسوقت ہمارا چلو بھر خون خشک ہوگیا۔ بہروپیے کی تو صورت ہی سے نفرت ہے مجھے۔ دو شرطیں بیان کیں، دونوں جان کی دشمن، بس ہوگئی شادی۔ لاحول ولاقوۃ۔

اتنے میں دلھن نے نقاب الٹ دیا۔ خواجہ صاحب نے جو دلھن کی طرف نگاہ کی تو چیخ کر گر پڑے اٹھے اور پھر گر پڑے۔ ادھر ادھر گھبرائے ہوئے پھرنے لگے۔ اس قدر غل مچایا کہ آسمان سر پر اٹھا لیا۔

اوگیدی۔ (دروازے پر ہاتھ مار کر) ہائے دروازہ بھی بند ہے۔ اوگیدی خدا تجھ سے سمجھے نامعقول۔

بات اصل میں یہ تھی کہ دلھن کے روپ میں وہی بہروپیا تھا۔ جس سے بمبئی

میں خوجی کے کئی معرکے ہو چکے تھے۔ بہروپیے کے نام سے اب ان کی جان جاتی تھی۔ وہی بہروپیا کسی رئیس کے ساتھ حج کر کے واپس جا رہا تھا۔ کہ آزاد سے راستے میں ملاقات ہوگئی۔ آزاد نے اس سے فرمائش کی کہ یہاں خوجی کو پھر چکما دو۔ چنانچہ رائے قرار پائی کہ بہروپیا دلھن کے روپ میں پھر خواجہ بدیع الزمان کو چکمہ دے گا۔ خواجہ صاحب عقل کے دشمن تو تھے ہی فوراً دلھن کا نام سن کر شادی کے لئے آمادہ ہوگئے۔ اب جو اس نے نقاب اٹھایا اور خواجہ صاحب نے ایک عرصے بعد اسی بہروپیے کو دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ اور لگے کمرے میں ادھر ادھر بھاگنے۔ لیکن دروازے سب بند۔ بہروپیے سے خوجی کی شرط لگی تھی کہ نقاب الٹنے کے بعد خوجی گھبرا نہ جائیں تو اس کی ناک کاٹ لیں۔ اور اگر گھبرا جائیں تو بہروپیا ان کی ناک اڑا لے۔ اب بہروپیے نے خوجی کی ناک اڑانے کی فکر کی اور یہ بھی کہا:

بمبئی میں تم نے ہمیں چکما دیا اب پارسل کے روپے اگلیے، ورنہ مرمت ہو جائے گی۔

خواجہ صاحب بوٹیاں نوچنے لگے۔ کہ کس مصیبت میں جان پڑ گئی۔

بہروپیا: دائیں ہاتھ میں روپے رکھ دیجیے۔ ایک بات اور ناک ادھر لائے بندہ چاقو تیز کر رہا ہے۔

خوجی: جاؤ بے ج امنہ سے نکالو گے تو بس بگڑ ہی جائے گی۔

بہروپیا: اور بنی کب تھی۔ ناک ادھر لاؤ۔ آج نکلٹے تو کہلاؤ گے، ہم اسی میں خوش ہیں۔

خوجی: (تھپڑ کا اشارہ کر کے) خوجے کی ایسی تیسی سور کی۔ او گیدی الگ رہنا، بس الگ ہی رہنا کہہ دیا ہے۔ ہاں کیا دل لگی ہے۔ ہونھ بڑے وہ بن کر آئے تھے۔ ابھی آپ میرے غصے سے واقف نہیں ہیں۔

بہروپیا: میں خوب واقف ہوں۔ کمزور مار کھانے کی نشانی۔

خوجی: ہم کمزور ہیں۔ یا خدا اس وقت کمرے پر بجلی گرے اور ہم جل بھن کر خاک ہو جائیں۔ آزاد (دروازے سے جھانک کر) اے آزاد نہ بول کم بخت۔۔ مس کلیر سا صاحب،، اجی مس میڈا کوئی ہے واہ اچھی دلھن دکھائی ہے۔

بہروپیا: اب بتاؤ وہ پارسل والے روپے دو گے یا نہیں؟

خوجی: کیسے روپے اور کس کا پارسل؟ آیا وہاں سے۔

بہروپیا: پھر آپ سے پکڑ ہو گی ہاتھ پاؤں توڑ کر رکھ دوں گا۔

خوجی: (مسکرا کر) ماشا اللہ۔ پہلے جا کر ہوٹل والوں سے تو دریافت کرو کہ کس جوانمردی سے مصر کے پہلوانوں کو اٹھا کر دے مارا، چاروں شانے چت۔

بہروپیا: اچھا پھر اب تمہاری قضا آئی ہے، ہڈیاں چلچلاتی ہیں۔ خواہ مخواہ ناحق ہاتھ پاؤں کے دشمن ہو رہے ہو۔

خوجی: سچ کہتا ہوں ابھی تم نے میرا غصہ نہیں دیکھا۔

بہروپیا: اب کے ایک دفعہ پوچھ کر ہاتھ سے خبر لوں گا۔

خوجی: اور میں قرولی سے جواب دوں گا۔ گیدی۔

بہروپیا: ہم سے کیا شرط بدی تھی۔ ناک، ناک۔ اب ناک تراش کر چیلوں کو دیں گے۔ حضور کی ناک اور چیل کی چونچ۔ واہ۔

خواجہ صاحب نے سوچا اب اس سے چھٹکارا محال ہے۔ اول تو کرارا آدمی ہے۔ دوسرا اگرانڈیل۔ تیسرے شہہ زور، چوتھے جوان۔ یہ خود پستہ قد۔ ماشہ بھر کے آدمی۔ کوئی پھونک مارے تو لرزنے لگیں مگر تیکھے پن کی وجہ سے دب کے رہنا محال ہے۔ اب موقع سخت دیکھ کر بہروپیا کے ساتھ یوں لجاجت سے پیش آئے۔

خوجی: بھائی جان۔ پردیس میں ہم تم کو مل جل کر رہنا چاہیئے۔ مگر خدا جانے تم کیسے ہندوستانی ہو کہ ہندوستانی کا ساتھ نہیں دیتے۔

بہروپیا: پارسل کا روپیہ داہیں ہاتھ سے ڈال دو تو خیر

خوجی: اجی لاحول، تم بھی کیا باتیں کرتے ہو؟ اے توبہ پارسل کا ذکر کیسا۔ بزاز کی دکان پر ہی تو حضور کی طرف سے ہم کچھ پوچ آئے تھے۔ چلو فراغت ہوئی۔

بہروپیا: اچھا تو وعدہ پورا کرو۔ ناک تو کاٹنے دو۔

خوجی: واہ بھلا مجھ غریب آدمی کی ناک کاٹنے سے کیا فائدہ۔ ناک چھوڑ چاہے دونوں کان کاٹ ڈالو۔ مگر ہمارا جوبن کم نہ ہوگا۔ اتنے میں آزاد پاشا نے دروازے میں آواز دی،

جناب خواجہ صاحب''

کفن پھاڑ کر چیخ اٹھے۔

بہروپیا: نے دروازہ کھول دیا۔

مس کلیرسا نے آتے ہی قہقہہ لگایا۔

آزاد: کہیے حضرت شادی مبارک۔یا آج ہماری دعوت کرو۔

خوجی: زہر کھلاؤ اور دعوت مانگو۔یہ جو ہم نے آپ کی حمایت کی، کروڑوں مصیبتوں سے بچایا۔لاکھوں خطروں میں جان پڑی،اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ آپ نے ہمیں ذلیل کیا۔

کلیرسا: یہ تو مٹھائی اور دعوت نہ دینے کی باتیں ہیں۔ہم تو دعوت لے کے رہیں گے۔اتنی اچھی بیوی پائی ہے۔

خوجی: ہاں صاحب آپ کو کیا۔یہاں ہڈی پسلی ایک ہوگئی ،ان کو دل لگی سوجھتی ہے۔خدا کرے جیسی بیوی ہم نے پائی ویسا ہی شوہر تم پاؤ۔بس اس سے بڑھ کر اور کیا دعا دوں۔ادھر مس میڈا نے مسکرا کر خوجی کو سلام کیا۔حضرت نے جھلا کر کہا:

خوجی: بس سلام سلام رہنے دیں حضور۔دور ہی سے سلام ہے۔لے کے دھروا دیا اور اوپر سے سلام کرتی ہیں۔ایسے سلام سے درگزرے،اور میں اس وقت ایسا پاگل بن گیا کہ کچھ نہ پوچھو،اتنا بھی نہ سوچا کہ مصر کی عورت اردو کیوں کر بول سکتی ہے۔لیکن بیوی پانے کے شوق میں آنکھوں پر پٹی بندھ گئی۔آخر کار الو بنے۔وہ تو بڑی خیریت گزری ورنہ ناک ہی گئی تھی۔اور پارسل کے روپے الگ دینے پڑتے۔خدا نے بڑی خیر کی۔

خواجہ صاحب سے لاکھ لاکھ کہا مگر اب کے وہ آزاد سے سخت ناراض ہوئے۔قسم کھالی کہ اب آزاد کی صورت نہ دیکھیں گے۔ہندوستان سے اتنی دور کے فاصلے پر آئے۔ہماری وجہ سے دل لگی رہی۔میاں ان سب باتوں کا انجام یہ ہوا

کہ ہمیں پر چکمے چلنے لگے۔اور اس بد بخت نالائق بھروپیے سے ہماری مڈھ بھیڑ کرائی۔

بڑی بک بک جھک جھک کے بعد آزاد تو کلیر سا اور مس میڈا کے ہمراہ ہوٹل چلے گئے۔مگر خوجے نے ان کا ساتھ نہ دیا۔

بہروپیے نے ان سے کہا:

اب ہم دونوں اکیلے رہ گئے ہیں۔چلو جہاں ہمارے نواب صاحب ٹکے ہوئے ہیں، وہیں چل کے رہو۔

خواجہ صاحب بہروپیے کے ساتھ روانہ ہوئے اور کہا اب تمہارے ساتھ ہیں، چاہے بناؤ چاہے چکما دو۔

خوجی چانڈو خانے میں

بڑی مشکل سے میاں آزاد اور خوجی کی صلح ہوئی۔ ہیضے کی بیماری دور ہوئی تو جہازوں کی آمدورفت شروع ہوئی۔ میاں آزاد نے مس میڈا مس کلیرسا اور خوجی کے ٹکٹ خریدے اور ایک جہاز سے واپس ہندوستان روانہ ہوئے، بمبئی میں میاں آزاد تو اپنے ایک دوست میرزا صاحب کے مہمان ہوئے اور خوجی کو یہاں بھی شادی کا چکمہ دے کر ایک عورت ساتھ لے گئی۔ اس کے ہاں ایک روز خوجی نے جی بھر کر مالوے کی افیم پی تو نتیجہ یہ نکلا کہ شدید بیمار ہو گئے۔ ڈاکٹر نے علاج کیا تو بڑی مشکل سے جان بچی۔

خوجی کا انتظار کر کر کے میاں آزاد تو بمبئی سے چلے گئے اور خوجی در در کے دھکے کھاتے پھرے۔ ایک دن طبیعت ذرا ترنگ میں آئی تو چانڈو خانے تشریف لے گئے۔ لوگوں نے ان پر نظر ڈالی تو حیران ہوئے کہ یہ نیا پنچھی کون ہے۔

خوجی: سلام علیکم یارو۔ سلام علیکم بھائیو۔

امامی: مالیکم بھائی۔ مالیکم۔ کہاں سے آنا ہوا۔

خوجی: ذرا ٹکنے دو پھر کہوں مگر میں بیٹھ نہیں سکتا۔ دو برس کی لڑائی کے بعد بالکل خستہ ہو گیا۔ جب دیکھو مورچہ بندی، ہر دم ساز و سامان سے لیس۔ مر مٹے مگر وہ نام پیدا کیا کہ ساری دنیا میں مشہور ہوئے۔ اور قسم جناب والد صاحب کی روح کی شیطان بھی ایسا مشہور نہ ہوا ہو گا جیسا بندہ نے نام کیا۔

امامی: لڑائی کیسی

خوجی: تم بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے بیٹھے کیا جانو۔

قادر: کیا روس و روم کی لڑائی سے آتے ہو، اور تو کوئی لڑائی نہیں سنی۔ہاں ایران، اور توران میں مرچہ بندی ہوگئی تھی۔

خوجی: تم کیا جانو روس و روم کی لڑائی کا حال۔

امامی: (مسکرا کر) اجی حضرت یہ نہ کہیئے ان کو ساری خدائی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ان سے کوئی بات چھپی نہیں ہے۔

قادر: روم والے نے روس سے کہا کہ جس طرح تمہارا چچا ہم کو خراج دیتا ہے۔اسی طرح تم بھی دیا کرو۔مگر وہ نہ مانا۔اسی بات پر جھگڑا ہو گیا،تو روم کے شہنشاہ نے کہا۔اچھا اپنے چچا کے مقبرے پر چلو اور پوچھو۔دیکھو کیا آواز آتی ہے۔ وہ پھر بھی نہ مانے۔اس پر پھر جھگڑا ہوا۔روم کے شہنشا کے پاس حضرت سلیمان کی انگوٹھی تھی۔انھوں نے کسی فرشتے کی مدد سے ہوا میں بھیجی تو سینکڑوں جن حاضر ہوئے۔بادشاہ نے حکم دیا کہ روس میں چاروں طرف آگ لگادو۔اب روس کی چار دیواری جلنے لگی۔ روس والے نے سب وزیروں کو جمع کر کے کہا کہ آگ بجھاؤ۔۔سوا کروڑ سقے مشکیں بھر بھر کر پانی لیے کھڑے تھے۔اور مشکیں اتنی بڑی بڑی کہ دو لاکھ من پانی آجائے جن میں۔

خوجی: کیوں صاحب یہ آپ سے کس نے کہا ہے۔

امامی: اجی یہ نہ پوچھو۔ان سے فرشتے سب کہہ جاتے ہیں۔

قادر: بس صاحب سننے کی بات ہے۔کہ سوا دو کروڑ مشکیں جن میں فی مشک دو لاکھ من پانی تھا۔ملک کے چاروں کونوں پر پڑتی تھیں۔مگر آگ بھڑکتی جاتی

ہے۔بادشاہ نے حکم دیا کہ دولاکھ کروڑ ستے اس کام پر لگا دیے جائیں۔اور مشکوں میں چھتیس چھتیس کروڑ من پانی ہو۔

خوجی: اوگیدی کیوں اس قدر جھوٹ بولتا ہے۔

شبراتی: میاں سننے دو بھائی۔عجب آدمی ہو۔

خوجی: مرد خدا میں تو سنتے سنتے پاگل ہوگیا۔

قادر: اجی آپ لکھنو کے مہین آدمی، ان ملکوں کا حال کیا جانیں۔۔روم، روس ماژندران، توران شہر کا۔۔کا حال ہم سے سنیئے۔

امامی: وہاں کے لووگ بھی دیو ہوتے ہیں دیو۔

قادر: روس کے بادشاہ کی غذا کا حال سن کر تو چکرا جاؤ۔سویرے منہ اندھیرے چھ بکروں کی یخنی۔چار بکروں کے کباب۔دس مرغ کا پلاؤ کھاتے ہیں۔نو بجے کے قریب سو مرغ کا شوربہ اور دس سیر ٹھنڈا پانی پیتے ہیں۔بارہ بجے جواہرات کا شربت۔کبھی پچاس من، کبھی ساٹھ من۔ چار بجے دو کچے بکرے، دو کچے ہرن، دو کچے کبوتر، شام کو شراب کا پیپا اور پھر رات گئے گوشت کا چھکڑا۔

امامی: جب تو طاقتیں ہوتی ہیں کہ سوسو آدمیوں کو ایک آدمی مار ڈالتا ہے۔۔۔ہندوستان کا آدمی کیا کھا کر لڑے گا۔

شبراتی: ہندوستان میں اگر ہاضمے کی طاقت کچھ ہے بھی تو چانڈو کے سبب ورنہ سب کے سب مر جاتے۔

امامی: سنا ہے وہ ہاتھی سے تنہا مقابلہ کرتے ہیں۔

قادر: ہم سے سنو۔دس ہاتھی ہوں تو ایک روسی دسوں کو مار ڈالے گا۔اور وہ

چنگھاڑ کے بیٹھ گیا اور مر گیا۔

خوجی: کبھی روس جانے کا اتفاق ہوا ہے آپ کو؟

قادر: اجی ہم گھر بیٹھے ساری دنیا کی سیر کر رہے ہیں۔

امامی: حضرت ان کو سب باتیں یونہی معلوم ہوتی ہیں۔۔

خوجی: یارو ہم کس سے کہیں۔ ابھی جنگ کے میدان سے آتے ہیں۔ ہم نے وہاں ہاتھی دیکھے ہی نہیں۔

قادر: روم والوں نے جب آگ لگا دی تو گیارہ برس، گیارہ مہینے، گیارہ گھنٹے، گیارہ منٹ، گیارہ سیکنڈ، گیارہ پل جلا کی۔ اب جا کے پرسوں ذری ذری آگ بجھی ہے۔ نہیں تو عجب نقشہ تھا کہ تمام ملک جل رہا ہے۔ اور روم والے جب رات کو سوتے ہیں تو دو دیوں کا پہرا رہتا ہے۔ جو ایک دن بھی روم میں رہے گا۔ اس کے پاس دیو ضرور آئے گا۔ اور سایہ اس کے سر پر رکھے گا۔

خوجی: افوہ سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ ارے یارو اس جھوٹ پر خدا کی مار۔ ہم برسوں وہاں رہے اور ایک دیو بھی نہیں آیا۔

خوجی: بھلا روم کے دارالسلطنت کا کیا نام ہے؟۔

قادر: مرزبان۔۔۔ دس کوس ادھر دس کوس ادھر پہاڑ ہے۔

خوجی تو یہ سمجھ کر آئے تھے کہ سب کو بند کر دیں گے، اور چانڈو خانے میں ان کا طوطی بولے گا۔ مگر یہاں جو آئے تو دیکھا کہ یار لوگ زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں۔

خوجی: مرزبان نام کا تو کوئی شہر ہی نہیں ہے۔

قادر: اجی تم کیا جانو۔ مرزبان وہ شہر ہے جہاں جن اور پریاں پہاڑوں پر رہتی ہیں، اور دس کوس کے فاصلے پر آدم زاد۔۔۔اور پہاڑوں پر وہاں بادل روئی کے گالوں کی طرح۔۔۔چشموں میں پانی پی پی کر آسمان کی طرف جاتے ہیں۔اور آسمان کے رہنے والوں کو پانی پلاتے ہیں۔

خوجی: تو وہ روم جس کا حال آپ کہتے ہیں اور ہوگا۔۔۔اور جس روم سے میں آتا ہوں وہ اور ہوگا۔

قادر: روم کے ملک میں عورتیں ہاتھی پر خوب سوار ہوتی ہیں اور ہاتھیوں کے جنگلوں میں جا کر ان کا شکار کرتی ہیں۔اور مرد دن رات گھر میں رہتے ہیں۔مگر ایسے بہادر ہیں کہ ایک ترک دس شیروں کو بھگا دے۔تین برس کے ایک بچے نے کھیل کھیل میں شیرنی کو ایک پتھر مارا تو شیرنی کا منہ الٹ گیا اور مر گئی۔

خوجی: اتنا جھوٹ مت بولو۔

قادر: اچھا تم بتاؤ روم کے بادشاہ کا کیا نام ہے؟۔

خوجی: ہم سے پوچھتے ہو شان خدا۔

قادر: ہاں ہاں آپ سے پوچھتے ہیں۔بتایئے؟۔

خوجی: سلطان عبدالحمید خان بہادر غازی۔

قادر: (ہنس کر) واہ واہ۔۔۔بس بس آپ خاک بھی نہیں جانتے۔

امامی: پھر یہ کیا کہتے ہیں کہ ہم روم سے آتے ہیں۔

قادر: بھلا لڑائی کا انجام کیا ہوا؟۔یہی بتایئے؟۔

خوجی: پلونا کی جنگ میں ترک سپہ سالار قید ہو گیا۔قلعہ ہمارے ہاتھ سے نکل

گیا اور روسیوں نے فتح پائی۔

قادر: کیا کہتا ہے بد بخت۔ خبر دار جواب ایسا کہا تو اتنا ماروں گا کہ بھرکس نکل جائے گا۔

نواب: جی میں آتا ہے کہ ان کی خوب مرمت کروں۔

امامی: ہمارے بادشاہ کے حق میں بری کیوں کہتے ہو۔ بے ادب آدمی، یہاں ایسی بات کروگے تو پٹ جاؤ گے۔ اور سینے، اچھے ملے۔

خوجی: سنو صاحب ہم شاہی سوار ہیں۔

قادر: اب زیادہ بولو گے تو اٹھ کر کھوپڑی نکال دوں گا۔ ہم سے بڑھ کر روم کا حال کون جانتا ہے۔

نواب: روم کا بادشاہ بڑا بادشاہ ہے۔

خوجی: جناب آپ پڑھے لکھے سمجھ دار لگتے ہیں۔

امامی: اب تم بے پٹے نہ جاؤ گے کیا۔

خوجی: (دل میں) اگر روم میں ہوتے تو ہر مزجی کے آدمیوں سے پٹواتا، اور درخت میں بندھوا کر ڈنڈے مرواتا۔ اب خاموشی ہی بہتر ہے۔

شبراتی: یہ ہیں کہاں کے۔ قبر سے نکل کے بھاگا ہے کیا؟۔ صورت تو دیکھو مردے کی سی۔

خواجہ صاحب کو مل کر سب نے ایسا ڈانٹا ڈپٹا کہ گیدی اور قرولی سب بھول گئے۔ بڑے زعم میں آئے تھے کہ چانڈو خانے میں یوں ڈینگیں ہانکیں گے۔ اور روم اور روس کے معرکے سنائیں گے۔ مگر وہاں لینے کے دینے پڑ گئے۔

چانڈو خانے سے واپسی پر خوجی راہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ بہت سے آدمی ایک مقام پر کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔حضرت نے بھی جھک پڑنے کی کوشش کی کہ بھیڑ کاٹ کر گھس جائیں۔مگر ذرا سے آدمی ننھے ننھے ہاتھ پاؤں۔بیماری نے اور بھی مردہ کر دیا تھا۔جس طرف چلے لوگوں نے دھکا دیا۔لڑھکنی کھا کر دس قدم پر ہو لیے۔ادھر ادھر دیکھا تو کوئی جان پہچان نہیں۔جھاڑ پونچھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔آخر کار بڑی دیر کے بعد دیکھا کہ ایک گرانڈیل پہلوان بیٹھا ہے۔اور لوگ اس کی تعریف کر رہے ہیں کہ واہ استاد کیا کشتی لڑی ہے۔اپنے سے دگنے کو نیچا دکھا دیا۔

خواجہ صاحب نے اپنے جسم پر بھی نظر ڈالی اور پہلوانی کے زعم میں چلے مصحافہ کرنے۔

خوجی: ہاتھ بڑھا کر یا داللہ بھئی پہلوان۔

پہلوان: (تعجب سے) سلام بھائی جان۔

خوجی: ہم اس وقت بہت زیادہ خوش ہوئے۔اس سے زیادہ خوشی اور کیا ہو گی کہ ہم نے اپنے ایک جوڑی دار کو پایا۔۔۔اور تم تو ہمارے بدن ہی سے سمجھ گئے ہو گے کہ ہمارا ساتھی پہلوان ہے۔

پہلوان: تم کہاں کے پہلوان ہو بھائی صاحب؟۔

خوجی: یار کیا بتائیں۔۔۔اپنے ساتھیوں میں اب ایک بھی نظر نہیں آتا۔اب کوئی پہلوان ہماری نظر میں جچتا ہی نہیں۔

پہلوان: (طنز سے) مگر کیا کاٹھی ہے اور ہاتھ پاؤں کیا سڈول ہیں۔واہ واہ۔

خوجی: میاں بڑی محنت کی ہے۔اور اس پر میرا بدن چور ہے۔اور قد بھی چور ہے۔

پہلوان: استاد کچھ ہم کو بھی بتاؤ۔

خوجی: اکڑ کے واللہ تم خود استاد ہو۔ ہماری صورت دیکھتے ہی تاڑ گئے کہ یہ بھی بے مثل استاد ہے۔

اتنے میں پہلوان کے ایک شاگرد نے جس کی عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی خوجی کے قد و قامت پر نظر ڈال کر استاد سے کہا۔

اگر اجازت ہو تو ایک لگا دوں۔

خواجہ صاحب سن کر آگ ہو گئے۔اور لڑکے کو دو ایک سنائیں۔

اس لڑکے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، گردن پکڑ کر آنٹی دی،تو خواجہ صاحب دھڑ سے زمین پر گر پڑے۔ادھر قہقہہ پڑا۔پہلوان نے لڑکے کو ڈانٹا اور خواجہ صاحب کو سمجھایا کہ آپ بڑے ہیں اس لڑکے کے منہ نہ لگیے۔

خوجی: اللہ گواہ ہے۔لونڈا سمجھ کر چھوڑ دیا ہے اس گیدی کو۔

پہلوان: اس میں کیا شک؟۔

خوجی: کوئی استاد اور برابر والا ہوتا تو بتا دیتا۔

پہلوان: برابر والا بولتا ہی کاہے کو۔

خوجی: اور بولتا تو اس وقت لاش پھڑکتی ہوتی،اور اس لڑکے کو تو چرمرہی کر ڈالتا۔

پہلوان: آپ نے کس استاد سے کشتی سیکھی ہے؟۔

خوجی: گھبرا کے ہم نے اپنی والدہ سے کشتی سیکھی ہے۔اس پر اور بھی قہقہہ پڑا اور خود پہلوان بھی ہنس پڑا۔

ایک شخص: کیا وہ بھی پہلوان تھی، کیوں استاد؟۔

دوسرا: ان کو کس نے کشتی سیکھائی؟۔آپ کے والد نے؟۔

خوجی: اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔۔۔تم کہاں رہتے ہو پہلوان۔

پہلوان: ہم آج کل نواب ذوالفقار علی خاں کے یہاں ہیں۔تین روپے روز دیتے ہیں اور ایک بکرا، آٹھ سر دودھ، دوسیر گھی اور ایک روپے روز کا تیل ملتا ہے۔

خوجی: (چونک کر) ذوالفقار علی خان۔

پہلوان: جی ہاں، جن کو بٹیروں کا بڑا اشوق ہے۔

خوجی: اخاہ۔بھلا وہاں چانڈو کا بھی شغل رہتا ہے۔

پہلوان: کچھ نہ پوچھیے، دن رات۔

خوجی: بھلا وہاں مسیتا بیگ بھی ہیں۔

پہلوان: ہاں ہیں۔آپ کیوں کر جان گئے؟۔

خوجی: اور میر صاحب بھی ہیں اور پیرو بھی۔

پہلوان: جی ہاں میر صاحب، مسیتا اور پیرو مصاحب ہیں۔اور کسی کا نام لیجیے۔آپ کا اپنا نام کیا ہے؟۔کیا آپ دربار میں تھے؟۔

خوجی: بھلا صف شکن علی خاں بٹیر کا نام بھی سنا ہے؟۔

پہلوان: قہقہہ لگا کر تو کہیے کہ آپ کل باتوں سے واقف ہیں۔صف شکن کو تو اب تک روتے ہیں لوگ۔اور قبر بھی بنی ہوئی ہے۔اور وہاں کوئی خوجی خوجی بھی

سنا ہے کوئی بڑے ہنسوڑ آدمی تھے۔ وہ وہاں مسخروں میں نوکر تھے۔

خوجی: آزاد نام کے بھی کوئی صاحب وہاں تھے۔

پہلوان: جی ہاں وہ جو ساانڈنی لے گئے تھے۔ مگر سنا ہے وہ تو کسی ملک میں لڑائی سر کر رہے ہیں۔ نواب صاحب سے کسی نے کہا تھا کہ آزاد اور خوجی دونوں لڑائی پر گئے ہیں۔ تو لوگوں نے یقین نہیں کیا کہ خوجی افیمی آدمی بھلا سمندر میں کیوں کر گئے ہوں گے۔ عمر بھر مسخرہ پن اور چانڈو بازی کیا کیے۔ ان کو جنگ اور مورچے سے کیا واسطہ۔ مگر آزاد تو دور دور مشہور رہیں۔

خوجی: یہ مرزا کم بخت کہتا ہوگا کہ خوجی افیمی آدمی ہے، اس کو جنگ سے کیا واسطہ؟۔ اچھا گیدی تجھ کو دربار سے پھر نکلواؤں گا۔ ایک دفعہ تو نکلوا چکا ہوں۔

پھر پہلوان سے کہا:

خوجی: آپ کے ساتھ ہم بھی نواب صاحب کے ہاں چلیں گے۔

پہلوان: میں تو آج ہی ریل پر جاؤں گا۔

خوجی: بھائی ہم کو بھی ساتھ ضرور لیتے چلو۔

پہلوان: چلیے، میرا اس میں کیا ہرج ہے۔ ہم کو نواب صاحب نے دو دن کی اجازت دی تھی۔ کل اور آج کل یہاں آئے تھے۔ ایک کشتی لڑی اور آج شام کی ریل سے چل دیں گے۔ ہمارے ساتھ مرزا مسیتا بیگ بھی ہیں۔

خوجی: واللہ بڑی خوشی ہوئی۔ شام کو پہلوان کے ساتھ خواجہ بدیع الزمان صاحب ریل کے اسٹیشن پر آئے۔

پہلوان: نے کہا وہ دیکھیے مرزا صاحب کھڑے ہیں۔ جا کر مل لیجیے۔

خوجی: آہستہ آہستہ گئے اور پیچھے سے ان کی آنکھیں بند کرلیں۔

مرزا: کون ہے بھئی۔۔۔(ہاتھ ٹٹول کر) کوئی لڑکی ہے کیا؟۔

پہلوان: بھلا بوجھو تو جانیں۔

مرزا: سمجھ میں نہیں آتا مگر ہیں کوئی خاتون۔

خوجی: بھلا گیدی ابھی سے بھول گیا ہمیں۔۔کیوں۔۔۔

مرزا: ہاتھ چھوڑ کر۔۔اخاہ۔۔۔خواجہ صاحب ہیں۔کہو بھئی خوجی اچھے تو رہے یار چے۔

خوجی: خوجی کہیں اور رہتے ہونگے۔۔اب وہ خوجی نہیں ہیں۔ہمیں جناب مولانا خواجہ بدیع الزمان صاحب کہا کرو۔

مرزا: ارے کم بخت گلے تو لگ۔

خوجی: نواب صاحب کیسے ہیں۔گھر میں تو خیریت ہے۔

مرزا: سرکار اللہ کے فضل سے اچھے ہیں۔کہو تم نے تو خوب نام پیدا کیا۔

خوجی: نام۔۔۔ارے ہم میجر تھے۔میجر خواجہ سنا ہوگا۔

مرزا: سرکار کو اس لڑائی کے زمانے میں اخبار کا بڑا شوق تھا۔آزاد کا ذکر ہر روز نظر سے گزرتا تھا۔اور آپ کا حال پڑھتے تھے۔آزاد کو تو سب جانتے ہیں کہ بڑے بہادر اور خوب صورت جوان ہیں۔مگر تمہارا حال جب سے پڑھا۔سرکار کو اخباروں کا اعتبار جاتا رہا۔خوجی آدمی وہاں کیوں کر پہنچا۔۔افیمی آدمی،سمندر کی شکل دیکھ کر اس کا پتہ کیوں پھٹ گیا۔تم فقرہ باز آدمی ہو۔نشہ پانی سے کام۔۔۔جنگ سے تم کو کیا واسطہ؟۔

خوجی: اب اس کا حال تو تم ان لوگوں سے پوچھو جو مورچوں میں ہمارے شریک تھے۔ تم مزے سے بیٹھے بیٹھے گپ اڑایا کیے۔ تم کو ان باتوں سے کیا سروکار۔ وہاں اگر ہمارا ساتھ دیتے تو جانتے۔

مرزا: ارے ایک مرتبہ اخبار میں لکھا تھا کہ خوجی نے شادی کر لی۔

خوجی: ارے یار اس کا حال نہ پوچھو۔ اپنے حسن و جمال کا حال تو ہمیں باہر جا کے معلوم ہوا۔ جس ملک، جس شہر میں گیا، سینکڑوں عورتوں نے شادی کا پیغام دیا، خیر اب دربار کے رنگ ڈھنگ کا حال کیا ہے۔

مرزا: تمھیں سب کو چل کر ٹھیک بتاؤ گے۔۔۔ اور تو سب خیر ہے مگر جمن نے چغل خوری پر وہ کمر باندھی ہے کہ یا الٰہی توبہ۔

خوجی: کہو مرزا تو اچھے ہیں۔۔۔ نادر بیگ۔

مرزا: ہاں مگر آتے جاتے کم ہیں۔

گھنٹی بجی، ٹکٹ بٹ چکے۔ تو پہلوان اور مرزا سیتا بیگ کے ساتھ حضرت خواجہ صاحب بھی پلیٹ فارم پر آئے۔ اور پہلوان کی طرح حضرت خود بھی اکڑے جاتے تھے۔ ریل کے دو چار ملازموں نے ان کو دیکھ کر آوازے کسے۔

واہ آدمی کیا ہے، گینڈا بنا ہوا ہے۔۔۔ ماشا اللہ کیا ہاتھ پاؤں ہیں۔۔۔ سبحان اللہ۔ کیوں صاحب کتنے ڈنڈ آپ پیل سکتے ہیں۔

خوجی: اجی حضرت بیماری نے کمزور کر دیا۔ ورنہ میں پوری ایک ریل پر لد کر جاتا تھا۔

ملازم: جی ہاں اس میں کیا شک، آپ کی ایک ایک ران دو دو من کی ہے۔

خوجی: قسم کھا کے کہتا ہوں، اب آدھا نہیں رہا۔

ملازم: یہ سب آپ کے شاگرد ہوں گے۔

خوجی: یہ پہلوان ہمارے اکھاڑے کے خلیفہ ہیں،اور باقی سب شاگرد۔میرے شاگردوں کی تعداد تو لاکھوں میں ہے۔دوسرے ملکوں سے بھی لوگ آتے ہیں پہلوانی سیکھنے۔

اتنے میں دوسری گھنٹی ہوئی،خواجہ صاحب ایسا بوکھلائے، کہ زنانے ڈبے میں گھس گئے۔وہاں سے نکالے گئے تو پھر اول درجے کے ڈبے میں گھس پڑے،بڑے صاحب نے ڈانٹ بتائی۔وہاں سے بھاگے تو اب مرزا صاحب کا پتا نہ پہلوان کا۔

مرزا صاحب۔۔ مرزا صاحب۔۔۔پہلوان ۔۔ارے بھائی پہلوان ۔۔ارے یارو مر گئے۔۔اہاہا۔۔اس بہروپیا نے جھانسہ دیا ہوگا۔۔واللہ خوب سمجھا۔۔

اتنے میں مرزا صاحب نے پکار کر بلایا۔اور ریل پر اپنے ساتھ بٹھایا۔

خواجہ صاحب نے ریل پر بیٹھ کر جناب باری کا شکر ادا کیا۔۔خدا خدا کر کے سفر تمام ہوا۔

اب خواجہ صاحب،پہلوان اور مرزا مسیتا بیگ کے ہمراہ اپنے پرانے آقا نواب صاحب کے دربار میں داخل ہوئے۔دیکھا کہ دربار میں سب لوگ جمع ہیں۔

خوجی: آداب عرض ہے پیرو مرشد۔

نواب: حیران ہوکر۔ آخاہ خوجی ہیں۔ آؤ آؤ بھئی آؤ۔

خوجی: (پھر آداب عرض کر کے) حاضر ہوں خداوند (قدم لے کر) الحمدللہ کے یہ سعادت پھر مجھے نصیب ہوئی۔

غفور: خوجی میاں سلام۔

خوجی: سلام بھائی مگر ہم کو اب خوجی میاں نہ کہنا۔ اب ہم فوج کے افسر ہیں بدیع پاشا۔

جمن: آپ بادشاہ ہوں یا وزیر۔۔۔ ہمارے تو خوجی ہی ہو۔

خوجی: ہاں بھئی یہ تو ہے۔ خداوند حضور کے نمک کی قسم ملکوں ملکوں اس دربار کا نام روشن کیا ہے۔

نواب: شاباش خوجی شاباش۔ ہم نے اخباروں میں تمہاری تعریف پڑھی۔ بہت خوش ہوئے۔

خوجی: سلام کر کے، حضور۔ غلام کس لائق۔

جمن: ارے یار تو سمندر میں جہاز پر کیوں کر سوار ہوا۔

خوجی: ہونہہ۔۔۔ یہ سمندر میں جہاز پر کیوں کر سوار ہوا۔ مورچوں پر جرنیلوں، سپہ سالاروں، کرنلوں اور میجروں سے بھڑ بھڑ پڑتے تھے۔۔ مارتے مارتے بڑے بڑے افسروں کا ناک میں دم کر دیا۔ پلونا کی جنگ میں دس لاکھ آدمی ایک طرف اور ستر سواروں کے ساتھ غلام دوسری طرف،، ملاحظہ فرمایئے۔۔ چودہ دن برابر مقابلہ جاری رہا اور چھکے چھڑا دیے۔

جمن: ارے اس قدر جھوٹ۔ ادھر دس لاکھ۔ ادھر ستر، بھلا کوئی بات ہے۔

خوجی: تم کیا جانو، گھر سے باہر نہیں نکلے۔ وہاں ہوتے تو اوسان خطا ہو جاتے۔

نواب: بھئی اس میں تو شک نہیں تم نے بڑا جیالا پن کیا۔ خبردار آج سے انہیں کوئی خوجی نہ کہے بدیع پاشا کے لقب سے پکارے جائیں۔

خوجی: (سلام کر کے) آداب حضور، جمن گیدی چغل خور نے منہ کی کھائی نہ آخر۔ رئیسوں کی صحبت میں ایسے مردود کا گزر، افسوس کا مقام ہے۔ اب تو حاضر ہوا۔ دیکھیے کیا کیا باتیں کرتا ہوں۔

نواب: کیوں صاحب بھلا ہندوستان سے باہر بھی کوئی جانتا ہے ہم کو، سچ بتانا بھائی۔

خوجی: جہاں جہاں غلام گیا، حضور کا نام بادشاہوں سے زیادہ مشہور ہو گیا۔

خوجی کے احباب۔ محلے کے لوگ اور دربار کے آدمی جوق در جوق جمع ہوئے۔ اور خوجی پینترے بدل بدل کر ڈینگیں اڑانے لگے۔

نواب صاحب کے ہاں

اسے اتفاق کہیے کہ بمبئی سے چل کر آزاد بھی اسی شہر میں آ گئے۔ جہاں خوجی اس وقت نواب صاحب کے دربار میں تھا۔ آزاد اور خوجی کی پہلی ملاقات بھی یہیں ہوئی تھی۔ اور یہیں سے دوستی کا آغاز ہوا تھا۔

آزاد نے سوچا، اتفاق سے آئے ہوئے ہیں۔ نواب صاحب سے ملتے چلیں اور ان کے چہیتوں کا حال معلوم کرتے چلیں۔ مس میڈا اور مس کلیرسا کو ہوٹل میں چھوڑا اور گاڑی میں بیٹھ کر نواب صاحب کے دولت خانے پر آئے۔ ادھر وہ گاڑی

سے اترے۔ادھر خدمت گاروں۔دربانوں اور سپاہیوں نے شور مچایا کہ:

آزاد پاشا تشریف لائے ہیں۔۔۔میاں خوجی لو تمہارے آقا آ گئے۔

نواب صاحب اور ان کے سب ساتھی اٹھ کھڑے ہو۔دیکھا کہ آزاد پاشا رپ رپ کرتے ہوئے ترکی فوجی وردی ڈانٹے چلے آتے ہیں۔نواب صاحب نے جھپٹ کر مصافحہ کیا اور گلے سے لپٹ گئے۔

نواب: بھائی جان آنکھیں تمہیں ڈھونڈتی تھیں۔

آزاد: اللہ نے مجھے یہ سعادت دی کہ پھر آپ سے ملوں۔

خوجی: (آزاد سے) غلام بھی آداب عرض کرتا ہے۔

آزاد (ہاتھ ملا کر) واہ خواجہ بدیع الزمان۔

نواب: کیا خواجہ بدیع الزمان۔۔اجی خوجی کہیے۔۔آزاد میاں سنا آپ نے فرماتے ہیں، تین کروڑ آدمیوں سے تن تنہا مقابلہ کیا۔۔۔ارے بھئی حقہ بھر لاؤ۔آزاد پاشا کے واسطے۔سنا ہے شہنشاہ روس آپ سے ملنے آئے تھے۔اور آپ کرسی پر ہی بیٹھے رہے۔بھائی جان اب تم نے وہ درجہ حاصل کرلیا ہے کہ ہم حضور کہیں تو ہمارا فخر ہے۔

خوجی: حضور مورچے پر ان کو دیکھتے تو غش غش کر جاتے۔جیسے شیر کچھار میں دھاڑتا ہے۔

نواب: آزاد میاں، خوجی نے مصر میں کوئی کشتی لڑی تھی۔

آزاد: میرے سامنے تو دو چار نہیں دو چار ہزار بار البتہ مار ضرور کھائی ہے اور ایک بونے تک نے انہیں اٹھا کے دے مارا تھا۔عورتوں نے تھپڑ مارے۔

نواب: واہ بھئی خوجی واہ۔

آزاد: کیا یہ گپ اڑاتے تھے کہ انہوں نے کشتیاں لڑیں۔

مسیتا بیگ: اے حضور جب سے آئے ہیں، ناک میں دم کردیا ہے۔ گیدی نے بات ہوئی تو نکالوں قرولی۔ بٹیر کے برابر تو قد ہے اور دم خم۔

نواب: پرسوں تو کہتے تھے کہ مصر میں ہم نے آزاد کے برابر ایک پہلوان کو دم بھر میں آسمان دکھایا۔

آزاد: واہ آسمان دکھایا۔۔ ایک بونے تک نے گردن ناپی اور اٹھا کر دے مارا۔

نواب: اجی یہ ہمیشہ کا جوتیاں کھانے والا ہے۔

درباری (قہقہہ لگا کر) بجا ہے جناب اس میں ذرا شک نہیں ہے۔ اتنے میں نواب صاحب کے ہاں ایک منشی صاحب تشریف لائے۔

نواب: منشی صاحب آپ کو پہچانا۔

منشی: اخاہ جو رجنرل محمد آزاد پاشا صاحب ہیں، حضور بڑا نام پایا سبحان اللہ۔

آزاد: شکریہ جناب میں کس لائق ہوں۔

نواب: اجی کمشنر صاحب آپ کے مداح ہیں۔

خوجی: اجی جناب میدان کار زار میں آپ دیکھتے تو عش عش کر اٹھتے۔۔۔ گھوڑا دبایا اور لاکھوں آدمیوں کے لشکر میں دن سے موجود۔

منشی: آپ نے بھی بڑا ساتھ دیا خواجہ صاحب مگر آپ کی بہادری کا ذکر کہیں سننے میں نہیں آیا۔

خوجی: آپ ایسے گیدیوں کو میں کیا سمجھتا ہوں۔ میں نے وہ کام کیے ہیں کہ کوئی کیا کرے گا۔ ہاتھ میں قرولی لی اور صفوں کی صفیں صاف کردیں۔

نواب: بگڑ گئے حضور خواجہ صاحب۔

خوجی: قسم ہے حضور کے قدموں کی۔ ملکوں ملکوں گیا اور ہزار ہا آدمی دیکھے، مگر آج تک اس طرح کا بدتمیز دیکھنے میں نہیں آیا۔

آزاد: واقعی جو باتیں خواجہ صاحب نے دیکھیں، وہ کسی اور کو کہاں نصیب ہوئیں، اور بوا زعفران۔۔۔۔۔

خوجی: بوا زعفران۔۔۔لاحول ولاقوۃ۔۔۔۔

آزاد: (قہقہہ لگا کر) ہاں ہاں بوا زعفران کہو کہو۔۔۔

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے

جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے

خوجی: (ہاتھ جوڑ کر) واسطے خدا کے معاف کردو، واللہ نہ کہو۔ ہے ہے غضب ہوگیا۔

نواب: جناب آزاد صاحب۔ اس راز سے پردہ اٹھائیے، کیا ہوا بوا زعفران سے۔

خوجی نے دیکھا کہ اب رنگ نہیں جم رہا، آزاد صاحب جب تک نہیں آئے تھے تب تک تو خیر بعض بعض آدمی مان بھی لیتے تھے۔ مگر جب سے یہ آئے ہیں کوئی سمجھتا ہی نہیں کہ بک کیا رہا ہے۔ اور لطف یہ کہ میں تو آزاد کی تعریف کرتا ہوں اور یہ حضرت میرے ہی دشمن ہوئے جاتے ہیں۔ چنانچہ خوجی نے موقع پا کر

اپنی ٹوپی آزاد کے قدموں میں رکھ دی اور کہا:

برسوں تمہارا ساتھ دیا ہے بات تو سن لو۔

آزاد: آپ تو کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں، فرمایئے۔

خوجی: اس دربار میں میرے ذلیل کرنے سے اگر آپ کو کچھ حاصل ہو سکتا ہے تو جو جی چاہے کیجیے۔

آزاد: لاحول و لاقوہ۔ آپ تو میرے بزرگ ہیں۔

خوجی: (سر پیٹ کر) ہائے افسوس، عمر بھر ساتھ دیا، جان لڑا دی۔ اور اب اس دربار میں جہاں رزق کا سہارا ہے۔ آپ ہم کو الو بتاتے ہیں تا کہ روٹیوں سے جائیں۔

آزاد: اچھا بھئی اب جو چاہے کہو، ہم کچھ نہ بولیں گے۔

خوجی اس پر خوش ہو گئے کہ اب کے گپ کے پل باندھ دوں گا۔

نواب صاحب نے مسکرا کر کہا:

خوجی: بھئی یہ کیا سرگوشی ہو رہی ہے۔ کیا راز کی باتیں کی جا رہی ہیں۔

خوجی: خداوند ملکی معاملات پر بحث ہو رہی تھی۔

نواب: کیا ملکی معاملات کیسے؟۔

خوجی: حضور میری رائے یہ ہے کہ اس ملک میں بھی فلک ناز بلند کی طرح نہریں جاری ہونی چاہئیں۔ اور آزاد پاشا کی رائے ہے کہ نہروں کے ذریعے سے آب پاشی تو ممکن ہے، لیکن آب و ہوا خراب ہے۔

مسیتا بیگ: اخاہ تو یہ کہیئے کہ آپ شہر کے اندیشے میں دبلے ہو رہے ہیں۔ تم یہ

باتیں کیا جانو، پہلے یہ تو بتاؤ کہ بیٹری میں کتنی توپیں ہوتی ہیں۔ چلے وہاں سے جالینوس کی دم بن کر۔

نواب: ہم دیکھتے ہیں کہ گو پاگل ہے مگر کبھی کبھی باتیں بہت ٹھکانے کی کرتا ہے۔

آزاد: صاحب سفر بھی تو ایسا دور دراز کا کیا تھا، کہاں ہندوستان، کہاں روم،،، خیال تو کیجیے۔ وہاں گئے اور کچھ سیکھ آئے۔

خوجی: اور کیا۔ ہم سے تو عالم فاضل تو بہت کچھ سیکھتے آتے ہیں۔

میر صاحب: کیوں خواجہ صاحب پہاڑ تو آپ نے بہت سے دیکھے ہوں گے۔

خوجی: ایک دو۔۔ اجی کروڑوں، مگر جو لطف وہاں ہے۔ اس سے زیادہ اور کہیں نہیں ہو سکتا۔ بلندی کی یہ کیفیت کہ آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔

نواب: بھلا آسمان وہاں سے کتنی دور رہ جاتا ہے۔

خوجی: حضور کوئی ایک دن کی راہ ہے۔ مگر زینہ کہاں؟۔

نواب: اور کیوں صاحب وہاں سے تو بخوبی معلوم ہوتا ہوگا کہ مینہ ک سجگہ سے آتا ہے۔

خوجی: خداوند پہاڑ کی چوٹی پر میں تھا۔ اور مینہ نیچے برس رہا تھا۔ یہ ایک دفعہ ہی نہیں دیکھا، بلکہ سینکڑوں بار اوپر سے دیکھ رہے ہیں۔ کہ نیچے مینہ برستا ہے اور جہاں ہم ہیں۔ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔

نواب: کیوں صاحب کیا یہ سچ ہے۔ عجیب بات ہے بھئی۔

آزاد: جی ہاں پہاڑ کے نیچے بارش ہوئی اور ہم پہاڑ سے دیکھ رہے ہیں۔

مسیتا بیگ: اور یہ جو مشہور ہے کہ بادل تالابوں سے پانی پیتے ہیں۔

خوجی: یہ تم ایسے گدھوں میں مشہور ہوگا۔

نواب: (مسکرا کر) بدلہ نکالنے کا اچھا موقعہ ملا۔

مسیتا بیگ: جو زمانے بھر میں مشہور ہے کہ بادل پانی پی پی کے اڑتا ہے تو اس کے پروں سے پانی گرتا ہے۔

نواب: بھئی یہ لوگ تجربہ کار ہیں۔۔جو یہ بیان کریں وہ صحیح ہے۔

خوجی: اور حضور ہم نے دریا کے مخزن دیکھے ہیں۔

نواب: (زبان دبا کر) مخزن؟۔دریا کے مخزن۔

خوجی: ہاں حضور جہاں سے دریا نکلتا ہے۔عجب مقام ہوتا ہے۔دریائے ڈینیوب کا نام آپ نے سنا ہی ہوگا۔اتنا بڑا دریا ہے کہ سمندر اس کے مقابلے میں شرما جائے، اور مخزن جو جا کے دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔حضور اتنا بڑا دریا اور ایک رئیس کے دیوان خانے کے احاطے سے نکلا ہے۔

میر صاحب: ایں۔۔۔ہمیں یقین نہیں آتا۔۔سب غلط ہے۔۔

خوجی: یہ لوگ واللہ کنویں کے مینڈک ہیں۔

نواب: مکان کے احاطے سے۔۔جیسے یہ ہمارے مکان کا احاطہ ہے۔

خوجی: بلکہ اس سے بھی چھوٹا۔حضور خدا کی خدائی ہے، اس میں بندے کو کیا دخل ہے بے چارے کو؟۔

اور حضور ہم نے ایک مقام دیکھا کہ جس قدر شہر ہے۔سارا دریا کے کنارے

ہی آباد ہے۔اور صرف ایک قطار میں ۔اسی میں دکانیں۔اسی میں مکان۔اسی میں کوٹھیاں ۔اسی میں محل اور ایوان اور دریا کے اس باغ میں امیر غریب سب مزے اٹھاتے ہیں۔اور سامنے باغ لہلہاتے ہیں۔اور دوسری سمت جنگل اور فضا،،اور خداوند استنبول میں ایک جانور خانہ ہے۔

میر صاحب:تم کوتو کسی نے دھوکے سے اس میں بند نہیں کر دیا۔

خوجی:بس ان جانگلوؤں کو اور کچھ نہیں آتا۔

نواب:اجی تم اپنا مطلب کہو۔اس جانور خانے میں اور نئی بات کیا تھی؟۔

خوجی: خداوند ایک تو ہم نے بھینسا دیکھا۔بھینسا کیا ہاتھی کا بچہ تھا۔اور ناک کے اوپر ایک سینگ۔نہایت قوی ہیکل جانور۔اتفاق سے جس مکان میں بند تھا۔اس کی سلاخوں میں سے تین سلاخیں ٹوٹ گئیں۔اور وہ جناب سمٹ سمٹا کے نکلا تو بس کچھ نہ پوچھو۔ہوش اڑ گئے۔دو ہزار آدمی گدبد ہو گئے۔ایک کے اوپر دوسرا اور دس پر سو اس طرح گرے کہ بے ہوش۔کوئی چار پانچ سو آدمی زخمی ہوئے۔کسی کا ہاتھ ٹوٹا۔کسی کا منہ ٹوٹا۔کسی کا سر پھوٹا۔چوبیس آدمی جان سے گئے۔جب میں نے یہ کیفیت دیکھی تو سوچا۔اگر تم بھی بھاگے تو بڑی ہنسی ہوگی۔لوگ کہیں گے کہ سپاہی ہو کر بھاگ گئے۔ذرا سے ارنے بھینسے کو دیکھا۔گو ہزاروں آدمی بھاگے مگر ان میں اور ہم میں فرق تھا۔خیر قبلہ ایک دفعہ جھپٹ کے جو جاتا ہوں،تو گردن ہاتھ میں آئی۔بس بائیں ہاتھ سے گردن دبائی،اور دبوچ کے بیٹھ گیا۔پھر لاکھ لاکھ زور مارے اس نے اور بہت تڑپا۔مگر کیا مجال ہم نے ہلنے نہ دیا۔جتنے آدمی دور سے کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔سب

دنگ رہ گئے کہ واہ رے پہلوان۔ اور چوطرفہ سے تعریفیں ہونے لگیں۔ اتنے میں ہم نے ایک تھپڑ لگایا اور وہ تڑ سے گرا۔

مسیتا بیگ: اس کے کیا معنی کہ۔۔۔ تڑ سے گرا۔ آپ کے خوف کے مارے لیٹا تو تھا ہی۔ پھر لیٹے لیٹے کیوں کر گر پڑا۔

خوجی: بکتے ہو۔ بس حضور میں نے کان پکڑے تو اس طرح ہوا جیسے بکری۔

اسی کٹہرے میں پھر بند کر دیا۔

نواب: (آزاد سے) کیوں صاحب سچ ہے یہ روایت۔

آزاد: میں اس وقت موجود نہ تھا۔ شاید سچ ہی ہو۔

میر صاحب: بس بس قلعی کھل گئی۔ غضب خدا کا جھوٹ بھی بولا تو کتنا، اس کفر پر تو جی چاہتا ہے کہ اٹھا کے تھپڑ دوں۔ کہ دسگز زمین میں گڑ جائے، نامعقول ،، گینڈے سے تو پیچھے لڑے گا، پہلے ہم سے تو ہاتھ ملایئے۔ بڑے پہلوان بنے ہیں۔

خوجی: قسم ہے خدا کی، جواب کی کوئی کلمہ زبان سے نکالا تو اتنی قرولیاں بھوکوں گا کہ عمر بھر یاد رہے۔ تو اپنے دل میں سمجھا کیا ہے؟۔ یہ سوکھی ہڈیاں لوہے کی سلاخیں ہیں۔

نواب صاحب نے آزاد سے دریافت کیا۔

گو آپ اس وقت نہ ہوں، مگر یہ تو بتایئے کہ انسان اتنے بڑے جانور سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ بھلا؟۔

آزاد چونکہ خوجی سے وعدہ کر چکے تھے۔ کہ ان کا رنگ پھیکا نہ پڑنے دیں

گے، انھوں نے کہا۔

نواب صاحب بعض آدمیوں کو کمال حاصل ہے کہ ادھر جانور دیکھا۔ ادھر اسکی گردن پکڑی اور شہ رگ کو اس ترکیب سے دبایا کہ پھر جانور کسی کام کا نہ رہا۔ مگر خواجہ صاحب کو بھی یہ ترکیب معلوم ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ۔

نواب: بس اب ہم کو یقین آ گیا۔

مسیتا بیگ: جی ہاں کیا عجب ایسا ہی ہوا ہو۔

رفیق: صاحب بالکل درست ہے۔۔ جب نواب صاحب کے ذہن میں ایک بات آ گئی تو آپ کس کھیت کی مولی ہیں۔

ایک درباری: حق ہے یہی بات ہے بھائی جان۔

میر صاحب: اور جب ایک بات کی بنیاد دریافت ہو گئی تو پھر اس میں انکار کرنا کیا معنی؟۔

نواب: آزاد سے، کیوں صاحب جنگ میں آپ نے خوب نام پیدا کیا ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ کے ہاتھ سے کس قدر آدمیوں کا خون ہوا ہوگا۔

خوجی: غلام سے پوچھیے، انہوں نے کل ملا کر دو کروڑ آدمیوں کو تہہ تیغ کیا ہوگا۔

نواب: دو کروڑ۔ شاباش شاباش۔

خوجی: جب ہی تو روم اور شام ہتوران، ملتان، ابی سینا، جرمنی، آسٹریا، انگلستان، اور فرانس میں ان کا نام ہوا ہے۔

نواب: افوہ خوجی کو کتنے ملکوں کے نام یاد ہیں۔

آزاد: نواب صاحب ان کو وہ خوجی نہ سمجھے۔

خوجی: حضور میں نے ایک دریا پر، خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں۔۔۔ وہ کام کیا کہ ساری خدائی عش عش کر اٹھی۔ صرف تن تنہا میں نے ہزاروں آدمیوں کا مقابلہ کیا۔

نواب: لاحول ولا قوۃ، سب غلط۔ محض غلط۔

مسیتا بیگ: حضور تین حصے جھوٹ اور ایک حصہ سچ ہے۔

میر صاحب: ہم تو کہتے ہیں۔ سب ڈینگ ہے۔

آزاد: نواب صاحب۔ اس بات کی تو ہم بھی گواہی دیتے ہیں۔ اس جنگ میں میں شریک نہ تھا۔ مگر میں نے اخبار میں ان کی تعریف دیکھی تھی۔ اور وہ اخبار میرے پاس اب بھی موجود ہے۔

منشی: اخاہ خواجہ بدیع الزمان آپ ہی ہیں۔ میں نے ایک اردو اخبار میں اس کا ترجمہ دیکھا تھا۔

نواب: اب ہم کو یقین آ گیا۔ جب جنرل آزاد صاحب نے کہا۔ اور جب دوسرے صاحب نے گواہی دی تو صحیح ہے۔

خوجی: موقع ہی ایسا تھا۔ بجا ارشاد ہے۔

آزاد: نہیں نہیں بھئی تم نے تو واقعی ہی کمال کر دیا۔ مگر موقعہ ایسا اچھا ملا کہ اگر دس کروڑ بھی ہوتے تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ یہ آپ ہی کام تھا۔ کچھ اور بھی آپ نے بیان کیا ہے یا نہیں خواجہ صاحب۔

خوجی: حضور نے منع کر دیا تھا۔

نواب: کیا کیا۔ کیا ہم سے کچھ چوری کی بات ہے۔

آزاد: پیرومرشد۔ صف شکن علی شاہ وہاں ملے تھے۔

نواب: (بلند آواز سے) واہ لو صاحبو سنو۔ ارے میر اصف شکن علی شاہ۔

خوجی: جناب اس ڈانٹ ڈپٹ کا بٹیر بھی کم ہی دیکھا ہوگا۔

نواب: دیکھا ہی نہیں۔ کم کیسا۔

درباری: حق ہے۔ حق ہے۔ واللہ بہت صحیح بات ہے۔

نواب: ارے میاں غفور، ذرا گھر میں اطلاع کردو کہ صف شکن علی شاہ بخیریت ہیں، میدان جنگ میں ان کو لوگ دیکھ کر آئے ہیں۔

غفور: سرکار یہ کس نے کہا، یہ کس نے خوش خبری سنائی۔

نواب: ہمارے مہربان دوست آزاد پاشا نے۔

غفور ڈیوڑھی تک آیا۔ خدمت گار، دربان، چپراسی سب مل کر نواب کی سادگی پر کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

خدمت گار: ایسا الو کا پٹھا بھی کبھی نہ دیکھا۔

غفور: دیکھتے ہو پاگل ہے۔ واللہ نرا پاگل۔

چپراسی: ابھی دیکھیے تو کیا کیا حاشیے چڑھائے جائیں گے۔

ایک: اس میں کیا شک ہے میاں۔۔۔ ابھی جنگ میں شریک کیے جائیں گے۔

خوجی کی گپیں

غفور نے نوکرانی کو بلوا کر کہا:

"جا کے اندر کہہ دو کہ سرکار نے فرمایا ہے کہ ہمارے صف شکن علی شاہ خیریت سے ہیں اور روم کی جنگ میں لوگوں نے انہیں دیکھا ہے۔

نوکرانی نے ہنستے ہنستے اندر پیغام دیا۔

بیگم صاحبہ نے سنتے ہی قہقہہ لگایا اور کہا:

ان موؤں نے پھر نواب صاحب کو انگلیوں پر نچانا شروع کر دیا۔ جا کے کہہ دو کہ ذری ان کو یہاں بھیج دیں۔ بیگم صاحبہ کھڑی بلاتی ہیں۔

نواب صاحب کو اطلاع ہوئی تو آزاد سے اجازت مانگی۔

آزاد: بسم اللہ تشریف لے جائیے۔ سرکار نے یاد کیا ہے۔ خاکسار کی طرف سے آداب عرض کر دیجیے گا۔

نواب صاحب اٹھے، مگر کچھ سوچ کر بیٹھ گئے۔

نواب: حضرت جانے کو تو میں جاتا ہوں۔ وہ حالات دریافت کریں گی۔ آپ بھی پہلے کچھ بیان فرمائیے۔

مسیتا بیگ: حضور اس کا حال کیا پوچھتے ہیں۔ جنگ میں کوئی منہ تا کنے یا دل لگی بازی تو دیکھنے نہیں جاتا۔ سوائے اس کے کہ لڑے مرے اور مارے۔ بس اور عجب نہیں کہ جنگ کا حال سن کر دل میں عجب جوش پیدا ہوا ہو۔

نواب: بھئی کیا بات کہی ہے۔ بس یہی بات ہے۔

خوجی: حق ہے پیر و مرشد۔ اس وقت مسیتا بیگ کو خوب سوجھی ہے۔

آزاد: خواجہ صاحب سے اس کا حال دریافت کرلیں خوب واقف ہیں۔

خوجی: ان کا اور میرا بہت ساتھ رہا۔ ان کی انگریزی وضع سے دشمن بہت چکراتے تھے۔

نواب: بھلا کسی مورچے پر گئے تھے یا نہیں یا دور ہی سے سلام دعا کیے۔

خوجی: حضور غلام جو عرض کرے یقین نہ آئے گا۔ یہ آپ کے پاجی درباری مجھے جھوٹا بنائیں گے اور میں جھلاؤں گا۔

نواب: کیا مجال ہے خدا کی قسم اب تم میرے رفیق خواص ہوئے۔ تم نے جو تجربہ حاصل کیا ہے۔ بھلا دوسرا تمہارا مقابلہ کرسکتا ہے۔

خوجی: حضور کی ذرہ نوازی ہے۔ ورنہ میں کس قابل ہوں۔ حضور ایک روز کیا ہوا کہ میں چشمے کے کنارے افیم گھول رہا تھا۔ کہ اچانک درخت کی طرف جو نظر کرتا ہوں تو روشنی نظر آتی ہے۔ سوچا یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟۔ حیران ہو رہا تھا کہ یہ روشنی کہاں سے آئی۔ اچانک حضور صف شکن علی شاہ پھر سے آن کر ہاتھ پر بیٹھ گئے۔

نواب: شکر خدا۔۔ ہزار شکر۔ پھر کیا ہوا، بڑے خوش ہوئے ہوگے۔

خوجی: حضور یوں لگا جیسے کروڑوں مل گئے ہوں۔ دنیا بھر کی بادشاہت مل گئی۔ حضور کا حال بیان کیا۔ یہاں ذکر چھیڑا۔ بس حضور پھر تو یہ کیفیت تھی کہ کسی لڑائی میں دشمن کی فوج جم نہ سکی۔ جنگ ہوئی اور روسیوں نے توپوں پر بتی لگائی۔ ادھر میرے شیر نے کیل ٹھونک دی۔

نواب: ایں۔۔ہاہاہا۔واللہ اے میرے صف شکن علی شاہ۔

مسیتا بیگ: خداوند! جانور کیا جادو ہے۔

خوجی: بھلا اس کو کوئی بٹیر کہہ سکتا ہے۔اور جانور آپ خود ہیں۔ ایسا سخت اور نا ملائم لفظ ان کی شان میں استعمال کرتے ہیں۔نا معقول۔

نواب: مسیتا بیگ، اگر تم کو اچھی طرح رہنا ہے تو رہو ورنہ اپنے گھر کا رستا لو۔ اس کے معنی آج صف شکن کو جانور بنایا۔کل کو مجھے جانور کہو گے۔

درباری: خداوند بجا ارشاد ہوا۔یہ نرے پھوہڑ ہیں۔

خوجی: اگر کوئی دوسرا اس وقت جانور کہتا تو ٹکڑے ٹکڑے چیر کے رکھ دیتے۔نہ ہوئی قرولی۔اب سنیے حضور صف شکن کے کارنامے۔حضور خشکی پر تو ہر کوئی لڑ سکتا ہے۔مگر تری میں لڑنا سخت مشکل ہے۔سو حضور صف شکن تری کی جنگ میں اور بھی بڑھ کر رہے۔ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک چھوٹا سا دریا تھا۔اس طرف ہم اس طرف دشمن کا لشکر۔ دریا کے کنارے پر مورچہ بندی ہوگئی۔اور گولیاں چلنے لگیں۔اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ صف شکن موجود۔آتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک کنکری لے کر کچھ پڑھ کے اس زور سے پھینکی کہ ایک توپ پھٹ گئی۔اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔

نواب: ایں۔۔واہ واہ کیا کہنا صف شکن بہادر کا۔

مسیتا بیگ۔سبحان اللہ۔سبحان اللہ۔۔ذرا غور کا مقام ہے۔کہ ایک ذرا سی کنکر کا دانہ اور توپ کے بہتر ٹکڑے کر دیے۔

درباری: کیا کہنا۔اللہ رے کنکری۔

خوجی: ہونہہ کنکری۔۔اب سنیے کہ دوسری کنکری جو پڑھ کے پھینکی تو ایک اور توپ پھٹی اور بہتر ٹکڑے ہوئے،اور کوئی تین چار ہزار آدمی زخمی ہوئے اور مرے۔

نواب: اس کنکری کو ملاحظہ فرمایئے، کیا بلا کی کنکری تھی۔اللہ اللہ دوسو ٹکڑے توپ کے اور چار ہزار روسی زخمی و ہلاک۔خدا کی شان۔واہ رے میرے صف شکن، واللہ ہم نے تیری قدر نہ کی۔

خوجی: حضور چودہ توپیں اڑا دی گئیں،اور جتنے آدمی بیٹھے تھے۔سب زخمی ہو گئے۔حضور آج تک کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہوا۔ایک گولہ بھی پڑا ہوتا تو لوگ سمجھتے کہ شاید اس گولے میں کچھ سامان ہے۔کچھ مسالہ ہی ایسا تھا۔مگر ذرا سی کنکری تو کسی کو معلوم ہی نہ ہوئی۔

نواب: اور کیوں کر معلوم ہوتی۔ماش کے دانے کے برابر کنکری۔مگر بلا کی تھی۔کہ توپ کو اڑا دیا اور دو ہزار ٹکڑے کر ڈالے۔اور ہزار ہا آدمیوں کی جان لی۔اللہ رے کنکری کے کمال۔جادو ہے کہ کنکری ہے۔واہ بھئی۔۔۔ارے کوئی جا کے صف شکن کا پنجرہ تو لائے۔

اتنے میں نوکرانی نے آن کر پھر کہا کہ

حضور بڑا ضروری کام ہے۔بیگم صاحبہ نے پھر بلایا ہے۔

نواب صاحب خوجی کو ہمراہ لے کر زنان خانے کی طرف چلے۔کہ صف شکن کے کارنامے بیگم کو بھی سنوائیں۔خوجی کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔

نواب صاحب نے ان کو حکم دیا کہ:

پہلے تم ڈیوڑھی میں کھڑے رہو۔ میں بیگم صاحبہ سے دریافت کر کے بلواؤں گا۔

نواب صاحب نے جیسے ہی اندر قدم رکھا، بیگم نے قہقہہ لگایا۔

نواب: ایک تم ہی کیا۔ آج سارا زمانہ خوش ہے۔

بیگم: صف شکن علی شاہ اب کہاں ہے؟۔

نواب: واللہ مجھے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ جنگ میں بھی بجلی ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ صرف خانہ جنگی میں ہی استاد ہے۔ مگر اس نے تو جا کے توپوں میں کیلیں ٹھوک ٹھوک دیں۔ اللہ، اللہ۔ خدا جانے یہ سب کچھ سیکھا کس سے ہے۔

بیگم یہ خدا کی دین ہے، سیکھنے سے کہیں ایسی باتیں آتی ہیں۔

نواب: واللہ سچ کہتی ہو بیگم صاحبہ سچ ہے۔ اے غضب خدا کہ کہاں توپ اور کہاں کیل اور صف شکن۔ خیال تو کرو، سبحان اللہ، سبحان اللہ،

بیگم: اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو صف شکن کو ہزار پردوں میں چھپا کر رکھتی۔ کبھی ہوا بھی نہ لگنے دیتی۔ مگر اب تو جو ہوا سو ہوا۔ ہاں خوب یاد آیا، وہ تو جیتے جاگتے ہیں اور تم نے ان کا مزار بنوادیا۔ یہ کیا؟۔

نواب: واللہ خوب یاد دلایا۔ یہ تو مرنے سے پہلے بین کرنے والی بات ہے۔

بیگم: یہ تو صاف زیادتی ہے۔

نواب: واقعی۔ فرض کرو سیر کرتے ہوئے اسی طرف آ نکلے اور پڑھے لکھے تو ہیں ہی، نظر پڑ گئی مزار پر تو میاں صف شکن کیا کہیں گے، کہ یہ لوگ میری موت

چاہتے تھے، جوفوراً قبر بنوادی۔بہتر ہے کہ قبر کھدوادوں ۔ورنہ بری ہوگی۔اور ہاں بیگم سنو، ہمارا پرانا ساتھی خواجہ بدیع الزمان جس کو ہم لوگ خوجی کہتے ہیں، جنگ کے میدان میں صف شکن سے ملا تھا۔اگر اجازت ہوتو یہاں بلا لوں۔پھراس کی زبان سے ان کا حال سننا۔دیکھوتو کہتا کیا ہے؟۔

بیگم : اوئی جہنم میں جائے موا۔اور سنو، اس افیمی کو گھر کے اندر بلائیں گے۔واہ ہم ایسا حال سننے سے درگزر رے۔

نواب: سن تو لو۔اول تو بوڑھا۔پیٹ میں آنت نہ منہ میں دانت، دوسرے معتبر تیسرے آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔اچھا چلو وہ ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر واقعات سنائے۔

بیگم: ہاں اس کا مضائقہ نہیں۔مگر میں ان موئے خوشامدیوں سے جلتی ہوں۔

نواب: خواجہ صاحب: ارے میاں خوجی؛

دربان: خواجہ صاحب، خواجہ صاحب! دیکھو سرکار کیا فرماتے ہیں۔

خوجی: (افیم کے نشے سے چونک کر) جی پیرومرشد، حکم جناب۔

نواب: بھئی ذرا صف شکن علی شاہ کا حال تو کہہ چلو۔

خوجی: خداوند اب آنکھیں تو کھلوا دیجیے۔

نواب : پہلے حالات تو بیان کرو۔ذرا توپ والا ذکر خیر چھیڑو۔یہاں کسی کو یقین ہی نہیں آتا ہے۔

نواب:

خوجی: حضور یہ ہوا کہ دریا کے دونوں طرف آمنے سامنے گھوڑ چڑھی توپیں اور

سپاہی بندوقیں لیے گولیاں چلا رہے تھے۔ بس صف شکن نے کنکری اٹھا کے خدا جانے کیا جادو پھونک دیا کہ ادھر کنکری پھینکی اور ادھر توپ کے دو سو ٹکڑے، اور ہر ٹکڑے نے سو سو روسیوں کی جان مار دی۔

بیگم۔ اس جھوٹ کو آگ لگے۔ افیم پی پی کے نگوڑوں کو کیا کیا سوجھتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے ایک کنکری سے دو سو ٹکڑے ہو گئے۔ اوئی خدا کا ڈر ہے ہی نہیں۔

نواب: انھیں یقین ہی نہیں آتا تو اس کا کوئی کیا کرے۔

بیگم: جھلا کے چلو بس خاموش رہو۔ کاہے کو یقین آئے، ذرا سا موا بٹیر اور کنکری سے اس نے توپ کے دو سو ٹکڑے کر ڈالے۔ اللہ جانتا ہے اپنا علاج کراؤ۔

نواب: اب خدا جانے ہم پاگل ہیں یا تم۔

خوجی: حضور بحث سے کیا فائدہ۔ عورتوں کی سمجھ میں یہ باتیں نہ آئیں گی۔ حضور یہ بے چاریاں کیا جانیں ان باتوں کو۔

بیگم: (خادمہ سے) محبوبن، دربان سے کہو اس نگوڑے خوشامدی کو جوتے مار کے نکال دے۔ خبردار جو کبھی اس کو ڈیوڑھی میں آنے دیا۔

خوجی: سرکار تو خفا ہو رہی ہیں ناحق۔

بیگم: میں کہیں آج اسے قتل نہ کر ڈالوں۔ اے دربان، او محبوبن کھڑے سنتے کیا ہو؟۔

محبوبن: (دربان سے) حسینی اس مونڈی کاٹے کو کان پکڑ کے تھپڑ مارتا ہوا لے جا۔

خوجی: بس بس کان وان کی دل لگی اچھی نہیں ہے۔

محبوبن (چپت لگا کر) اب چلتا ہے یا نہیں۔

خوجی: (ٹوپی زمین سے اٹھا کے) اچھا آج اگر تم جیتی بچ جاؤ تو کہنا۔ ابھی ایک تھپڑ دوں تو دم ہی نکل جائے۔۔۔

اتنا کہنا تھا کہ دوسری نوکرانی نے بھی کان پکڑ کے میاں خوجی کو خوب مارا۔ یہ آگ بھبھوکا ہو گئے مگر سوچے کہ نواب صاحب نے تو آج تک اس قدر اعزاز بخشا ہے۔ اگر سب لوگوں کو پتا چل گیا کہ محبوبہ کی جوتیاں کھائیں تو بات بے ڈھب ہو گی۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ خاموش رہو۔ چنانچہ مار کھا کر اور جھاڑ پونچھ کر باہر آئے۔ برف کا ٹھنڈا پانی پیا۔ ٹھنڈے ہوئے، پان کی گلوری منہ میں رکھی اور لیٹ گئے۔

اب ادھر کا حال سنیے بیگم نے نواب صاحب کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

دانت پیس کر کہا۔

بیگم: ذرا سوچو تو کہ تم کو کیا ہو گیا ہے۔ کہاں بٹیر کہاں توپ۔ کہاں جنگ، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کہیں بلی کھا گئی ہو گی یا انھی خوشامدیوں میں سے کسی ایک نے نکال کے بیچ لیا ہو گا۔ اور آپ کو پٹی پڑھا دی کہ وہ تو صف شکن علی شاہ تھا۔ وہ ہنستے تھے، نماز پڑھتے تھے۔ یہ کسی طرح خوشامدی یہاں سے نکالے جائیں تو گھر کا انتظام ہو۔ آخر تم اپنے کسی دوست سے تو پوچھو۔ دیکھو اور لوگوں کی کیا رائے ہے۔ اس سلسلے میں۔ افسوس ان درباریوں موئے خوشامدیوں پر آسمان پھٹ پڑے۔۔ انھوں نے کہیں کا نہ رکھا۔

نواب: خدا کے لئے میرے ان مصاحبوں کو برا بھلا نہ کہو اور نہ کوسو۔ مجھے چاہے برا بھلا کہہ لو مگر ان بیچارے جان نثاروں کے بارے میں ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو۔

بیگم: اللہ ان موئے مفت خوروں سے سمجھے اور کیا کہوں۔

نواب: خدا کے لئے آہستہ کہو۔ کہیں وہ سن نہ لیں۔ اگر وہ ناراض ہو کر چلے گئے تو میں اکیلا مکھیاں ہی مارا کروں گا۔

بیگم: اتنے غیرت والے نہیں ہیں یہ لوگ، تم تو انہیں جوتیاں مارکر بھی نکالو گے تو چوں نہ کریں گے۔ اور اس ڈر کو تو دیکھو۔۔ ہے ہے۔۔ کوئی سن نہ لے۔۔ اللہ کرے کل جاتے ہوں تو آج ہی جائیں۔

نوکرانی: (آہستہ سے) حضور ذرا اس موئے خوجی کی کہانی تو سنی ہو گی اور جو ذری آپ ہاں ہاں کرتی جائیں تو زمین اور آسمان کے قلابے ملا دے۔

بیگم: اچھا اسکو بلاؤ تو ذری، کہو صف شکن کی ساری کہانی کہہ سنائے۔ لیکن ادھر اس نے جھوٹ بولا ادھر میں آگ بھبھوکا ہو گئی۔

نواب: یا خدا یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ وہ جھوٹ ہی بولے گا۔ اتنے دن سے ہمارا ساتھی ہے۔ کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اب ہی جھوٹ بولنے لگے۔ اور آ کر اتنا تو سمجھو کہ جھوٹ بولنے سے اسے کیا مقصد مل جائے گا۔

بیگم: اچھا بلاؤ تو میں سنوں تو، صف شکن نے کیا کیا سامان کیے ہیں۔

مہری نے باہر جا کر خوجی کو بلوایا۔

خوجی جھلائے ہوئے چھپر کھٹ پر پڑے تھے۔ کہا:

جا کے کہہ دو، اب ہم وہ خوجی نہیں رہے، جو پہلے تھے۔نوکرانی بے چاری خوشامد کر کے کہا۔:

اے خواجہ صاحب سرکار یاد کرتی ہے۔اور تم نہیں چلتے ۔حضور بھی بلا رہے ہیں۔

لوگوں نے سمجھایا۔

داروغہ نے خوشامد کی۔

آزاد نے بھی کہا۔

آخر خواجہ صاحب ڈیوڑھی میں آئے۔

نوکرانی: حضور خواجہ صاحب ڈیوڑھی میں تشریف رکھتے ہیں۔

خوجی: حضور آداب عرض کرتا ہوں۔۔کیا پھر کچھ مہربانی کی نظر غریب پر ہو گی۔ابھی کچھ انعام باقی ہو تو اور مل جائے۔

بیگم: اگر ذرا بھی جھوٹ بولے گا تو تو جائے گا۔صف شکن کا حال بیان کر مگر سچا سچا۔ذرا بھی جھوٹ کا نام نہ ہو خبر دار۔

خوجی: واہ ری قسمت، ہندوستان نے بمبئی گئے ۔وہاں ہمیں سب کے سب حضور حضور کرتے تھے۔

بیگم: اب بتاؤ۔۔ہے پکا افیمی یا نہیں، کام کی بات نہیں کرے گا۔

خوجی: حضور ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پہاڑ کیا وپر تو روسی اور نیچے ہماری فوج، اور ہمیں معلوم نہیں کہ روسی موجود ہیں۔ہم نے پہاڑ کے دامن میں پڑاؤ کرنے کا حکم دیا۔سپاہیوں اور سواروں نے وردیاں اتاریں اور کھانے پینے کی فکریں ہونے

لگی۔ اتنے میں ایک سوار نے چونک کر کہا۔۔ روسی روسی ۔۔ پہاڑ پر روسی ہیں۔ بس بلڑ مچ گئی۔ سب کی نظریں چوٹی کی طرف۔ دو چار آدمیوں نے کہا۔ بھئی عجب دل لگی باز آدمی ہیں۔ خواہ مخواہ ڈراتے ہیں روسی یہاں کہاں؟۔ پہاڑ بالکل صاف ہے، اور روسی آتے تو کہاں سے آتے۔ پھر سب کے سب اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ میں ایک ندی کے پاس بیٹھا افیم گھول رہا تھا۔

بیگم: وہ تو گھٹی میں پڑی تھی۔ افیم کہاں چھوٹتی۔

نوکرانی: مرتے دم بھی یہ افیم افیم ہی پکارے گا۔

محبوبن: حضور ان کو تو میں نے کئی بار صبح سویرے آگ کے ٹھیکرے کے پاس پڑا ہوا دیکھا ہے۔ چمٹا ایک ہاتھ میں اور حقے کی چلم دوسرے ہاتھ میں۔ تو ا کہیں تمباکو کہیں۔

نوکرانی: اور باتیں کیسی تول تول کے کرتے ہیں کہ کوئی جانے جیسے بڑے وہ ہیں۔

خوجی: باتوں میں اور کام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

بیگم: خیر تم اپنی کہانی شروع کرو۔

خوجی: میں مزے مزے افیم گھول رہا تھا۔ اور افسر، سوار اور پیادے سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ کہ پہاڑ پر سے تالیوں کی آواز آئی۔ یا الٰہی یہ تالیاں کس نے بجائیں۔ سب کے سب پھر غور سے دیکھنے لگے۔ میں پیالی ہونٹوں تک لے گیا تھا کہ اوپر سے روسیوں نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ کوئی چار سو بندوقیں ایک ہی بار چلائی گئی تھیں۔ آدھے آدمی زخمی اور ہلاک ہوئے۔ مگر واہ رے میں

خدا گواہ ہے پیالی ہاتھ سے نہ چھوٹی۔اب سنیئے کہ فوراً صف شکن علی شاہ موجود۔ اور میرے ہاتھ پر بیٹھ کر چونچ کو افیم سے تر کیا۔اور زور سے چونچ جو کھولی تو دو قطرے سیدھے پہاڑ کی چوٹی تک پہنچے،اور پہاڑ جو پھٹا تو خوفناک آواز آئی۔لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارا ایک بھی آدمی ہلاک نہ ہوا۔بس میں نے صف شکن ک امنہ چوم لیا۔اب ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ہزار ہا روسی مرا ہوا پڑا ہے۔سارا سازو سامان بھی تباہ۔کہاں پہاڑ کی چوٹی کہاں افیم کے دو قطرے۔خدا جانے کیا بات تھی۔کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔اور لطف کی بات یہ کہ ان سے جو ہاتھ جوڑ کے پوچھا تو مسکرا کر خاموش ہو رہے۔میں نے پوچھا کہ اگر تم کو کبھی کوئی روسی گرفتار کر کے لے جائے تو تم کیا کروگے۔بولے ہمیں گرفتار کرنے کی کس میں طاقت ہے۔

بیگم:صف شکن باتیں کس زبان میں کرتے ہیں۔اسی زبان میں نا!

خوجی: حضور ایک زبان ہو تو میں عرض کروں۔اردو ،فارسی،عربی،ترکی، انگریزی،واندیزی اور۔۔۔

بیگم:قہقہہ لگا کر انگریزی تو انگریزی مگر واندیزی بھی بول سکتے ہیں۔یہ کس ملک کی زبان ہے،شاید اسی طرف کوئی ملک ہوگا روس کے آس پاس۔

خوجی:اب حضور کو کون یقین دلائے؟۔

نواب:اب یقین آیا یا اب بھی نہیں آیا۔۔اف ری بدگمانی۔

بیگم:چلو بس چپکے بیٹھے رہو۔خدا گواہ ہے کہ مجھے رنج ہوتا ہے کہ ان جیسے حرام خوروں کے پاس بیٹھ بیٹھ کے تمہیں ہو کیا گیا ہے۔کچھ سمجھ میں نہیں آتا،یا اللہ کس

سے کہوں۔

نواب: ہائے افسوس غضب کا سامنا ہے۔آخر یہ سب کے سب تم سے جھوٹ کیوں بولیں گے۔خوجی کو میں کچھ انعام دیتا ہوں یا جاگیر لکھ دی ہے اس کے نام کہ بیگم صاحبہ کو جھوٹی کہانیاں سنایا کرو۔

خوجی: حضور اگر اس میں ذرا شک ہو تو خدا مجھے غارت کرے۔جھوٹی بات کبھی زبان سے نہ نکلے گی۔چاہے کوئی مار ڈالے۔مگر بولوں گا سچ ہی۔

بیگم: ایمان سے کہنا کبھی مورچے پر جانے کا اتفاق بھی ہوا ہے یا جھوٹ موٹ فقرے ہی سنایا کرتا ہے۔

خوجی: ہنس کر حضور مالک ہیں۔آقا ہیں جو چاہے فرمالیں مگر غلام نے جو بات اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے وہی بیان کی ہے۔اس میں اگر فرق ہو تو پھانسی دے دیجیے۔

ایک بوڑھی نوکرانی جو ضعیف الاعتقادوں کی نانی تھی ۔خوجی کی کہانی سن کر بولی:۔

نوکرانی! سرکار آپ کو اس میں تعجب ہی کیا ہے۔ہمارے محلے میں ایک کتا رہتا تھا۔بہت بڑا کتا۔کالا بالکل کالا۔محلے کے لڑکے بالے، چھوٹے بڑے سب اس کو جانتے تھے۔لڑکے کان پکڑا کرتے تھے۔دق کرتے تھے۔مارتے تھے۔مگر وہ ذرا چوں نہیں کرتا تھا۔ایک دن پڑوس کے چوکیدار نے اسکو زور سے ڈھیلا مارا تو کان سے خون بہنے لگا۔کتا اٹھا اور آنکھیں نیلی نیلی کر کے بھونکنے لگا۔چوکیدار نے پھر چاہا کہ ڈھیلا مارے۔مگر ایک جوگی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ بس کیوں

جان کا دشمن ہوا ہے۔ بابا یہ کتا نہیں ہے۔ اسی رات چوکیدار نے خواب میں دیکھا کہ کتا اس کے پاس آیا اور اپنا زخم دکھا کر کہا اب یا تو نہیں یا ہم نہیں۔ سویرے جو چوکیدار اٹھا تو اس نے پاس پڑوس والوں سے خواب کا ذکر کیا۔ اب محلے بھر میں ڈھونڈ مارا کتے کا کہیں پتا ہی نہیں۔ دوپہر کو چوکیدار کنوئیں پر پانی بھرنے گیا اور پانی دیکھتے ہی کتے کی طرح بھونکنے لگا۔

بیگم: ہے ہے۔۔سچ؟۔۔کتے سے تو ہم بھی بہت ڈرتے ہیں۔

نوکرانی: حضور اللہ بچائے اس بلا سے ۔دشمن کے بھی کتا نہ کاٹے تو بہ ہی بھلی۔ اس طرح کی موت کسی کو بھی نصیب نہ ہو۔

پہلی نوکرانی: حضور کتے کے بھیس میں نہ جانے کیا ہوتا ہے۔حضور اس کے بعد شہر بھر میں اس کتے کی تلاش کرائی گئی۔لیکن کہیں نہ ملا۔ دو دن میں چوکیدار کی عجب حالت ہوگئی۔ جوگی نے آن کر کہا: بچہ ہم نے تو دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ کیا جانے کون ہے؟۔پھر لاکھ لاکھ علاج کیا نہ اچھا ہونا تھا نہ ہوا۔چوتھے روز تڑپ تڑپ کر اور بھونک بھونک کر مر گیا۔

نواب: اس کو کیا کہو گی۔ اب بھی صف شکن کے کمال کو نہیں مانو گی؟۔یہ تو بات ہی اور ہے۔

بیگم: ہاں ایسی باتیں تو ہم نے بھی سنیں ہیں مگر۔۔۔۔

خوجی: اگر مگر کی گنجائش نہیں حضور ۔میں تو آنکھوں دیکھا بیان کر رہا ہوں ۔ ایک اور واقعہ سنیئے۔ اس کا بھی شاید آپ کو یقین نہ آئے۔صف شکن میرے سر پر آن کر بیٹھ گئے اور کہا: روسیوں کی فوج میں گھس جاؤ ۔میرے تو ہوش اڑ گئے

۔میں نے کہا صاحب میری جان جائے گی۔آپ کے نزدیک دل لگی ہے۔لیکن وہ نہ مانے،مجبوراً جانا پڑا۔مگر مجھ سے کہہ دیا تھا کہ خبردار کسی سے چھو نہ جانا۔ورنہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی تمہیں دیکھ سکے۔میں چل پڑا اور حضور صف شکن سر پر جمے بیٹھے رہے۔ہزار ہا کی فوج تھی،جس میں ہم گھس گئے۔ہم سب کو دیکھتے تھے۔مگر ہمیں کوئی نہ دیکھتا تھا۔جناب صف شکن مجھے روسیوں کے اصطبل کی طرف لے چلے۔اور پھدک پھدک کر ہر گھوڑے کی گردن پر بیٹھنے لگے۔جس پر بیٹھے تڑپ تڑپ کر مر گیا۔حضور سات ہزار گھوڑے دھم دھم کر کے لوٹ گئے۔اس کے بعد ہم واپس چلے آئے۔جب وہاں سے دور پہنچ گئے تو بڑی ہنسی ہوئی۔حضور صف شکن صاحب ہم سے باتیں کرنے لگے۔

صف شکن شاہ: کہو آج کی دل لگی دیکھی۔کتنے سوار گھوڑوں کے بغیر بے کار ہوئے۔

ہم:حضور پورے سات ہزار ایک کم نہ ایک زیادہ۔

شاہ صاحب: چلتے جاؤ اور دیکھتے جاؤ۔جب تھک جاؤ تو ہمیں بتا دینا۔

ہم:واہ آپ سے کیوں کہوں،آپ کیا کریں گے بھلا؟۔

شاہ صاحب:اگر تھک جاؤ تو ہم نیچے اتر جائیں گے۔

ہم (قہقہہ لگا کر) مٹھی بھر کے آپ ہیں اور دعویٰ یہ ہے کہ اگر ہم تھک جائیں خدا کی شان آپ کیا اور آپ کا بوجھ کیا۔بس صاحب میرا اتنا کہنا تھا کہ

خدا جانے کیا جادو کیا۔میرا قدم اٹھنا محال ہو گیا۔چلا ہی نہیں جا رہا۔الٰہی کیا کیا جائے۔کہا حضور اب تو بہت ہی تھک گئے۔فوراً پھر سے اڑ گئے۔تو یہ معلوم ہوا

کہ جیسے دس بیس کروڑ من کا بوجھ تھا، جو اتر گیا۔

شاہ صاحب: کہو بڑے بول کا سر نیچا:

ہم: ہاں صاحب بڑے بول کا سر نیچا۔

نواب: واللہ مجھے اس قدر باتیں نہیں معلوم تھیں۔ یہ تو نئی نئی باتیں معلوم ہوتی جاتی ہیں۔ واہ رے صف شکن۔ واللہ یہ تو کرامت کا درجہ رکھتا ہے۔

خوجی: خدا جانے کس بھیس میں کون ہے؟۔ اب ایک اور بھی سنیے ایک ہندو جوگی بھی وہاں ملا تھا۔ اس نے یوں سجدہ کیا جیسے وہ اپنے بتوں کو سجدہ کرتے ہیں۔ میں نے کہا واہ صاحب اب تو تم جانوروں کو سجدہ کرنے لگے۔ جان ور تم خود ہو۔ جو ان کو جانور کہے۔ خود جانور ہے۔ ان کی عظمت کا حال کوئی ہم سے پوچھے۔

نواب: اللہ اللہ: پیر فقیر تک ان کی عظمت کے قائل ہیں۔

خوجی: ایک بار اڑتے اڑتے جھپٹے اور مجھے چونچ سے اٹھالیا۔

نواب ایں، ارے میاں صف شکن نے۔ میرے صف شکن نے۔ شاباش، واہ رے صف شکن۔

خوجی: حضور یہ دیکھ کر میں تو دھک سے رہ گیا۔ اور اس دن سے پھر تم کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

خوجی کے مزے

بیگم کو نواب صاحب کی سادگی اور خوجی کی بے سروپا کہانی سے نفرت سی ہو گئی۔اس وقت تو کچھ نہ کہا، مگر ارادہ کرلیا کہ اکیلے میں نواب صاحب کو پوچھیں گی۔

نواب صاحب اور خوجی باہر آئے۔نواب صاحب بڑے خوش تھے۔

خوجی سے کہا:

شاباش۔۔واللہ تم نے ایسا سماں باندھا کہ اب بیگم صاحبہ کو عمر بھر شک نہ ہوگا۔اور صف شکن کی باتیں یاد کر کرکے عش عش کریں گی۔

خوجی: حضور غلام نے یہ سب واقعات آنکھوں دیکھے عرض کیے ہیں۔

نواب: اس میں کیا شک۔۔بھئی ہم انسان کو خوب پہچانتے ہیں۔آدمی کا پہچاننا کوئی ہم سے سیکھے، ایک نظر میں کھوٹا کھرا پہچان لیں گے۔مگر دو کو ہم نے بھی نہیں پہچانا۔ایک تم کو دوسرے صف شکن کو۔واللہ اس مقام پر ہم سے بھی بھول ہو گئی۔

خواجہ صاحب سے نواب صاحب اس قدر خوش ہوئے کہ ہاتھ میں ہاتھ دے کر باہر آئے۔درباریوں، خوشامدیوں نے جو اس قدر بے تکلفی دیکھی تو جل مرے اور آپس میں اشارے ہونے لگے۔سبھی نے اٹھ کر تعظیم کی۔نواب صاحب تو خوجی کا ہاتھ پکڑ کر ٹہلنے لگے۔اور ادھر آپس میں سرگوشی ہونے لگی۔

مسیتا بیگ: ایں ارے خوجی میاں نے تو جادو کر دیا۔

غفور: میاں یہ باہر کہیں سے سیکھ آئے ہیں جادو۔

مسیتا بیگ: تجربہ کار ہو گیا ہے نا، اب اس کا رنگ جم گیا ہے۔

غفور: بس اب سولہ آنے کے مالک ہیں میاں خوجی۔

مرزا: ارے میاں ہاتھ میں دے کر ہاتھ نکلے۔ گویا لنگوٹیے یار ہیں۔۔ واواہ ری قسمت۔ مگر آخر یہ خوش کس بات پر ہوئے۔

ایک درباری: انھیں ابھی تک یہی معلوم نہیں ہوا۔

مسیتا: میاں عجب کوڑھ مغز ہو۔ پوچھتے ہیں خوش کس بات پر ہوئے۔ صف شکن کی تعریف کے پل باندھ دیے۔ اب لاکھ رنگ پھیکا کرنا چاہیں، ممکن نہیں۔

درباری: بھائی جان ہم کو بھی ایسا موقعہ ملتا تو ہمارا بھی رنگ جم جاتا۔ وہ تو ولایت ہو آئے جو جھوٹ سچ سرکار کو کہہ دیں یقین آ جائے گا۔ اور واللہ صف شکن ہی کے پھیر میں میاں آزاد بھی اونٹنی اور اسباب لے کر رفو چکر ہوئے تھے۔ اور اسی پھیر میں خوجی بھی پیچھے گئے تھے۔ اور وہی دونوں اب پھر موجود ہیں۔۔ اور یہ قدر افزائی ہو رہی ہے کہ خوجی اور نواب صاحب یار چے بنے باغ میں ٹہل رہے تھے۔

مرزا: اس وقت خوجی کا دماغ چوتھے آسمان پر ہوگا

درباری: اجی بلکہ اس کے بھی پار۔ ساتویں آسمان پر۔

غفور: میں باغ میں گیا تھا۔ نواب صاحب مونڈھے پر بیٹھے ہیں اور خوجی تپائی پر۔۔ اور خاص سرکار کی گڑگڑی خوجی پی رہے ہیں، رحیم بخش بیٹھا پلا رہا تھا۔ یہ وہی خوجی ہیں یا کوئی اور۔؟۔

مرزا: ارے میاں خوجی کو خدمتگار حقہ پلا رہا ہے۔

غفور: چل کر دیکھ لیجیے نا۔ بس جادو کر دیا۔ ورنہ آج تک کبھی سرکار نے ان کے ہاتھ میں ہاتھ کیوں نہ دیا۔ نہ آج تک کبھی اپنا حقہ دیا تھا۔ وہی خوجی ہیں جو چلمیں بھرا کرتے تھے۔ یا کوئی اور ہے۔ مگر جادو کا زور ہے۔ جادو برحق ہے کرنے والا کافر ہے۔

درباری: خوجی ک وسب مل کر مبارک باد دو۔ اور ان سے دعوت لو کہ اب اس سے بڑھ کر اور کون سا درجہ ہے کہ سرکار کے لنگوٹیے یار ہو گئے۔ کل تک بات بات میں للکارے جاتے تھے۔ آج ساتھ بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ واللہ اس مقام پر عقل کام نہیں کرتی۔ اتنے میں نواب صاحب خوجی کو لیے ہوئے دربار میں آئے۔ درباری اٹھ کھڑے ہوئے۔ خواجہ صاحب کو سرکار نے قریب بٹھایا۔ اور آزاد سے کہا۔

نواب: جنرل صاحب آپ کی صحبت اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔ خوجہ صاحب تو عالم ہو گئے۔ آزاد: جناب آپ ہی کی صحبت ک اثر ہے۔ کیوں کہ یہ تو برسوں آپ کے پاس رہے ہیں۔

نواب: واہ اب تو خواجہ صاحب میرے استاد ہیں جناب۔

مسیتا: نہیں خداوند۔ خوجی کی آپ کے مقابلے میں کیا حقیقت ہے بھلا۔۔ لاحول ولاقوۃ۔ خواجہ صاحب بھی کوئی چیز ہیں۔

نواب: (جھڑک کر) کیا بکتا ہے، تم لوگ جل مرتے ہو جب ہم خوجی کی تعریف کرتے ہیں۔

درباری: بجا ہے حضور۔۔ یہ مسیتا بیگ تو ہمیشہ کے لئے حاسد ہیں۔

مرزا: اجی پرلے درجے کے حاسد ہیں۔ ان کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔

ایک درباری: آخر خواجہ صاحب نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کا باپ مارا ہے۔ کوئی نقصان پہنچایا ہے۔ پھر یہ کیوں ان کے اس قدر خلاف ہیں۔

نواب: مجھ سے سنو صاحب، مجھ سے سنو۔ بس اللہ واسطے کا بیر ہے۔

درباری: سبحان اللہ حضور۔ واللہ بس یہی بات ہے۔ انھیں اللہ واسطے کا بیر ہے۔

خوجی: بس حضور اس کا خیال نہ کریں۔ جو چاہے کہہ لیں۔ بھئی غفور ذرا سی پانی پئیں گے، جلدی لاؤ۔

نواب: ٹھنڈا پانی لاؤ جناب خواجہ صاحب کے واسطے۔

خدمت گار صراحی لایا۔ چاندی کے برتن میں پانی دیا۔ رومال لے کر پاس کھڑا رہا ہے۔ خواجہ صاحب نے پانی پیا۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ نواب صاحب نے دو پان کی گلوریاں خواجہ صاحب کو اپنے ہاتھ سے دیں۔

مرزا: اور میں نے حضور مسیتا بیگ سے ہزار بار کہا ہے۔ کہ بھئی تم کسی کو دیکھ کر جلے کیوں مرتے ہو۔ کوئی تمھارا حصہ نہیں چھین لے جاتا۔ پھر خواہ مخواہ ایک تو اپنی طبیعت کو ہلکان کرتے ہو، دوسرے ذلیل ہوتے ہو۔

نواب: مجھے اس وقت ان کی بات سخت ناگوار گزری ہے۔

درباری: حضور بات ہی کچھ ایسی تھی۔

اس کے بعد نواب صاحب، آزاد اور میاں خوجی تینوں الگ ہو کر بیٹھے۔

نواب صاحب نے آزاد سے کہا کہ:

وہ انھیں یورپ کے نوابوں اور رئیسوں کے طور طریقے بتائیں، تاکہ وہ بھی ان پر عمل کر کے ناموری حاصل کر سکیں۔

آزاد: اگر آپ ان کے نقشِ قدم پر چلیں تو سبحان اللہ۔

نواب: چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میں ان کے طور طریقوں پر ضرور عمل کروں گا۔

سب سے پہلے تو اپنے دربار سے چانڈو باز، چرسیے، بھنگ پینے والے سب نکال باہر کیجیے۔

نواب: خواجہ صاحب کے سوا سب کو نکال دوں گا۔

آزاد: اس کے علاوہ اپنا رہن سہن بھی تبدیل کیجیے۔ آپ دن کو گیارہ بجے سو کے اٹھتے ہیں، تو وجہ کیا ہے۔ وجہ یہ کہ جب دو بجے آپ بستر پر گئے تو صبح سویرے آنکھ کیوں کر کھلے۔ یہی حال آپ کے دوسرے معمولات کا ہے۔ آئندہ سے یوں کیجیے، صبح سویرے اٹھیے، حمام کیجیے۔ ورزش کیجیے۔ اس کے بعد سیر کے لئے نکل جایئے۔ پھر ناشتہ کریں اور عالموں فاضلوں، پڑھے لکھوں کی محفل میں بیٹھیے۔ اس کے بعد کوئی کتاب دیکھیے۔ دو گھڑی آرام کر کے چار بجے پھر دربار میں آجائیں۔ ضروری کام دیکھیے، کاغذات کو ملاحظہ کیجیے۔ پھر شام کی سیر کے لئے نکل جایئے۔

نواب: خدا کی قسم کیا باتیں بتائیں۔ بس آج سے ان پر عمل کروں گا۔

ادھر سنیئے: نواب صاحب، خوجی اور آزاد کا تنہائی میں ملنا سب درباریوں کو

سخت نا گوار گزرا۔ حسد کی آگ میں سب جل مرے۔

مسیتا بیگ: آج تو واللہ اپنا خون پی کے رہ گیا یارو۔

مرزا: دیکھتے ہو نواب صاحب نے کس طرح جھڑک دیا۔

مسیتا: جھڑک کیا دیا۔ میں بس خاموش رہا، ورنہ بے ڈھب ہو جاتی۔ کسی نے اپنی عزت نہیں بیچی ہے۔

ایک درباری: واللہ ہماری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا۔ کہ یہ کیا بات ہے۔ خوجی ایک ذلیل آدمی مسخرہ املا تک درست نہیں، چانڈو باز، افیمی، بدوضع، شہدا۔ اس پر تو یہ عنایت کی نظر اور ہم پر عتاب۔ خدا کی شان ہے۔

ایک اور درباری: اور اس پر طرہ یہ کہ ایسے بدمعاش کو زنانے میں بلوایا۔

غفور: جی نہیں ڈیوڑھی میں پردے کے پاس کھڑے تھے اور آنکھوں پر دہری پٹی بندھی تھی۔

دوسرا: اجی کیا کہتے ہو۔ الوک اگوشت نہ نواب صاحب کو کھلا دیا تو ناک کٹوا ڈالو۔ ان لوگوں نے مل کر الو کا گوشت کھلا دیا ہے۔ بس جب ہی تو الو بن گئے ہیں۔ ورنہ الوپن کی باتیں کیوں کرتے؟۔ اب ان سے کہے کون؟۔

ایک اور: اب تو خوجی نامعقول کی خوشامد کرنی ہوگی۔

مسیتا بیگ: ہماری جوتی اس پاجی کی خوشامد کرتی ہے۔

درباری: پھر نکالے جاؤ گے۔ یہاں رہنا ہے تو خوجی کو باپ بناؤ۔ اور ابا جان کہو۔ ورنہ پھٹکنے نہ پاؤ گے دربار میں۔

دوسرا: اور نہیں تو کیا رہنا دریا میں اور مگر مچھ سے بیر۔

مرزا: دو چار روز یہاں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کے،، ہم تو یہاں کا آنا جانا ترک کردیں گے۔ ہم سے تو اس کی خوشامد نہ ہو سکے گی۔

مسیتا: ہم تو خوجی کو ایک ذلیل انسان سمجھتے ہیں۔ اتنے میں نواب صاحب باہر تشریف لائے مگر اس حالت میں کہ نواب صاحب کے ہاتھ میں چھوٹی سی نازک سی گڑ گڑی تھی۔ اور خواجہ صاحب کش لے رہے تھے۔ دیکھتے ہی سارے جل مرے۔ کہ اللہ اللہ سرکار کے ہاتھ میں گڑ گڑی اور یہ ادنی مسخرہ رئیس بنا ہوا دم لگا رہا ہے۔ خواجہ صاحب نواب صاحب کے ساتھ اکڑ کر بیٹھے۔

ایک درباری: خداوند آج کا دن تو گانا سننے کے لئے موزوں ہے۔

نواب: ہاں،، اگر سوز خانی ہو تو کیا مضائقہ۔ مگر سب سے بہتر یہ ہے کہ کوئی عالم آ کر علمی بحث چھیڑے۔ خواجہ صاحب آپ علمی بحث کیجیے۔

مسیتا بیگ: اپنے دل میں ان کے باپ نے بھی کہیں علمی بحث کی تھی۔

مرزا: اپنے دل میں) خوجی اور علمی بحث خدا کی شان۔

ایک درباری: جناب خواجہ صاحب سنا ہے کہ دریا میں جہازوں کو ڈبو دینے کے بھی آلے انگریزوں نے نکالے ہیں۔ کیوں صاحب معاذ اللہ یہ تو خدائی کرنے لگے۔

خوجی: تارپیڈو اس آلے کا نام ہے۔ دو جہاز ہمارے سامنے ڈبوئے گئے۔ تارپیڈو پانی کے اندر ہی اندر چھوڑا جاتا ہے۔ بس جیسے ہی جہاز کے نیچے پہنچا ویسے ہی پھٹا۔ بس خدا کی پناہ۔ جہاز کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ کروڑ ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔

نواب: کیوں خواجہ صاحب جنگ کے وقت انسان کے دل کا کیا حال ہوتا ہو گا۔ ہر طرف موت ہی موت نظر آتی ہو گی۔ توبہ توبہ واللہ بڑے بہادروں کا کام ہے۔ جنگ خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔

مرزا: میں عرض کروں حضور۔۔لڑائی کے میدان میں آکر ذرا۔۔۔۔

نواب: خاموش رہو تم سے کون پوچھتا ہے، کبھی بندوق کی صورت بھی دیکھی ہے۔ یا لڑائی کا حال ہی عرض کرنے چلے ہو۔ گویا ہمیشہ لڑائیوں ہی میں رہے ہوں۔

نواب: کوئی ہے اس نالائق بدتمیز کو نکال دو یہاں سے۔

درباری: حضور آج زیادہ ہی خفا ہیں۔ اس کا قصور کیا ہے۔ اس دربار میں تو روز اس کا شغل ہوا کرتا ہے۔ آج بھی اس نے چانڈو پیا تو کیا گناہ کیا۔

نواب: کیا بکتے ہو۔ چانڈو کا شغل ہمارے ہاں کبھی نہیں ہوا۔

خوجی: یہاں آتے ہوئے ہمیں اتنے دن ہوئے ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔۔اور بھلے مانس شریف زادے بھلا چانڈو کا شغل کیوں کرنے لگے۔ یہ تو شریفوں کا کام نہیں ہے۔

مرزا: تم غضب کرتے ہو خوجی۔۔زمانے بھر کے نشہ باز، افیمی، چانڈو باز کوئی نشہ نہیں چھوڑا۔۔اور اب آئے ہیں وہاں سے بڑھ بڑھ کے باتیں بنانے۔۔۔ذرا سرکار نے منہ لگایا زمین پر قدم ہی نہیں۔

خوجی: اوگیدی غفور اس کی گردن میں ہاتھ دے۔

نواب: غفور ان سب بدمعاشوں کو نکال باہر کرو۔ خبردار جو کوئی آج سے

یہاں آنے پایا۔اگر ذرا اس طرف رخ بھی کریں تو کھڑے کھڑے چنوا دو۔

درباری: کھڑے ہو کر خداوند بس۔۔اب کوئی فقرہ نہ فرمایئے گا۔ہم لوگوں نے نوکری کر کے کوئی عزت نہیں بیچی ہے۔بے عزت نہ ہوں گے۔ہم کو کوئی پاجی یا چمار آپ نے سمجھ رکھا ہے۔

نواب: (آگ بھبھوکا ہو کر) نکلوان سب کو ابھی نکال دو۔

خواجہ صاحب شہہ پا کر اٹھے اور مسیتا بیگ سے الجھ پڑے۔

مسیتا بیگ نے خوجی کو ایک چانٹا دیا تو وہ تیورا کے گرے۔ان کا گرنا تھا کہ دو اور آدمیوں نے ان کو اور بھی پیٹا۔

اتنے میں سپاہی آ گئے۔انھوں نے مسیتا بیگ اور ایک درباری کو گرفتار کر لیا۔باقی سب کے سب چلے گئے۔

خواجہ صاحب جھاڑ پونچھ کر اٹھے۔اور اٹھتے ہی فرمایا کہ:

خوجی: سپاہیو! مسیتا بیگ کو درخت سے باندھ کر دو سو چابک لگاؤ۔نمک حرام، بے ایمان، اپنے آقا کے دوستوں سے لڑتا ہے۔بدن میں کیڑے نہ پڑیں تو سہی۔

الغرض مسیتا بیگ اور وہ درباری اس قدر پٹے کہ بھرکس نکل گیا۔

دوسری طرف نواب صاحب نے سپاہیوں کے حکم دے دیا کہ:

بلا اجازت کوئی نہ آنے پائے۔

اتنے میں میاں آزاد بھی وہاں آ گئے۔

نواب: حضرت آج سے ہم نے آپ کی صلاح کے مطابق چلنا شروع کر دیا ہے۔اب ہم اچھے شرفاء کی صحبت میں بیٹھا کریں گے۔بہت وقت ضائع ہو چکا

۔اب کان پکڑے۔

آزاد: اب کتابوں کا مطالعہ شروع کیجیے۔اچھی اچھی کتابیں دیکھنے کی عادت ڈالیے۔

نواب: حضرت ضرور پڑھوں گا۔ابھی میری پڑھنے لکھنے کی عمر ہے۔کل پچیس کا تو ہوں۔۔اور مجھے کرنا ہی کیا ہے۔دولت خدا کے فضل سے بہت موجود ہے۔ چاہے ساری عمر پڑھوں۔

آزاد: خدا توفیق دے۔آمین، اب صبح بندہ رخصت ہوگا۔مجھے دل سے اجازت دیجیے۔

نواب: واللہ ایسی جلدی۔دو چار روز تو اور رہو صاحب۔

آزاد: اب تو ہندوستان میں ہوں۔۔۔انشا اللہ اکثر ملاقات ہوا کرے گی۔

خوجی کا بھائی

نواب صاحب سے رخصت ہو کر آزاد پاشا واپس آئے۔اگلے روز دونوں خواتین کے ہمراہ یہاں سے چل پڑے۔کئی شہروں سے پھرتے پھراتے۔ہندوستان کی سیر کرتے اسی شہر میں آن پہنچے جہاں حسن آرا بیگم کا گھر تھا ۔وہی حسن آرا بیگم جن کے کہنے پر میاں آزاد ترکی اور روس کی جنگ میں شریک ہونے کے لئے ہندوستان سے گئے تھے۔مس میڈا اور مس کلیرسا کے ہمراہ انہوں نے ایک ہوٹل میں کمرے لے لئے۔دوسری طرف حسن آرا بیگم کے گھر خبر ہو چکی تھی۔میاں آزاد بہادری کے عظیم کارنامے سرانجام دے کر وطن واپس پہنچ گئے ہیں۔

اس وقت میاں آزاد اپنے ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ ایک خاتون اور ایک صاحب جو میاں آزاد کو ملنے کے شوق میں وہاں چلے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی کھانے میں مشغول تھے کہ یکایک باہر شور ہوا:

کھڑا رہ گیدی۔۔۔خبردار ابھی اطلاع دے ورنہ اتنی قرولیاں بھوکوں گا کہ یاد ہی تو کرے گا۔

آزاد یہ آواز سن کر ہنس پڑے۔ میڈا اور کلیرسا بھی تاڑ گئیں کہ وہی میاں خوجی آ پہنچے۔

آزاد: (خانساماں سے) دیکھو یہ کس کی آواز تھی۔

خانساماں: باہر جا کر کون غل مچاتا ہے۔

خوجی: غل مچاتا ہے۔ گویا ہم غل مچاتے ہیں! جاؤ آزاد پاشا سے کہہ دو کہ حضور خواجہ بدیع الزمان صاحب تشریف لائے ہیں۔ ابھی اسی دم اطلاع دو۔

خانساماں: بہت اچھا، آپ ذرا دم بھر تو ٹھہریں۔

خوجی: او گیدی ہم نہیں ٹھہر سکتے۔ ہم روم، شام، کوہ قاف سب کہیں پھر آیا ہے۔

خانساماں: کمرے میں جا کر حضور کوئی خواجہ صاحب آئے ہیں۔

آزاد: بلا لو، بلا لو۔

مس کلیرسا: آپ اتنے دن کہاں تھا خواجہ بدی۔

خوجی۔ ہم خواجہ بدی نہیں خواجہ بدیع ہیں۔

کلیرسا: ہم اس زبان سے واقف نہیں ہیں صاحب۔

خوجی: یہ بڑے زبان دان بنے ہیں آپ کے آزاد۔ان کو ہم کیا سمجھتے ہیں زبان کے معاملے میں۔

آزاد: ارے یار خدا کے لئے ہمارا رنگ پھیکا نہ کرو۔

خوجی : ہاں اب البتہ خاموش رہیں گے۔۔ کہیے اب کیا رنگ ڈھنگ ہیں؟۔اور یہ بھی بتاؤ کہ حسن آرا بیگم کو بھی خبر ہوئی یا نہیں؟ نہ ہوئی ہو تو بندہ پہنچے ان کے گھر۔

آزاد: کھانے کے بعد مشورہ کریں گے۔

خوجی: واللہ مجھ سے زیادہ اس کام کے قابل اور کسی کو نہ پاؤ گے۔میں بڑے کام کا آدمی ہوں۔

آزاد: اس میں کیا شک ہے بھائی جان۔

مہمانوں کے پوچھنے پر آزاد پاشا نے انگریزی میں خوجی کے بارے میں انھیں بتایا:

آزاد: یہ مسخرہ بڑا دل چسپ ہے۔میرے ہمراہ روم گیا تھا۔اس کے سبب راہ میں بڑی دل چسپی لگی رہی۔اور بعض مقاموں پر اس نے ہمیں بھی بڑی مدد دی۔نہایت معقول آدمی ہے۔مگر جھکی، بکواسی، اور پاگل بات بات پر لڑ پڑتا ہے۔ذرا کسی سے بات ہوئی اور یہ مرنے مارنے پر تیار۔بدن میں طاقت برائے نام بھی نہیں۔نتیجہ ظاہر ہے مر گیہ لڑے بغیر نہ رہیں گے۔

یہ ان میں عجب عادت ہے۔اور جو کوئی سمجھائے تو یہ اس سے الجھ پڑیں۔بڑے مزے کے آدمی ہیں۔

خوجی صاحب انگریزی خاک بھی نہ سمجھے تھے۔لیکن تاڑ گئے کہ انہیں کا ذکر ہے۔خون خوار ہو کر آزاد پاشا سے یوں مخاطب ہوئے:

خوجی : سنو میاں خواجہ بدیع سات زبانیں جانتا ہے۔ عربی، فارسی ترکی، اردو، فرانسیسی سب میں عبور ہے۔انگریزی زبان کا بادشاہ ۔خبردار میرے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کرنا۔

آزاد: تم تو پاگل ہو۔تمہارا ذکر کون کر رہا ہے۔آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے بارے میں باتیں ہو رہی ہیں۔خدا کی شان اوہو

خوجی:ان باتوں میں لونڈے آتے ہوں گے۔

شہر بھر میں خبر پھیل چکی تھی کہ مشہور جرنیل ترکی اور روس کی جنگ کے ہیرو آزاد فلاں ہوٹل میں مقیم ہیں۔تو شہر اُمڈ کر آ گیا۔آزاد کو دیکھنے کے لئے وہ ہجوم ہو گیا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔جس نے سنا شوق کے مارے چلا آیا۔لوگ آزاد کی تعریف کر رہے تھے،اس کی بہادری،شجاعت اور فرض شناسی کے داد دے رہے تھے۔اور آزاد ان کا مسکرا مسکرا کر شکریہ ادا کرتے تھے۔بہت سے لوگوں نے آگے بڑھ کر آزاد سے مصافحہ کیا۔۔کچھ لوگ گلے بھی ملے۔مس کلیرسا اور مس میڈا بھی کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھیں اور خوش ہو رہی تھیں۔

ایک آدمی: (آزاد کے بارے میں) اس شخص کی صورت کا آدمی ہر دل عزیز ہی ہوتا ہے۔اس کے بعد اس آدمی نے بے تکے پن سے گانا شروع کر دیا۔

میڈا: یہ بھی ہم کو خواجہ صاحب کا بھائی معلوم ہوتا ہے۔

کلیرسا:بڑا بھائی کہو۔

آزاد: باتیں کرتے کرتے یکا یک گانا شروع کر دیا۔ بے شک خوجی کا بڑا بھائی ہے۔خواجہ صاحب اس وقت آرام کر رہے ہیں۔(ہوٹل کے نوکر سے) ذرا ان کو جگا تو دو۔

اتنے میں خواجہ آنکھیں ملتے ہوئے برآمد ہوئے ہجوم کو دیکھ کر تیوریاں چڑھائیں۔اور لگے الٹی سیدھی ہانکنے، اتنی دیر میں وہی مسخرہ پھر بولا:

مسخرہ: ایک پیسے سے لے کر کروڑ تک کی قسم کھاتا ہوں کہ آزاد سا جوان نہ ہوا۔۔اور نہ ہوگا۔اور نہ ہے۔

آزاد: افوہ۔۔ واللہ بالکل خوجی کی طرح ہیں۔قد وقامت ویسا، بات چیت بھی ویسی ہی۔شکل وصورت بھی اسی طرح۔۔اور شعر بھی بالکل خوجی کی طرح پڑھتا ہے۔

میڈا: بس ان کو چھپاؤ۔ان کو دکھاؤ۔ان کو دکھاؤ۔ان کو چھپاؤ۔ذرا فرق نہیں ہے۔ خوجی نے اس مسخرے کی طرف غور سے دیکھا تو آنکھیں کھل گیں۔

خوجی: یہ مسخرہ ہے کون؟ ابے تو پاگل تو نہیں۔

مسخرہ: پاگل ہوگا تو، تیرا باپ۔

خوجی: کیا کہا نکالوں قرولی؟

مسخرہ: جا اپنا کام کر۔۔جو گرجتا ہے برستا نہیں۔

خوجی: بچہ۔تیری موت میرے ہی ہاتھ سے ہے۔

مسخرہ: ماشہ بھر کا آدمی۔بونے کے برابر قد اور چلا ہے ہمیں ڈرانے۔خدا کی شان۔اس وقت صرف آزاد کا خیال ہے۔ورنہ اکڑ نا وکڑ نا بالکل بھول جاتے۔

خوجی: تیری موت آن پہنچی ہے۔تو میں کیا کروں، اب جو کچھ کہنا سننا ہے کہہ سن لے۔تھوڑی دیر میں تیری لاش پھڑکتی ہوگی۔اتنا یا درکھ اب میں نہ مانوں گا۔

مسخرہ: میں بھی ایک نہ مانوں گا۔

خوجی: تیرے ننھے ہاتھ پاؤں پر رحم آتا ہے۔

آزاد: آپ دونوں صاحب کیوں لڑتے مرتے ہیں؟۔

خواہ مخواہ دونوں کے چہروں سے شرافت برستی ہے۔مگر خدا جانے ایسے پاجی پن کی باتوں سے تمہیں کیا ملتا ہے۔

مسخرہ: ذری زبان سنبھال کے صاحب۔۔اس کو پاجی بنایئے مگر بندے کی طرف اشارہ مت کی

خوجی: اس پاجی کو ہزار بار پاجی کہیئے ،مگر ہم سے بھلے مانسوں کو اس میں شامل نہ کیجیے۔پاجی کوئی اور ہوتے ہوں گے۔

ہوٹل میں جو لوگ کھڑے تھے،ان سب کو شگوفہ ہاتھ آیا۔وہ بڑے شوق سے ان بونے پہلوانوں کی لڑائی یا کشتی دیکھنے کے منتظر تھے۔یار لوگ بھی فقرے کہنے لگے تا کہ دونوں جھلائیں اور آپس میں خوب دھول دھپا ہو۔

ایک: (خوجی کی طرف اشارہ کرکے) بھئی ہم تو ان کی طرف ہیں۔

دوسرا: ہم بھی یہ ان سے زیادہ طاقتور ہیں۔

تیسرا: کون؟ خواہ مخواہ۔۔شرط لگا لیجیے۔

خوجی: جس کا روپیہ فالتو ہو وہ لگا لے۔

مسخرہ: (لنگوٹ کس کے) اے بے ادب بے ادب نا معقول۔

خوجی: دیکھ تیری موت آ گئی ہے میرے ہاتھ سے۔

مسخرہ: ابھی معلوم ہو جائے گا کہ کس کی موت آئی ہے۔ذرا سامنے تو آؤ ایک ہی جھڑپ میں زمین میں سے گاڑھ دوں گا۔بس ایک ہی جھڑپ میں۔خوجی اوراس مسخرے کے سر پر پاگل پن سوار ہو گیا۔دونوں نے ٹھان لی کہ کشتی ضرور لڑیں گے۔خوجی سمجھتے تھے کہ مسخرہ چیز ہی کیا ہے۔اٹھا کے دے ماروں گا۔مسخرہ سوچتا تھا کہ ایسے بونے کو نیچا دکھانا کون سی بڑی بات ہے۔چرمر کر ڈالوں گا۔خواجہ اب خم ٹھونک کے آگے بڑھے۔مسخرے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً لڑ پڑا۔اور گردن میں ہاتھ دے کر قریب تھا کہ زمین پر دے ماریں،مگر خواجہ صاحب سنبھل گئے۔مسخرے کی گردن میں ہاتھ ڈال کے کہا:

یہ ہاتھ موت کا پنجہ ہے۔اب یہیں ڈھیر ہو جاؤ گے۔

خوجی: دانت پیس کے اور جھٹکا دے کر)اور لے گا۔

مسخرہ: (تھپڑ مار کے) لے اور لے گا۔اور لے۔

خوجی:(گھونسا مار کے)اور ایک لیتا جا،اور ایک۔

مسخرہ: دانت کٹکٹا کے) آج تجھے جیتا نہیں چھوڑوں گا۔

خوجی: ہوش کی دوا کر۔دیکھ میرا ہاتھ ٹوٹا تو مقدمہ کر دوں گا۔

مسخرہ: ہاں ہاتھ ٹوٹا تو مقدمہ کر دو گے۔اپنی بڑھیا کو بلا لاؤ کوئی لاش پر رونے والا تو ہو۔

خوجی: بھلا کریا تو قتل کریں گے یا قتل ہوں گے۔اتنے میں خواجہ صاحب نے داؤ مارا تو مسخرہ گر پڑا،مگر سیدھا۔ساتھ ہی خواجہ صاحب بھی منہ کے بل زمین

پر آرہے۔اب نہ یہ اٹھتے ہیں اور نہ وہ۔دوسری بار خواجہ صاحب نے مسخرے کو پھر پٹخنی دی۔لیکن مسخرے نے بھی ان کی گردن دبالی۔اب ادھر خواجہ صاحب تڑپ رہے ہیں۔ادھر مسخرہ نیچے دبا ہوا ہے۔نہ وہ ان کی گردن چھوڑتا ہے۔نہ یہ ان کو چھوڑتے ہیں۔دونوں اپنے داؤ گھات میں لگے ہوئے ہیں۔

مسخرہ: مار دال بے شک مگر میں گردن نہ چھوڑوں گا۔

خوجی: تو گردن مروڑ ڈال مگر میں ادھ مرا کر کے چھوڑوں گا۔گردن جا ہے مورونڈا ہو جائے مگر پیس ڈالوں گا۔

مسخرہ: گردن زور سے دبا کر اب بتا بچہ؟۔

خوجی: (جواب میں اس کی گردن دبا کر) اس کا جواب یہ ہے۔۔سمجھا۔۔اس کا جواب یہ تھا۔۔ہائے گردن گئی۔گردن گئی میری۔موت کا سامنا ہے۔

مسخرہ: ارے مرا، جان گئی۔۔پسلیاں چرمر بول رہی ہیں۔

خوجی: جو کچھ ہو سو ہو۔آج کچھ پرواہ نہیں ہے۔

مسخرہ: یہاں کس کو پراوہ ہے۔کوئی رونے والا بھی نہیں ہے۔اتنے میں خوجی نے گردن چھڑائی۔ادھر مسخرہ نکل بھاگا۔اور خوب تالیاں بجیں۔۔دونوں سمجھتے تھے کہ ہم شیر ہیں۔

خوجی: اپنی گردن دبا کے)افوہ اللہ۔۔میں ہی ایسا بے حیا تھا کہ بچ گیا۔شکر ہے گردن بچ گئی، ورنہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی۔واہ رے ہم۔

مسخرہ: اور ہم کس سے کہیں،، میرا ہی ساپا جی تھا کہ اتنی دیر برداشت

کیا،ورنہ دوسرا اب تک کب کا بول چکا ہوتا ہے۔

اب یار لوگوں نے پھر فقرے چست کرنے شروع کیے،اور دونوں کو پھر سے تیار کرنا شروع کیا۔مگر ان میں دم نہ تھا۔آدھ گھنٹے تک دونوں ہانپا کیے۔مگر زبان دونوں کی چلتی جاتی تھی۔اور دونوں ہی اپنے منھ میاں مٹھو بنے ہوئے تھے۔

خوجی: ایک ذرا اور دیر ہو جاتی تو پھر دل لگی دیکھتے۔

مسخرہ: ہاں بے شک دل لگی دیکھنے کا وہی موقعہ تھا۔

خوجی: خدا کا شکر کرو،بچ گئے ۔ورنہ منھ بگاڑ دیتا۔

مسخرہ: اب تم اس فکر میں ہو کہ میں پھر اٹھوں۔

خوجی: کیوں ہڈیاں چلچلاتی ہیں ۔۔اٹھوں پھر ۔۔

مسخرہ: میرے دبلے پتلے ہاتھ پاؤں پر نہ جاؤ۔فقرہ بازوں نے دیکھا کہ دونوں پھر لڑائی کے قابل ہوئے تو پھر فقرے چست کرنا شروع کیے۔

ایک: خواجہ صاحب میں تو دم ہی باقی نہ رہا۔

دوسرا: واہ ان کا بدن چور ہے۔

تیسرا: اچھا پھر تم ان کی طرف سے شرط لگاؤ،اور ہم ان کی طرف سے شرط لگاتے ہیں۔دیکھی نہیں تھی پہلی کشتی،،واللہ تھوڑی دیر اور ٹھہرتے نا تو دم ہی نکل جاتا۔

چوتھا: ہم تو ان کے قائل ہیں ۔۔اتنی دیر تک گردن دبی رہی۔مگر ذرا چوں تک نہیں کی،اف تک نہیں کی ۔وہی تیور۔وہی دم خم۔

خوجی: اجی ہم نے مصر کے پہلوانوں تک وک نیچا دکھایا ہے۔یہ ہیں کس کھیت

کی مولی۔

آزاد: اب زیادہ بکھیڑا نہ بڑھاؤ۔ قصہ مختصر کرو۔

مسخرہ: حضور میں نیچا دکھائے بغیر نہ رہوں گا۔

خوجی: (بڑھ کر) آؤ دکھاؤ نیچا۔ (پھر ہاتھا پائی ہونے لگی)

مسخرہ: ابے تو گردن تو چھوڑ۔ گردن چھوڑ دے ہماری۔

خوجی: اس دفعہ تم نے گردن پکڑی تھی۔ اب ہمارا داؤں ہے۔

مسخرہ: (تھپڑ لگا کر) ایک، دو،

خوجی: (چپت مار کر) ایک، دو، تین۔

مسخرہ: (گھونسا دے کر) چار، پانچ۔

ایک فقرہ باز: سو تک گن جاؤ یونہی۔ ہاں پانچ ہوئیں آگے چلو۔

دوسرا: ارے یار بڑا غضب ہو گیا ہے۔ ایسے ایسے جوان اور پانچ تک ہی گن کے رہ گئے۔ ہاں چھ کی آواز آئے چھ کی،،

خوجی (جھلا کر چپت لگاتے ہوئے) چھ۔ چھ۔ اس مرتبہ وہ گھمسان کی لڑائی ہوئی اور وہ چپت بازی ہوئی کہ دونوں بے دم ہو کر گر پڑے اور رونے لگے۔

خوجی: میرے پیارے آزاد بس اب میں مرنے والا ہوں۔

مسخرہ: اف بے موت مرے آئے تو تھے آزاد پاشا کو دیکھنے، یہاں اس مسخرے سے چمٹ پڑے۔

خوجی: آزاد بھائی۔۔ ہمارا مزار کسی پوست کے کھیت کے قریب بنوانا۔

مسخرہ: آزاد پاشا سلامت، ذرا ہماری بھی سنیے ہماری قبر شاہ فصیح کے تکیے

میں بنوائی جائے۔جہاں ہمارے والد ماجد خواجہ بلیغ الزمان دفن ہیں۔

خوجی: (چونک کر) کون،،کون،،آپ کے والد کا نام کیا تھا۔

آزاد: خواجہ بلیغ الزمان کہتے ہیں۔آپ کے نام سے ملتا ہے۔

خوجی: (روتے ہوئے) بھائی ہمیں پہچانا۔میں خواجہ بدیع الزمان ہوں۔ہم تم خواہ مخواہ ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔

مسخرہ: ہائے افسوس۔حقیقی بھائی حقیقی بھائی کو مارے اور قتل کرے۔افوہ غضب کا سامنا ہے۔

آزاد: ہم تو تعجب میں تھے کہ خوجی کی اور ان کی صورت اس قدر کیوں ملتی ہے؟۔وہی ہاتھ پاؤں۔وہی قدو قامت۔ویسی ہی گفتگو۔کسی بات میں ذرا فرق نہیں۔مسخرے سے۔آپ کا اسم مبارک کیا ہے؟۔

مسخرہ بندے کو خواجہ رئیس الزمان کہتے تھے۔

آزاد: یہ کہتے تھے کیا معنی؟۔کہتے ہیں یا کہتے تھے کیا معنی؟۔

مسخرہ: کہتے تھے اب تو ہم مردوں میں شامل ہیں۔

خوجی: ارے دو دو صدمے۔ایک تو اپنی جان گئی۔دوسرے یہ کہ بڑا بھائی ہمارے ہاتھ سے قتل ہوا۔بھائی صاحب آپ بزرگ ہیں۔خطا معاف،قصور معاف کیجیے۔

خواجہ بدیع الزمان اٹھ کر خواجہ رئیس الزمان کے پاس گئے۔

خوجی: بڑے بھائی ۔۔ہائے تم سے تو کچھ کہنے بھی نہ پائے،بھائی جان ہمارا کلام تو تم نے سنا ہی نہیں۔ابا جان پڑھے لکھے تھے ہی نہیں۔بھائی سب

جاہل، شاعر کوئی نہیں ہوا۔ بندے نے یہ بھی کمال حاصل کرلیا۔۔ کشتی لڑنے میں ماہر ہوا۔ روم تک آیا، روس دیکھا میں تو اس قابل ہوں کہ مجھے ڈبیا میں بند کر کے رکھیے۔

اتنے میں خواجہ رئیس الزمان بھی کلبلا کے اٹھ کھڑے ہوئے اور دونوں بھائی گلے مل کر خوب روئے۔

رئیس الزمان: بیٹا تم مجھ سے کوئی بیس برس چھوٹے ہو۔ تم نے اپنے باپ کو اچھی طرح نہیں دیکھا تھا۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ہم کو روز دکان پر لے جایا کرتے تھے۔

آزاد: کاہے کی دکان تھی حضرت۔۔ پرچون کی۔

رئیس الزمان: جی ٹال تھی لکڑیاں بیچتے تھے۔

خوجی: خ ام وش۔

رئیس الزمان: کچھ دن کیمپوں میں انگریزوں کے ہاں خانساماں بھی رہے۔

آزاد: حضور خوجی صاحب! بس آپ کے خاندان کی قلعی کھل گئی ساری۔

خوجی: (سر پیٹ کر) ہائے افسوس یارو کیا غضب کی بات ہے۔ سب بک دیا صاف صاف۔

اس بات پر خواجہ بدیع الزمان اور خواجہ رئیس الزمان میں پھر چخ چخ ہونے لگی۔ بڑے اور چھوٹے بھائی کی گفتگو سننے والی ہے۔

خوجی: آپ نے اس وقت وہ بات کی ہے کہ اگر جناب کے والد زندہ ہوتے تو اسی وقت آپ کو طلاق دے دیتے۔ وہ ناشائستہ حرکت آپ سے سرزد ہوئی

ہے۔

مسخرہ: اور تم وہ نا خلف ہو کہ جس کو جیتے جی باپ نے عاق کر دیا تھا۔

خوجی: اجی آپ بالکل گدھے ہیں۔

مسخرہ: ہم گدھے ہیں یا وہ گدھے تھے جس نے تم ایسے گدھوں کو پیدا کیا۔

خوجی: اچھا ان لوگوں سے پوچھو کہ گدھا کون ہے۔

آزاد: حضرت آپ دونوں گدھے کے گدھے ہیں۔

خوجی: چلو بس فیصلہ ہو گیا، اور ہم دونوں پر کیا فرض ہے۔ ہمارا خان دانوں کا خاندان گدھوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس تو تو میں میں کے بعد خواجہ صاحب اپنے بڑے بھائی کے ساتھ شہر کی سیر کو گئے۔ اور آزاد سے وعدہ کر کے گئے کہ حسن آرا بیگم کے گھر ضرور جائیں گے۔

ادھر ادھر مٹر گشت کرنے کے بعد آخر کار حسن آرا بیگم کے گھر میں داخل ہوئے۔ ایک بڑے میاں باہر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔

خوجی: اسلاعلیم۔ پہچانا یا بھول گئے۔

بوڑھا: وعلیکم السلام۔ میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔

خوجی: تم کیا پہچانو گے، تمہاری آنکھوں پر تو پٹی چڑھی ہوئی ہے۔

بوڑھا: کیا آپ کچھ پاگل سے معلوم ہوتے ہیں۔ جان نہ پہچان خواہ مخواہ ہی دس باتیں سنا ڈالیں۔

خوجی: اجی ہم تو بادشاہ کو بھی سنا دیں تو کیا مال ہے گیدی۔۔۔

بوڑھا: ایں ہوش میں ہے اپنے؟۔ کیا بکتا ہے

خوجی: (زور سے) کوئی ہے؟ محل میں حسن آرا کو خبر کرو کہ مسافر آئے ہیں ، مہمانی کرو ہماری۔

بوڑھا: (پہچان کر) اخاہ خواجہ صاحب آئے ہیں معاف فرمایئے گا حضرت میں نے آپ کو پہچانا نہیں ہے۔

خوجی: بھلا بے جانے بوجھے کوئی کسی کو کچھ کہتا ہے۔

بوڑھا: آپ تشریف رکھیں میں خود جا کے اطلاع کردوں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ اور ہمارے آقا آزاد واپس خیریت سے تشریف لائے۔ بوڑھے نے اندر جا کر کہا، سب گھر والے اور لڑکیاں سن کر خوش ہوگئیں کہ آزاد پاشا کے ساتھ جناب خواجہ صاحب تشریف لائے ہیں۔ لڑکیاں چلمنوں سے لگ کر دیکھنے لگیں۔ نازک ادا جوان میں سب سے زیادہ شریر تھی ، بولی،

نازک: اوہو، کیا گرانڈیل سڈول جوان ہے۔

جانی بیگم: ہاتھ پاؤں کیسے خوب صورت ہیں، اور قد کیسا موزوں پایا ہے۔

نازک: ارے موے خوجی۔ او بہرے خوجی۔

خوجی: ادھر ادھر دیکھ کر کون ہے بھئی۔

نازک: ادھر دیکھ موے۔ تجھ پر خدا کا قہر نازل ہو۔ ادھر دیکھ۔ آنکھیں ہی پھوٹیں جو ادھر دیکھے تو۔

جانی: ایسا عجیب وغریب آدمی نہیں دیکھا، اونٹ کی تو شاید کوئی کل درست ہو مگر اس کی کوئی کل درست نہیں ہے۔ ہنسی آتی ہے۔ خوجی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے یہ ہنسی کی آواز کہاں سے آتی ہے؟۔ اتنے میں بوڑھا آ گیا۔

خوجی: حضرت اس مکان کی عجب خاصیت ہے۔

بوڑھا: کیا؟۔اس مکان میں آپ نے کوئی نئی بات دیکھی ہے کیا؟۔

خوجی: اجی آوازیں آتی ہیں۔ میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آواز آئی۔ پھر دوسری آواز آئی۔ پھر قہقہے کی آواز آئی۔ کسی نے میرا نام لے کر پکارا اور مجھے برا بھلا کہا۔

بوڑھا: اجی کیا فرماتے ہیں۔ ہم نے آج تک کوئی بات اس قسم کی نہیں دیکھی ہے۔

خوجی: تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں غلط کہہ رہا ہوں۔

بوڑھا: جی نہیں میں تو حیرت ظاہر کر رہا ہوں۔ شاید کوئی بھوت پریت ہو۔ کیا عجب ہے۔

خوجی: (کھڑے ہو کر) اہا اہا اہا۔ خوب یاد آیا، کوب ہی یاد آیا۔ بھئی ہو نہ ہو یہ وہی ہے، یہاں بھی پیچھا کیا ہے۔

بوڑھا: کون کیا کوئی جن وغیرہ آپ کو ستاتا ہے؟۔

خوجی: اچھا گیدی آج اتنی قرولیاں بھوکوں گا کہ تو بھی یاد کرے گا۔ ہم سے بھڑنے کا مزا۔ آج چکھ لے۔

بوڑھا: حضرت کچھ بتائیے تو ہمیں۔ آخر کون ہے؟۔ ہمیں شک ہوتا ہے۔

خوجی: واہ شک کے کیا معنی۔۔اور آپ ہیں کون شک کرنے والے۔ وہ ہم کو ہزار بار چکمہ دے چکا ہے۔ اور آپ الٹا ہمیں کو الو بتاتے ہیں۔ ارے صاحب یہ ایک بہروپیا ہے۔ ناک میں مردود نے دم کر دیا ہے۔ واللہ ناک میں دم کر دیا ہے۔ اب تک ہم ایک تھے۔ اب دو ہوئے۔ ایک ہم دوسرے ہمارے بھائی

رئیس الزمان ۔

بوڑھا: جب سے ہم آن کر بیٹھے ہیں ہم نے کوئی آواز نہیں سنی ۔

خوجی: آپ تو مجھے کچھ سودائی سے معلوم ہوتے ہیں ۔

بوڑھا: اچھا صاحب اپنے بھائی سے پوچھیے یہ کیا کہتے ہیں۔

خوجی: ہائے افسوس ارے صاحب وہ تو افیم کے نشے میں ہیں ۔اور یہاں مارے خوشی کے نیند حرام ہے ۔

بوڑھا: خیر ان باتوں کو جانے دیجیےاور کچھ روم کا ذکر چھیڑ یے ۔

خوجی: آپ کو روم روس کی پڑی ہے ۔اور یہاں کچھ اور ہی خیال ہے ۔حسن آرا بیگم سے اطلاع کردی آپ نے ۔بس اب رخصت اور دن سے اندر ۔جب خوجی صاحب کو پتا چلا کہ آوازیں تو لڑکیوں کی آرہی تھیں تو بہت خوش ہوئے اور دیر تک حسن آرا اور اس کی بہنوں کو آزاد پاشا کی بہادری اور شجاعت کے کارنامے سناتے رہے ۔

اب سنیے:

لڑکیاں تو اکٹھی بیٹھی ہوئی تھیں ۔سب نے مشورہ کیا کہ کچھ دن کے لئے خوجی کو الو بنایا جائے ۔جانی بیگم جو ان سب میں شریر تھیں ۔انھوں نے خوجی کو تنگ کرنے اور چھیڑنے کا پروگرام بنایا ۔باقی سب لڑکیاں باغیچے میں جا کر بیٹھیں ۔خوجی کو بھی وہیں بلوایا گیا ۔لیکن وہ ذرا فاصلے پر ہی تھے ۔کہ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جوان گھبرو سامنے سے اکڑتا چلا آتا ہے ۔وہ خوجی کے قریب آیا تو حضرت بڑا چکرائے کہ اس باغ میں اس کا گزر کیوں کر ہوا ۔

اتنے میں ایک لڑکی بہار النساء نے شور مچایا کہ: دیکھنا میاں خوجی یہ عورتوں کے بیٹھنے کی جگہ میں کون بدتمیز گھس آیا ہے۔ کسی طرح اسے یہاں سے نکالو۔ ایک نوکرانی بھی قریب تھی۔ اس نے بھی یہی کہا۔

خوجی: سنو بھئی جوان۔۔ ہم تم دونوں سپاہی پیشہ ہیں۔ جوان اسی طرح اکڑتا ہوا آگے بڑھا۔ خوجی کی بات سنی ان سنی کر دی۔

خوجی: اجی حضرت آپ کون ہیں؟۔

جوان: کیا تیری شامت آئی ہے۔

خوجی: سنیئے بندہ پرور ہم دونوں ایک ہی پیشے کے آدمی ہیں۔

جوان: اگر اب کے بولو گے تو ہم خنجر مار دیں گے۔ خوجی صاحب بہت چکرائے، سوچا کہ اگر اس کا مقابلہ کیا تو یہ خنجر مار دے گا۔ اور ہماری قرولی تو پاس ہی نہیں اور اگر خاموش رہتا ہوں تو یہ لڑکیاں کیا سوچیں گی۔

خوجی: بھائی پرائے گھر میں یوں اجازت کے بغیر آنا بری بات ہے۔

جوان: کیوں تیری ہڈیاں چلچلاتی ہیں۔ اے بڈھے۔

خوجی: کیا آپ مجھ سے کچھ زیادہ جوان ہیں۔

جوان: تو یوں نہیں مانے گا، تیرا کام تمام کرتا ہوں۔ ایک پہرے دار کو تو شہید کر آیا ہوں۔ اب تیری باری ہے۔ آج کا دن تیری موت کا دن ہے۔

خوجی (خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹتے ہوئے) تم نے دیکھا نہیں کسی کو کیا مجال ہے۔

جوان: کوئی سپاہی ہو تو مقابلہ کیا جائے، تم ایسے سے کیا مقابلہ کروں۔ لیکن

تجھے زخمی ضرور کروں گا۔ یہ کہہ کر اس نے خنجر جو ہلایا تو خوجی چونک کر پیچھے ہٹے اور ساتھ ہی گر پڑے۔

گرتے ہی آواز آئی۔

لانا میری قرولی۔

اصل میں جانی بیگم مردوں کا لباس پہن کر چلی آئی تھی۔ خوجی کو زچ کرنے اور وہ سچ مچ پہچان نہ سکے کہ عورت ہے یا مرد۔

خوجی: واللہ ہم اس وقت اپنے زعم میں آ رہے ہیں۔ اب بھی اگر اٹھوں تو قیامت برپا کر دوں۔

نوکرانی: اے نہیں۔ اٹھیں آپ کے دشمن، آپ کیوں اٹھیں بھلا۔

دوسری نوکرانی: ایسی آرام کی جگہ پا کر کوئی چھوڑتا ہے بھلا۔

تیسری نوکرانی: مگر گرے بھی تو اس زور سے ہیں کہ زمین ہل گئی۔

چوتھی نوکرانی: اے میں سمجھی شاید بھونچال آ گیا ہے۔ ماشا اللہ جوان بھی گرانڈیل ہیں۔ زمین کا کلیجہ تک دہل گیا۔ اب جس وقت اٹھیں گے، زمین پھر دہل جائے گی۔

خیر بڑی مشکل سے خوجی کی جان لڑکیوں سے چھوٹی اور وہ واپس آزاد کے پاس پہنچے۔

خوجی جل گئے

اس وقت میاں آزاد، خواجہ صاحب، مس میڈا اور مس کلیر سا پوٹل کے باغیچے میں کرسیوں پر بیٹھے تھے خواجہ صاحب اس وقت پھولے نہیں سما رہے تھے، اور اپنے آپ خود ہی گفتگو فرما رہے تھے کہ:

واہ رے میں۔

کیسا خوب صورت جوان ہوں۔

میں کتنا طاقت ور ہوں۔

مس میڈا اور مس کلیر سا نے جو انہیں خود اول فول بکتے سنا تو ہنسنے لگیں۔

کلیر سا: ذرا انہیں چھیڑیں تو دیکھیں کیا کرتے ہیں؟۔

میڈا: سڑی سودائی کے منہ کون لگے۔ کچھ بک دے، گالی دے بیٹھے۔

آزاد (شرارت سے) ایسا سڑی نہیں ہے خوجی۔

خوجی: (آہستہ سے) خوجی کی ایسی تیسی مردود کی، اور کہنے والے کو کیا کہوں۔ خوجی کسی بھیڑیے کے بھٹ میں رہتا ہوگا۔

کلیر سا: (آزاد سے) کیا کہتا ہے۔ تم نے اردو میں کچھ کہا تھا۔ وہی سن کر بگڑ رہا ہے شاید۔

آزاد: میں نے خوجی کہا اس لئے بگڑ رہے ہیں شاید۔ خواجہ صاحب کیوں نہیں کہتے، ہم تو خوجی ہی کہیں گے، جس کا باپ انڈے بیچتا تھا۔ اسے تو ہم خواجہ صاحب نہیں کہیں گے۔ اوپر سے ڑاتا ہے۔ سنو کوجی اگر اچھی طرح رہنا ہے تو رہو

،ورنہ کھڑے کھڑے نکلوا دوں گا۔اور سنو۔

خوجی (آنکھیں سرخ کر کے) کیا کہا پھر سے تو کہنا۔

آزاد: (کلیر سا سے) اب بہت ہی تیکھا ہوگا،اور بکے گا۔

خوجی: ادھر آنکھیں چار کرو صاحب۔کیا کہا ہم کو نکال دو گے۔

خانساماں: کیا ہوا خواجہ جی؟۔صاحب کیا ہوا؟۔کیوں بگڑ گئے۔

خوجی: تو چپ رہ ا بے قلی۔

خانساماں: میں نے تو آپ کی عزت کی ہے۔خواجہ صاحب جی۔

خوجی: آپ ہمیں کچھ نہ کہیے۔ہم درگزرے جناب ۔ماشا اللہ ادنیٰ سا خانساماں اور ہم سے اس طرح بات کرتا ہے۔

آزاد: سنو خوجی تمہارے بڑے بھائی کہاں غائب ہو گئے۔

خوجی: وہ اللہ والے لوگ ہیں،ان کا ذکر نہ کیجیے صاحب۔

آزاد: بجا ارشاد ہوا۔جیسے تم اللہ والے ہو،ویسے اللہ والے تمہارے بھائی۔

اتنے میں خانساماں نے وار کیا کہ:

خوجہ صاحب کو بس ایک ہی فارسی کا شعر یاد ہے۔کل سارے بازار میں ہر ایک سے اس کے معنی پوچھتے پھرتے تھے۔

اتنا سننا تھا کہ خوجی آگ بگولا ہو گئے اور ایک توا جو سامنے رکھا تھا،اٹھا کے خانساماں کی طرف دوڑے لیکن فوراً ہی منھ کے بل گرے اور تڑپنے لگے۔اتفاق سے توا آگ کی طرح گرم تھا۔ہاتھ بری طرح جل گیا۔ادھر خود گرے ،ادھر توا چھوٹ کر دور جا گرا۔

آزاد: خواجہ خیریت تو ہے۔ کیا تو اگرم تھا۔

خانساماں: حضور آگ کی طرح گرم تھا۔ توبہ توبہ۔

میڈرا: (افسوس کرتی ہوئی) ڈاکٹر کو فوراً بلاؤ آزاد۔

کلیرسا: (روتے ہوئے) بے چارہ خوجی ڈاکٹر کو جلدی بلاؤ۔

آزاد: ارے میاں مردہو یا چھوکری۔ اب اٹھ بیٹھو۔

خانساماں: بسم اللہ اٹھ بیٹھو بھائی شاباش (ہنس کر) جس وقت خواجہ صاحب گرے تھے، اس وقت توا ان کے سر پر گرتا تو کھوپڑی جل بھن کے خاک ہو جاتی۔

آزاد: (چھیڑنے کو) لیکن یہ توا ان کے پاس آیا کیوں؟۔

خانساماں: (مسکرا کر) خدا جانے انہیں سوجھی کیا تھی۔

ادھر خواجہ صاحب کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔۔ خانساماں نے برآمدے میں ایک پلنگ بچھایا، اس پر بستر لگایا اور دو آدمیوں نے مل کر خواجہ صاحب کو اٹھایا کہ وہاں سے لاد کر برآمدے میں لے جائیں۔

آزاد کو اس قدر ہنسی آئی کہ ضبط نہ کر سکے۔ الگ جا کر خوب ہنسے۔ ادھر خوجی صاحب عقل کے دشمن تو تھے ہی سمجھے کہ اب آخری وقت آگیا ہے۔ رہے سہے حواس بھی حضرت کے غائب ہو گئے۔

ہوٹل کے ملازموں کو دل لگی ہاتھ آئی خواجہ صاحب کی چارپائی کے گرد جمع ہو کر لگے باتیں بنانے۔

بیرا: افسوس۔ خواجہ صاحب ابھی ابھی تو اچھے بھلے تھے۔ ہائے ہائے۔

خانساماں: ہائے زندگی کا کیا اعتبار؟۔

دوسرا: بے چارے کی مٹی شاید یہاں کھینچ لائی تھی۔

تیسرا: نوجوان آدمی ہیں بالکل، ان کے کوئی مرنے کے دن ہیں بھلا۔

چوتھا: اجی صاحب موت کے آگے کس کی چلتی ہے۔

آزاد: کیا حال ہے میاں خوجی صاحب؟

ایک ملازم: حضور خوجی بے چارے کا حال بہت پتلا ہے۔

دوسرا: حضور اب ان کے گور گڑھے کی فکر فرمایئے۔

آزاد: کسی مولوی کو بلا لاؤ۔ خواجہ صاحب کا آخری وقت ہے۔

ایک ملازم: حضور ہم نے انہیں کبھی نماز پڑھتے تو دیکھا نہیں پھر بھلا ان کی نماز جنازہ کیسے پڑھی جائے گی۔

آزاد: نہ بھئی اب اس وقت اس کا ذکر نہ کرو۔

اتنے میں مس میڈا نے آزاد کو بلوایا اور ناراض ہوئی۔ بچوں کی طرح تم بھی مذاق میں پڑے ہو۔ اسی مذاق مذاق میں اگر وہ سچ مچ مر گیا تو تمہیں کیا حاصل ہوگا؟۔ وہ خبطی پاگل آدمی، اور پھر اتنا کمزور۔ وہم ہی سے مر جائے گا۔ مس کلیر سا نے بھی آزاد سے یہ ہی کہا۔ آزاد نے بھی سوچا تو اپنی لغو حرکت پر سخت شرمندہ ہوا۔ کہ واقعی اس طرح کی لاپرواہی اور بے تکے مذاق سے تو اچھا بھلا تندرست انسان بھی مر سکتا ہے۔ کہاں خوجی جیسا آدمی۔ آزاد وہاں سے واپس خوجی کے پاس گئے۔ دیکھا خواجہ صاحب اب قدرے آرام سے لیٹے ہیں۔ آزاد ان کی چارپائی اٹھوا کر اپنے کمرے کے پاس برآمدے میں لے آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد خواجہ صاحب کو نیند آ گئی۔ آزاد بھی اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔ چند روز بعد خوجی بھلے چنگے ہو گئے۔

آزاد کی شادی

مس کلیرسا اور مس میڈا کو یہاں کے سادہ دل اور سادہ طبیعت لوگ اتنے اچھے لگے کہ انھوں نے ہمیشہ کے لئے ہندوستان میں رہنے کا ارادہ کرلیا۔شادی وغیرہ کا خیال دل سے نکال کر انھوں نے یہاں کی لڑکیوں اور عورتوں کو جو زیادہ تر بے چاری ان پڑھ تھیں، تعلیم کی دولت سے مالا مال کرنے کی صلاح کی۔دونوں نے مل کر ایک بہت اچھا سکول قائم کردیا۔دونوں نہ صرف خود پڑھاتی تھیں، بلکہ انھیں ہر طرح کے اخلاق و آداب بھی سکھاتی تھیں۔ان کے سکول کی بہت جلد دور دور تک شہرت پھیل گئی،اور بڑے بڑے شرفاء کی بچیاں وہاں آکر تعلیم حاصل کرنے لگیں۔

دوسری طرف سنیئے:

آزاد پاشا جب سے ہندوستان آئے تھے۔ایک بدمعاش ان کے پیچھے پڑ گیا تھا جو انہیں جان سے مار ڈالنے کی کوشش میں مصروف تھا۔آزاد بھی غافل نہ تھے،انہوں نے پولیس سے مل کر بڑی مشکل اور دشواری کے بعد بالاخر اسے گرفتار کرا دیا۔یہ بدمعاش ایک مشہور لٹیرا اور ڈاکو تھا،جس نے بہت سے لوگوں کے گھروں کو لوٹا اور جان سے مارا تھا۔آزاد کی کوششوں سے وہ گرفتار ہو کر اپنے انجام کو پہنچا۔

آزاد پاشا جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں،حسن آرا بیگم کے کہنے پر ترکی اور روس کی جنگ میں شرکت کے لئے گئے تھے۔وہاں سے وہ کامیاب لوٹ آئے تھے،

چنانچہ اب دونوں جانب شادی کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ میاں خوجی بھی ان تیاریوں میں پوری طرح شریک تھے۔ اور معمول کے مطابق اپنی حماقتوں سے سب کو ہنساتے تھے۔

شادی کا سامان جمع تھا۔ دلہن کے لئے طرح طرح کے جوڑے کشتیوں میں لگائے گئے تھے۔ عطر کی شیشیاں اور زیورات۔ سب قرینے سے دلہن کے ہاں لے جانے کے لئے سجائے گئے تھے۔

خوجی بار بار پٹارے کا ڈھکنا کھول کر دیکھتے تھے کہ خبردار عطر کی شیشیاں گرنے نہ پائیں۔ موتیے کا عطر خدا جانے کن دقتوں سے لایا ہوں۔۔۔ یہ وہ عطر ہے جو آصف الدولہ بہادر کے ہاں سے بادشاہ بیگم کے لئے لایا گیا تھا۔

لوگ (ہنس کر) یہ تو بڑا پرانا عطر ہے۔ خواجہ صاحب حضور کو کہاں سے مل گیا؟۔

خوجی: ہونھ کہاں سے مل گیا؟۔ تلاش کرنے والوں کو مل ہی جاتا ہے۔ شاہی محلوں کی چیز بڑی تلاش سے ملتی ہے۔

لوگ: اور یہ برسوں کا عطر خراب نہ ہو گیا ہوگا۔ اور آصف الدولہ کے زمانے کے لوگ تو اب زندہ ہی نہیں ہیں۔ یہ عطر کہاں سے مل گیا۔

خوجی: عقل بڑی کہ بھینس۔ ابے گیدی، بادشاہی محلوں کے عطر بھی کہیں خراب ہوا کرتے ہیں۔ اور اس کے کیا معنی کہ آصف الدولہ کے زمانے کا کوئی آدمی ہی زندہ نہیں۔ ہم دو ہزار آدمی دکھا دیں۔ ایسا عطر ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اسی وقت پھولوں کو توڑ کر عطر کھینچا ہے۔ عجب بوباس ہے۔ واہ رے موتیے۔

لوگ: اور کیوں صاحب یہ کیوڑا کہاں ک ا ہے۔

خوجی: کیوڑستان ایک مقام ہے، کجلی بن کے پاس وہاں کے کیوڑے سے کھینچا گیا ہے یہ کیوڑا۔

لوگ: کیوڑستان یہ نام تو آج ہی سنا ہے۔

خوجی: ابھی تم نے سنا ہی کیا ہے۔

ایک شخص: کیوڑستان کا نام۔

دوسرے لوگ: اور کیوں حضور یہ کجلی بن کونسا ہے۔ وہی نا جہاں گھوڑے کثرت سے ملتے ہیں۔

خوجی: (ہنس کر) اب بناتے ہیں آپ، کجلی بن میں گھوڑے کہاں ہیں۔ وہ تو ہاتھیوں کا جنگل ہے۔

لوگ: اور کیوں جناب۔ کیوڑستان سے تو کیوڑا آیا اور گلاب کہاں سے آیا۔ گلابستان کا ہوگا شاید۔

خوجی: شاباش۔۔ دیکھو یہ ہماری صحبت کا اثر ہے اپنے پروں سے اب آپ اڑنے لگے ہیں۔ گلابستان سے گلاب آیا ہے۔

لوگ: کیوڑا تو کیوڑستان سے آیا ہے، جو کجلی بن کے پاس ہے اور گلابستان ک سجگہ ہے۔

خوجی: گلابستان۔۔۔ اجی کامروپ کے پاس ہے۔ جہاں کا جادو مشہور ہے۔

اب سارا سامان جب دلہن کے گھر کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں آتش بازی کے انار چھوٹتے جاتے تھے اور مہتابیاں روشن تھیں۔

خواجہ صاحب کی نسبت دل لگی بازوں نے تجویز پیش کی کہ ان کو بھی سامان کے ساتھ ایک تخت پر بٹھائیں اور ان سے کہیں کہ اوندھے پڑھ کر چانڈو پیتے جائیں۔۔ مگر خوجی عقل کے دشمن تو ضرور تھے، لیکن اتنے بڑے گدھے نہ تھے، کہ اس طرح کاٹھ کے الو بنتے۔ یہ ادھر ادھر اچکتے پھرتے تھے۔ پنشاخے والیوں کے ساتھ ان کی خوب چخ چخ ہوتی تھی۔

انھوں نے ایک پنشاخے والی کا ہاتھ پکڑا اور کہا:

دوڑ ہمارے ساتھ۔

وہ بگڑ کر بولی۔

دو موئے۔۔ داڑھی جھلس دوں گی ہاں بڑا آیا بارات کا داروغہ۔ موا بونا۔

خواجہ صاحب بھی طیش کھا کر اور بگڑ کر گالیاں دینے لگے۔

خوجی: نکال دو اس کو باہر عورت: نکال دو اس مونڈی کاٹے کو۔

خوجی: ارے کوئی ہے جو اس چڑیل کو نکالے یہاں سے۔

عورت: ارے کوئی ہے جو اس بھتنے کو نکالے۔

خوجی: میں چھری بھونک دوں گا بس۔

عورت: اپنے پنشاخے سے منھ جھلس دوں گی، ہاں موا پاگل کہیں کا عورتوں کو راستے میں چھیڑتا ہے۔ کچھ نشہ پی گیا ہے کیا؟۔

خوجی: ارے میاں کانسٹیبل، اس کو دھکے مار کے یہاں سے نکال دو۔ چڑیل کو جاتی ہے یا نہیں۔

اتنے میں ایک نواب زادے نے خوجی کو سمجھایا کہ: خواجہ صاحب آپ ہی

جانے دیجیے۔ان عورتوں کے منہ نہ لگیے، غصہ تھوک دیجیے۔

خواجہ صاحب نے آہستہ سے کہا:۔

جناب۔۔۔اگر اس عورت کو سزا نہ ملی تو ہماری بڑی کرکری ہوگی۔

ادھر خواجہ ساحب باتیں کرتے تھے، ادھر دکاندار، تماشائی، ساتھی قہقہے لگاتے تھے، اس پر یہ اور بھی زیادہ جھلاتے تھے۔آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ خواجہ صاحب اس عورت کو نکال دیں۔حضرت فوراً کمر کس کے ٹوپی اتار کے پنشا نے والی کی طرف جھپٹے۔اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً پنشاخہ سیدھا کیا اور کہا:

اللہ کی قسم اگر جھلس نہ دوں تو اپنے باپ کی نہیں۔

خواجہ صاحب خوف زدہ ہوکر جہاں تھے، وہیں رک گئے۔

لوگوں نے دیکھا تو قہقہہ لگایا۔

ایک شخص: خواجہ صاحب بس ہار گئے۔

دوسرا: جناب کی چھری اور قرولی کہاں گئی۔

تیسرا: لاحول ولاقوۃ، پنشانے والی سے نہ جیت سکے۔بڑے سپاہی کی دم بنے پھرتے ہیں۔

عورت: کیا دل لگی ہے، ذرا اپنی جگہ سے آگے بڑھے اور میں منہ اور داڑھی دونوں کو جھلسا دونگی۔چھٹے منہ، جا چلو بھر پانی میں ڈوب مر۔

خوجی: دیکھو سب کے سب دیکھ رہے ہیں۔۔۔اور ہم نے عورت سمجھ کر اس کو چھوڑ دیا ہے۔۔ورنہ اگر کوئی دیو بھی ہوتا تو ہم قتل کیے بغیر نہ چھوڑتے۔

اب آزاد کی برات کا حال سنیے:

تاروں کی چھاؤں میں برات روانہ ہوئی۔ سب کے آگے نشان کا ہاتھی جھومتا جاتا تھا۔ ہاتھی کے سامنے قدم قدم پر آتش بازی کے انار چھوٹتے تھے۔ سارے راستے میں برات دیکھنے والوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے۔ تماشائی جگہ کے لئے آپس میں لڑتے تھے۔ ادھر ادھر سپاہی حفاظت کے لئے کھڑے تھے۔ جس وقت گوروں کا باجا چوک میں پہنچا۔ انھوں نے بینڈ بجائی۔ لوگ سمجھے کی آسمان نے فرشتے باجا بجانے کے لئے اترے۔۔ وہ مست کرنے والی آواز کہ پہلے کبھی نہ سنی۔ شہنائی نوازوں نے ایسی شہنائی بجائی کہ میاں غوثی کی روح تک جھوم اٹھی۔

اتنے میں خواجہ بدیع الزمان صاحب نے بارات کا انتظام کرنا شروع کیا۔

خوجی: او شہنائی والو منھ نہ پھلاؤ بہت۔

لوگ: آیئے خواجہ صاحب بس آپ ہی کی کسر باقی تھی۔ لیکن یہ شہنائی والے آپ کی سنتے ہی نہیں۔

خوجی: ہم ان کا بازو توڑ دیں گے۔۔۔ کہہ رہے ہیں کہ میاں بہت منھ نہ پھلاؤ۔ یہ عیب ہے، مگر یہ لوگ سنتے ہی نہیں۔

لوگ: خواجہ صاحب یہ آپ کا حکم کیوں نہیں مانتے۔

خوجی: نہ بابا اگر حکم نہ مانیں تو فوراً نکال باہر کروں۔ مگر بات اس میں یہ ہے کہ مجبور ہیں۔ ایک شے کو جانتے ہی نہیں۔

لوگ: اور خواجہ صاحب آج آپ بارات کے ہمراہ گدھے پر سوار نہ ہوں گے۔

خوجی: نہ بھئی ہم تو اس قابل بھی نہیں۔

ایک افیمی: واہ رے انکساری۔ حضور کیا عاجزی ہے؟۔

خوجی: میں تو اپنے آپ کو اس قبل بھی نہیں سمجھتا۔

اتنے میں ایک شخص نے مذاق کے طور پر خوجہ صاحب کے قریب جا کر ہلکا سا دھکا دیا۔ خوجہ صاحب اکھڑ گئے۔ گرتے گرتے مشکل سے بچے۔ اس وقت خوجہ صاحب کے ہمراہ دوسرے افیمی بھی تھے۔ انھوں نے اس شخص پر بڑے قہر کی نظر ڈالی۔

ایک افیمی: ارے میاں کیا آنکھوں کے اندھے ہو؟۔

دوسرا: اینٹ کی عینک لگاؤ میاں۔

تیسرا: اور خوجہ صاحب بھی جواب میں دھکا دے دیتے تو کیسی ہوتی۔

چوتھا: ہوتی کیسی منھ کے بل گرے ہوتے۔

پانچواں: بگڑ کر گرے ہوتے۔ یہ نہیں خبر کہ انجر پنجر سب الگ ہو جاتے۔ ہونھ۔

خوجی: ارے بھئی اب اس سے کیا واسطہ۔ ہم کسی سے لڑتے جھگڑتے تھوڑا ہی ہیں۔ مگر ہاں (غصے میں آکر) کسی گیدی نے زیادتی کی تو اتنی قرولیاں بھونکیں گے کہ یاد کرے۔

لوگ: ایک ذرا سے دھکے سے تو آپ نے لڑھکنیاں کھائیں۔ اور اس پر یہ شان اور یہ غرور۔

غرض اسی چہل پہل رونق اور شور وغل میں برات دلہن والوں کے ہاں پہنچی۔ برات کا استقبال ہوا۔ میاں آزاد اور حسن آرا بیگم کا نکاح ہوا۔ اور یوں یہ داستان ختم ہوئی۔

۔۔۔۔۔۔۔اختتام۔۔۔۔۔